ادارہ "آفتاب" علی گڑھ

کی جانب سے

خلوص و احترام کے ساتھ

(پرویز جعفری)
مدیر

۱۵ / ممتاز ہوسٹل
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

آفتاب ہال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کا

علمی و ادبی مجلّہ

(خصوصی شمارہ)

ہمعصر علی گڑھ کی ادبی تخلیقات

سنہ ۱۹۶۰ء سے سنہ ۱۹۸۰ء تک

سرپرست
نسیم قریشی

نگران
ڈاکٹر منظر عباس نقوی

مدیر
پرویز جعفری

نذرِ عقیدت

اپنی اس حقیر کاوش کو بصد احترام

اردو کے مایۂ ناز ادیب، شاعر اور نقاد، علی گڑھ کے

ممتاز اولڈ بوائے اور آفتاب ہال کے سابق پرووسٹ

پروفیسر آل احمد سرور

کی نذر کرتا ہے

جنھیں بجا طور پر ہمعصر علی گڑھ کے ادبی قافلے

کا کارواں سالار کہا جا سکتا ہے۔

ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

مجلس ادارت "آفتاب"

دائیں سے بائیں: کفیل احمد، پرویز جعفری (مدیر) جناب نسیم قریشی (سرپرست) ڈاکٹر منظر عباس [illegible]ی ([illegible]) طارق چھتاری

مشمولات

افسانے

شاعری

دو منظوم خطوط

ڈراما

انتظاریہ

(شاعری)

افسانہ

تاکہ سند رہے۔

اداریہ

علی گڑھ محض ایک درس گاہ یا دانش کدہ ہی نہیں، ایک تہذیبی مرکز اور ادبی دبستان بھی ہے ـــــ ایک ایسی اہم روایت جسے تاریخِ ادبِ اردو سے نکال لیا جائے تو اس کا حجم تین چوتھائی اور وزن آدھا رہ جاتا ہے۔

دہلی اور لکھنؤ کے روایتی دبستان بہت حد تک علاقائی اور لسانی اختلافات کا نتیجہ تھے، لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد علی گڑھ میں سرسید علیہ الرحمہ نے جس ادبی دبستان کی بنیاد رکھی وہ علاقائی تعصبات سے بالاتر اور لسانی اختلافات سے بے نیاز ہوکر ایک فکری دبستان تھا جس نے اردو نثر اور شاعری کو نئی جہتوں اور نئے امکانات سے روشناس کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید تحریک سے لیکر جدیدیت تک ادب کی ہر صنف میں وابستگان علی گڑھ ائمہ فن اور رجحان سازوں کی صف میں نظر آتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ علی گڑھ نے اپنی ادبی روایت اور تہذیبی ورثے کو ہر دور میں نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ آگے بڑھایا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آزاد ہندوستان کی جو بھی ادبی تاریخ مرتب کی جائے گی اُس میں اردو زبان و ادب کا کوئی جائزہ علی گڑھ کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہی خیال تھا جو زیرِ نظر شمارے کی ترتیب و اشاعت کا محرک ہوا۔

ہمارا ارادہ تھا کہ آفتاب کے اس خصوصی شمارے میں ان تمام اہلِ قلم کا تعارف کرائیں جو گذشتہ بیس سال کے عرصے میں اساتذہ یا طلبہ کی حیثیت سے علی گڑھ سے وابستہ رہے ہیں، لیکن وسائل کی کمی نے اس منصوبے کی حدبندی پر مجبور کیا چنانچہ فی الحال صرف افسانوی اور شعری تخلیقات کے ایک مختصر سے انتخاب پر اکتفا کیا جا رہا ہے جو ہمعصر علی گڑھ کی محض ایک جھلک پیش کرتا ہے۔ بہر طور اس مجموعے سے اتنا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ حال کا علی گڑھ اپنی فنی صلاحیتوں اور تخلیقی سرگرمیوں کے اعتبار سے اس ادبی روایت کی توسیع ہے جس کو سر سیدؒ اور ان کے ممتاز رفقاء، حالیؔ، شبلیؔ، نذیر احمد، محسن الملک، وحید الدین سلیم نے قائم کیا تھا اور آگے چل کر جیسے مولوی عبد الحق، عبد الرحمن بجنوری، حسرت موہانی، سجاد حیدر یلدرم، محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، میر محفوظ علی بدایونی، عبد الماجد دریابادی، قاضی عبد الغفار، رشید احمد صدیقی، خواجہ غلام السیدین، سجاد انصاری، احسن مارہروی، فانی بدایونی، سلطان حیدر جوش، ڈاکٹر رشید جہاں، سعادت حسن منٹو، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر سید عابد حسین، آل احمد سرور، عصمت چغتائی، اسرار الحق مجازؔ، خواجہ احمد عباس، جاں نثار اختر، نور الحسن ہاشمی، ابو اللیث صدیقی، خورشید الاسلام، اختر انصاری، سردار جعفری، اختر الایمان، معین احسن جذبی، خلیل الرحمن اعظمی نے استحکام بخشا اور اپنے فکر و فن سے تب و تاب عطا کی۔

اس شمارے کی ترتیب میں ہمیں علیگیرین برادری سے جو تعاون حاصل ہوا اس کے لیے ہم صمیم قلب سے شکر گزار ہیں اور ساتھ ہی بعض ناگزیر مجبوریوں کے باعث اس شمارے کی اشاعت میں جو تاخیر ہوئی اس کے لیے معذرت چاہتے ہیں۔

مُدیر

پرویز جعفری

اختر انصاری

ایک شخص

میرے دوست حامد حسین ایک معمولی انسان کی طرح جیے۔ لیکن ایک قطعی غیر معمولی انسان ہو کر مرے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک معمولی حیثیت، معمولی تعلیم، معمولی شکل وصورت اور معمولی مزاج ومنہاج کے آدمی تھے۔ لیکن جب بیالیس سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہوا تو اُن کے جاننے والوں میں ہر شخص نے بے اختیار یہ محسوس کیا کہ وہ ہرگز کوئی معمولی آدمی نہیں تھے بلکہ اس حد تک غیر معمولی واقع ہوئے تھے کہ اُن کو بآسانی عجیب الخلقت اور نادرالوجود خیال کیا جاسکتا تھا۔

انھوں نے دُوسری جنگ عظیم کے زمانے میں بی۔ اے پاس کیا۔ فلسفے میں ایم۔ اے کرنا چاہتے تھے کیونکہ علم کی اس شاخ سے بہت دلچسپی تھی اور یہ اُن کا پسندیدہ مضمون تھا۔ لیکن اُن دنوں جنگ سے متعلق دفاتر میں نوجوانوں کو دھڑا دھڑ نوکریاں مل رہی تھیں؛ اور ادھر ان کی مالی حالت بھی کچھ بہت اچھی نہیں تھی۔ اس لیے مزید تعلیم کا ارادہ ترک کر کے محکمۂ فوج کے کسی دفتر میں ملازم ہوگئے۔ گویا فلسفے کے شوق کو بالائے طاق رکھا اور طلب زر کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ لڑائی ختم ہوئی تو رجسٹریشن کے محکمے میں نوکری مل گئی اور جلد ہی سب رجسٹراری کے عہدے تک پہنچ گئے۔ خاصے مزے کے ساتھ زندگی بسر ہوتی تھی۔ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں۔ بے اولاد تھے۔ بیوی بالکل نوعمری ہی میں داغ مفارقت دے چکی تھیں؛ اور دوسری شادی بس ٹلتی ہی رہتی تھی۔ ماں باپ بھی خدا کو پیارے ہو چکے تھے۔ افراد خاندان کے نام پر لے دے کے ایک بیوہ بھاوج اور اُن کے دو یتیم بچے تھے جو حامد حسین کے بڑے بھائی صاحب مرحوم کی یادگار نشانیاں تھیں۔ اور اسی نسبت سے اُن کو عزیز تھیں۔

گاؤں میں جو آبائی مکان تھا اُس کی رکھوالی انھیں کے سپرد تھی اور انھیں کی کفالت حامد حسین کی تنہا اقتصادی ذمہ داری بھی تھی۔ ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ ان کو خرچ بھیجا کرتے تھے لیکن ان کو دے دلا کر بھی اتنا بچ رہتا تھا کہ ان کے عیش و آرام میں کوئی خلل نہیں پڑتا تھا۔ سیر و شکار، بینا پلانا اور ادب اور فلسفے کا مطالعہ ان کی زندگی کے تین اہم مشغلے تھے۔ اگر کوئی غم تھا تو صرف یہ کہ فلسفے میں ایم اے نہیں کر سکے۔ یا پھر یہ کہ بدن کا مٹاپا روز افزوں ترقی پر تھا اور ذیابیطس کے ساتھ ضعفِ بصارت کا مرض بھی لاحق ہو چکا تھا۔

اب یہاں سے حامد حسین کی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں انھوں نے پے بہ پے قلابازیاں کھائیں اور عجیب الخلقت یا نادر الوجود ہونے کے واضح ثبوت فراہم کیے۔

مکانی فاصلے کے باوجود میری اُن کی ملاقات دوسرے چوتھے مہینے ہوتی ہی رہتی تھی۔ کبھی وہ میرے یہاں اور کبھی میں اُن کے یہاں کا ورود رہتا تھا۔ ایک مرتبہ آئے تو یہ خبر سنائی کہ میں ملازمت چھوڑ رہا ہوں۔

"ملازمت چھوڑ رہے ہو؟ آخر کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ میں ایم۔اے کرنا چاہتا ہوں۔" انھوں نے بڑی سادگی کے ساتھ جواب دیا۔

"مگر ایم۔اے کرنے کے لیے ملازمت چھوڑنا کیا معنی؟"

"ملازمت چھوڑے بغیر میں ایم۔اے نہیں کر سکوں گا۔" وہ بولے۔ "میں نے پری میچیور ریٹائرمنٹ کی درخواست دے دی ہے۔ جو کچھ تھوڑی بہت پنشن ملے گی وہ لے لوں گا اور نوکری سے سبک دوش ہو جاؤں گا۔ یونیورسٹی میں باقاعدہ داخلہ لیکر ایم۔اے کروں گا اور ایم۔اے کے بعد فلسفے میں ریسرچ کا بھی ارادہ ہے۔"

یہ سب سُن کر میں سناٹے میں آگیا۔ مزید پوچھ گچھ کی تو بولے "میرے پاس تین چار سال سے زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس تین چار سال میں میں ایم۔اے اور ریسرچ دونوں مکمل کر لینا چاہتا ہوں۔"

تین چار سال کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ پوچھا تو انھوں نے بتایا: "میری بینائی بہت تیزی کے ساتھ زائل ہو رہی ہے۔ آنکھ کا آپریشن کرایا، مگر کچھ نہیں ہوا۔ داہنی آنکھ تو

بالکل بے کار ہے ہی۔ بائیں آنکھ کی بھی ایک چوتھائی روشنی ختم ہو چکی ہے۔ صرف تین چوتھائی باقی ہے جو تین چار سال سے زیادہ نہیں چلے گی۔ ڈاکٹروں نے یہی کہا ہے۔"
مجھے اپنے حواس غائب ہوتے ہوئے معلوم ہوئے۔ لیکن انھوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ مطلع کیا: "میں نابینا ہونے سے پہلے ایم اے اور ڈاکٹریٹ دونوں سے فارغ ہو جانا چاہتا ہوں۔"

اس گفتگو کے بعد میرے اور اُن کے درمیان رد و قدح اور بحث و تمحیص کا جو معرکہ گرم ہوا اُس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ وہ اپنے فیصلے پر اٹل تھے۔ بلاشبہ وہ قبل از وقت پنشن لیکر ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ایم۔ اے کا دو سال کا کورس پورا کیا۔ امتحان دیا اور امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اُس کے بعد ریسرچ کا نمبر تھا۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ شاید قدرت اُن کے ساتھ اتنی دور تک جانے کے لیے تیار نہیں تھی!

ہوا یہ کہ ایک دن ریل کے سفر میں اُن پر فالج گرا۔ گھر پہنچائے گئے اور پھر اسپتال میں منتقل کیے گئے۔ مجھے اس حادثے کی اطلاع ذرا دیر سے ملی، اور جس ذریعے سے ملی اُسی ذریعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حامد حسین شادی کا ارادہ رکھتے ہیں اور بہت جلد! یعنی اسی بیماری کی حالت میں۔

میں بدحواس ہو کر گھر سے نکل پڑا۔ سیدھا اُن کے یہاں پہنچا۔ اسپتال سے واپس آ چکے تھے لیکن حالت خراب تھی۔ دونوں ٹانگوں پر فالج کا اثر تھا۔ بغیر کسی دوسرے شخص کے سہارے کے نہ اٹھ سکتے تھے نہ چل پھر سکتے تھے۔ اُن کا حال شاعر کے اس شعر کے مصداق تھا:

بیٹھا تو عجزِ نقشِ کفِ پا لیے ہوئے
اٹھا تو دردِ دل کا سہارا لیے ہوئے

بات چیت ہوئی تو کوشش کے باوجود میں شادی کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ بہت دیر تک وہ بھی نہیں کھلے، جس سے خیال ہوا کہ شاید وہ اطلاع جو مجھے ملی تھی غلط تھی۔ لیکن پھر جلد ہی وہ اس موضوع کی طرف آئے اور پتا چلا کہ مجھ تک جو اطلاع پہنچی تھی وہ بالکل صحیح

تھی۔ حامد حسین واقعی شادی رچانے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اُن کی بیوہ بھاوج اُن کی عمر بھر کی خدمت اور مالی امداد کے صلے میں اُن کے ساتھ نکاح پڑھوانے پر تیار ہو گئی تھیں۔ مجھ میں اتنا دم نہیں تھا کہ میں اُن کے اِس اقدام کی مخالفت کرتا، لیکن اس قدر جاننے کی خواہش ضرور تھی کہ اِس شادی کا محرک کون سا جذبہ ہے اور اس میں کون سی علت غائی کارفرما ہے۔ معلوم ہوا کہ شادی رچانے میں اُن کے پیشِ نظر جو مقصد تھا وہ یہ تھا کہ اولاد کے ذریعے اُن کا اس دنیا سے تعلق قائم رہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ موت اُن کے سلسلۂ حیات کو منقطع کر دے، اور آنے والی نسلیں اُن کے وجود کے اثرات سے بالکل خالی اور تہی دست ہوں۔ کہنے لگے، اگر مَیں اولاد چھوڑے بغیر اِس دنیا سے اٹھ جاؤں گا تو قیامت تک نسلِ انسانی کا مقروض رہوں گا اور میری روح اس بوجھ کے نیچے ہمیشہ ہمیشہ کراہتی رہے گی۔

مَیں اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گیا۔ پھر میرے اندر کے عام دنیادار انسان نے سر اٹھایا اور میں نے دبے لفظوں میں کہا: "یہ سب تو درست ہے، لیکن صحت اِن سب باتوں پر مقدم ہے۔ میرے خیال میں جب تک مکمل تندرستی حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک تو شادی کو ملتوی ہی رکھنا چاہیے۔"

انھوں نے کہا، "اِس منصوبے کی تکمیل کے لیے میرے پاس صرف دو سال ہیں۔ مجھے جو کچھ کرنا ہے انھیں دو سالوں میں کرنا ہے۔"

"کیوں؟ انھیں دو سالوں میں کیوں؟" مَیں نے پوچھا: "دو سال بعد کیوں نہیں؟"

"دو سال بعد مَیں مر جاؤں گا۔" انھوں نے جواب دیا۔ آواز سادہ، سپاٹ، بے رنگ اور ہر جذبے سے خالی تھی۔

پھر انھوں نے خود ہی اس کی تفصیل ان الفاظ میں بتائی: "میرے اوپر جس فالج کا اثر ہے وہ ایک ترقی پذیر فالج ہے۔ ابھی صرف ٹانگیں متاثر ہیں۔ اوپر کا جسم بتدریج زد میں آئے گا۔ جب یہ اثر قلب تک پہنچے گا تو میری موت واقع ہو جائے گی۔ اس میں دو سال لگیں گے۔ ڈاکٹروں نے یہی بتایا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت گویا ختم ہو چکی تھی۔ کچھ توقف کے

بعد حامد حسین نے پھر کہا، "میرے پاس صرف دو سال ہیں مجھے جو کچھ کرنا ہے انھیں دو سالوں میں کر ڈالنا ہے۔ اس کے بعد قصہ ختم ہے۔"

وہ نظر سے نظر ملا کر بات نہیں کرتے تھے۔ جس طرح ایک نابینا شخص بات کرتے وقت اپنے مخاطب کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ دور خلا تکتا رہتا ہے کچھ وہی انداز حامد حسین کا بھی تھا۔ اس وقت بھی اُن کی نظریں دور کسی چیز پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اُن کے تصورات میں مخل ہونا غیر ضروری خیال کیا۔ چپ چاپ وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اسی دن اُن سے رخصت ہو کر گھر کے واپسی سفر پر روانہ ہو گیا۔

حامد حسین نے اپنے منصوبے کے مطابق بیوہ بھاوج کے ساتھ شادی کی۔ لیکن اس سے آگے ایک مرتبہ پھر قدرت کے تعاون میں کچھ کمی ہوئی، اور قبل اس کے کہ وہ باپ بنتے خدا کے گھر سے بلاوا آ گیا۔ اُن کا منصوبہ بہرحال تشنۂ تکمیل نہ رہا۔ مرنے کے چند ماہ بعد اُن کے گھر میں بیٹے نے جنم لیا۔ گویا مستقبل کی دنیا سے اُن کا تعلق بحال ہو گیا اور بلاشبہ جوئے حیات کا تسلسل قائم رہا۔ یہی وہ چاہتے بھی تھے!

قاضی عبدالستار
(استاذ شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

آنکھیں

طاؤس کی غمناک موسیقی چند لمحوں کے بعد رک جاتی ہے۔

"سبحان اللہ .... جہاں پناہ .... سبحان اللہ"

"بیگم" (بھاری اور رنجور آواز میں)

"جہاں پناہ ..... اگر ہندوستان کے شہنشاہ نہ ہوتے تو ایک عظیم مصنف، عظیم شاعر، عظیم مصور اور عظیم موسیقار ہوتے۔"

"یہ تعریف ہے یا غمگساری ..... بہرحال جو بھی ہے مابدولت کے بیقرار دل کو قرار عطا کرنے کی جسارت کرتی ہے۔"

"جہاں پناہ کی آنکھوں نے آج پھر نیند کو باریابی سے محروم رکھا؟"

"بیگم"

"نصیب دشمناں ...... کیا مزاج عالم پناہی۔"

"ہندوستان کے تخت پر جلوس کرنا آسان ہے لیکن سچ بولنا دشوار ہے۔ دشوار تر۔"

"نور جہاں بیگم کے سامنے بھی عالم پناہ!"

"بیگم"

"ظل الٰہی کو جو ارشاد فرمانا ہے وہ ارشاد فرما دیا جائے ...... پھر جلاد کو حکم دیا جائے کہ ہمارے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال کر الفاظ پر مہریں لگا دے۔"

"خوب ..... جوانی آنکھیں قبول کر چکی ... بڑھاپا سماعت کو سولی چڑھا دے۔"

"کنیز کچھ سمجھنے سے قاصر ہے۔"

"آپ کے نام کا سکہ روئے زمین کی سب سے شاندار سلطنت کے بازار کا چلن ہے ہندوستان کی مہر حکومت آپ کی انگشتِ مبارک کی زینت ہے۔ زمانہ جانتا ہے کہ جہانگیر ایک جام کے عوض تاج ہندوستان آپ کو عطا کر چکا...... لیکن یہ کون جانتا ہے کہ جہانگیر آج بھی اپنی محبت کی تکمیل کا محتاج ہے۔"

"ظلِ اللہ۔"

"پوری کائنات کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لینے والی محبت اس ایک چھوٹے سے لمحے کی محتاج ہوتی ہے جب عاشق اپنے سینے کا آخری راز محبوب کے سینے میں منتقل کر دیتا ہے...... آج کون سی رات ہے بیگم؟"

"شوال کی چودھویں عالم پناہ۔"

"بہت خوب...... آج کی رات آسمان سے اس لیے اتاری گئی کہ ما بدولت آپ کے سر پر تکمیلِ محبت کا تاج رکھ دیں۔"

"ظلِ الٰہی...... کیا روئے زمین پر کوئی عورت ہے جس کے ہاتھ میں خاتم سلیمانی ہو اور سر پر محبت کا تاج؟"

"نور جہاں بیگم ــــ رام رنگی کا ایک جام بنایئے اور اس طرح ہونٹوں سے لگا دیجیے کہ جام ما بدولت کی آنکھوں سے دور رہے...... ایک عمر ہونے کو آئی کہ جام میں آنکھیں نظر آ رہی ہیں...... وہی آنکھیں...... وہ بے پناہ آنکھیں۔"

"جہاں پناہ طبیب شاہی کی مقرر کی ہوئی مقدار شراب......"

"نوش فرمایئے! یہ کیسی شہنشاہی ہے کہ ایک ایک جام کو ترستی ہے......؟ بیگم...... ہماری محبت کے جشنِ تاجپوشی کے تصدق میں ایک جام عطا کر دیجیے۔"

"اتنی عزت نہ دیجیے جہاں پناہ کہ نور جہاں اس بارِ عظیم کی متحمل نہ ہو سکے۔"

(شراب ڈھالتی ہے...... ایک ہی سانس میں جام خالی ہو جاتا ہے)

"بیگم۔"

"کنیز ہمہ تن گوش ہے عالم پناہ"

"ایک مدت ہوئی کہ ما بدولت زندہ تھے۔"

"ظل الٰہی"

"جی ہاں بیگم...... زندگی کا صرف ایک نام ہے۔ جوانی...... اور سلیم کی جوانی دولتِ مغلیہ کے اولیں صاحبِ عالم کی جوانی...... فردوس مکانی بابر بارہ برس کی عمر میں بادشاہ ہو گئے۔ جنت مکانی ہمایوں میدانِ جنگ میں تلوار چلاتے جوان ہوئے عرش آشیانی (اکبر) اپنے دادا جان کی طرح بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے اور اکبر اعظم کی ولی عہدی سلیم کا مقدر ہوئی...... عرش آشیانی نے جب شراب پر پہرے بٹھا دیے تو ما بدولت کے جاں نثار اپنی بندوقوں کی نالیوں میں شراب بھر کر لاتے اور پیمانے لبریز کر دیتے اور نظامِ ہضم بارود سے سینچی ہوئی شراب اس طرح ہضم کر لیتا جس طرح آج دوا کا پیالہ ہضم نہیں ہوتا۔ اس بے پناہ جوانی اور بے محابہ شہزادگی کا اثر تاجداری پر طاری رہا...... بیگم۔"

"عالم پناہ"

"یہ پردہ ہٹا دیجیے...... سنگ مرمر کی زیبائی چاندنی سے ہوتی ہے۔ آج کی رات کی چاندنی اگر ما بدولت جوان ہوتے تو ساری رات آپ کے ہاتھوں سے پیمانے قبول کرتے رہتے۔"

"جہاں پناہ"

"ہاں بیگم...... دوسرا سال جلوس تھا۔ ما بدولت مینا بازار میں جلوہ افروز تھے کہ ایک لڑکی نے پان پیش کیے۔ گلوریوں کی نزاکت اور نفاست پسند خاطر ہوئی۔ ہاتھوں پر نظر پڑی تو اور ہی عالم نظر آیا جیسے نور کے سانچے میں ڈھال دیے گئے ہوں۔ نگاہ بلند ہوئی معصوم وحشی آنکھوں میں ڈوب گئی اور محسوس ہوا جیسے اندر کہیں کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ جب ہوش آیا تو وہ نگاہ نیچی کیے لرز رہی تھی اور دونوں ہاتھوں میں طشت کانپ رہا تھا۔ ما بدولت گردن سے ہار اتار رہے تھے کہ اس کی آواز طلوع ہوئی۔ جیسے کشمیر کے برف پوش پہاڑوں پر سورج کی کرن تڑپتی ہے ——————

"تحفہ درویش کی قیمت کیا عالم پناہ۔"

"بیشک تحفۂ درویش قیمت سے بلند ہوتا ہے۔ یہ موتی اس نفاست اور نزاکت کی داد ہیں جو ان کلوریوں میں مجسم کردی گئی۔ ہم آگے بڑھے تو عرفان ہوا کہ ہم پیچھے رہ گئے۔ پہلی بار قلعۂ معلیٰ ویران معلوم ہوا........ اکبر اعظم کے جانشین کی بارگاہ خالی محسوس ہوئی۔ پہلی بار بابدولت کو غربت کا تجربہ ہوا ایسی غربت جو دل کو مٹھی میں دبوچ کر ایک ایک قطرہ لہو نچوڑ لیتی ہے اور جب ہم نے چاہا کہ دل کی ویرانی کو شراب سے شاداب کرلیں تو پہلی بار انکشاف ہوا کہ شراب نشے سے عاری ہو چکی۔ دیر تک شیشے خالی ہوتے رہے لیکن دل کا خلا پر نہ ہو سکا۔"

"جہاں پناہ! کنیز نے اپنی کم فہمی کی بنا پر قیاس کیا تھا کہ ظلِ الٰہی کا راز شاہزادہ خرم اور شاہزادہ شہریار کی آویزش سے متعلق ہوگا لیکن۔"

"خرم اور شہریار کی آویزش مغل تاجداروں کی روایت ہے۔ مغل سلطنت اس کا مقدر ہوتی ہے جس کی تقدیر کا مگار اور شمشیر آبدار ہوتی ہے جب خسرو نے بابدولت کے منہ پر تلوار کھینچ لی تو خرم اور شہریار بہرحال۔"

"پھر جہاں پناہ۔"

"پھر بابدولت کے ہاتھ نے گھنٹہ بجا دیا۔ چوبدار کے بجائے محرم خاں کورنش ادا کر رہا تھا۔ ابھی اس کی بے ادب حاضری پر غور فرماتے تھے کہ معروض ہوا ——————

"پان پیش کرنے والی صاحبزادی کا نام صالحہ خاتون ہے۔ جو بخارا کے شیخ الاسلام کی پوتی اور جلوہ دار شیخ عرب کی بیٹی ہیں ان کا مکان عرب کی سرائے۔"

"محرم خاں۔"

"ظلِ الٰہی۔"

"یہ قیمتی معلومات کس کے حکم سے فراہم کی گئیں۔"

"زبان مبارک سے نازل ہونے والے احکامات کی تکمیل ہر بندۂ درگاہ کا فرض ہے۔ لیکن محرم خاں جیسے مقرب بارگاہ کے منصب حق ہے کہ وہ عالم پناہ کے چشم و ابرو

زبان سمجھنے کی قدرت رکھتا ہو۔"

"جہانگیری چشم و ابرو کی زبان سمجھنا ایک نادر علم ہے لیکن اس کا اظہار اس سے زیادہ نادر ہنر اور اس ہنر کا غلط استعمال بیداد کا مستوجب۔"

"خداوند۔"

"ما بدولت نے تمہارا قصور معاف کیا اور حکم دیا کہ خلعت ہفت پارچہ مع زر و جواہر کے ساتھ نواب صالحہ بیگم کی خدمت میں حاضر ہو اور پیام دو کہ جشن سالگرہ میں شریک ہونے کی سعادت حاصل کریں۔"

"ہر چند کہ ابھی رات کی زلف کی تک بھی نہ پہنچی تھی تاہم بے طرح انتظار فرما ہو چکے تھے۔"

"کتنی خوش نصیب تھی صالحہ بیگم کہ عالم پناہ اس کے منتظر تھے کتنی بدنصیب تھی صالحہ بیگم کہ جہاں پناہ کی حضوری سے محروم تھی۔"

"تمام رات وہ آنکھیں ہماری آنکھوں کے سامنے مجرا کرتی رہیں۔ جن کی سیاہی میں ابدالآباد تک کے تمام مہجور عاشقوں کی سیہ بختی کا جوہر کھینچ کر انڈیل دیا گیا تھا۔ جن کی تاب کے سامنے تمام سمندروں کے تمام موتیوں کی آب پانی پانی تھی۔"

"سبحان اللہ ...... اگر ملک الشعراء اس تشبیہ کو سن لیتا تو خجالت سے ڈوب ڈوب جاتا۔"

"وہ رات زندگانی کی سب سے بھاری رات تھی۔"

"کیا اس رات سے بھی بھاری جہاں پناہ ...... جس کی صبح اکبر اعظم کی تلوار طلوع ہونے والی تھی۔"

"ہاں بیگم ...... اس رات کی دلداری کے لیے پچاس ہزار تلواریں سلیم کی رکاب میں تڑپ رہی تھیں اور صاحب عالم کے منھ سے نکلا ہوا ایک فقرہ اکبری تلوار کو غلاف کر سکتا تھا لیکن اس رات کی غمگساری کے لیے نورالدین محمد جہانگیر کے پاس ایک دامن و آستین کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔"

"کاش...... اس رات کی خدمت گزاری کنیز کا مقدر ہوئی ہوتی۔"

"پھر سورج کی کرنیں سلام کو پیش ہوئیں...... ما بدولت درشن جھروکے پر نزولِ اجلال کے اہتمام میں مصروف تھے کہ فریادی نے زنجیر ہلا دی۔"

"صائمہ بیگم اس طرح باریاب ہوئی گویا وہ کشورِ ہندوستان کے قلعۂ معلیٰ میں نہیں کسی غریب عزیز کے گھر میں قدم رنجہ فرما رہی ـــــ نقاب کے اٹھتے ہی محسوس ہوا جیسے دارو غۂ چاندنی خانہ نے قلعۂ معلیٰ کی تمام روشنیاں ایک شاہ برج میں انڈیل دی ہوں۔ استفسار پر اس طرح مخاطب ہوئی جیسے وہ جہانگیر سے نہیں اپنی ڈیوڑھی پر کھڑے ہوئے سوالی سے مخاطب ہے..... اس کی خطابت نے یقین دلا دیا کہ ما بدولت نے محرم خاں کو سفیر بنا کر غلطی کا ارتکاب نہیں جرم سرزد فرمایا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ بھری دوپہر پر رات غالب آگئی ہے۔ وہ جا چکی تھی...... اس کے غروب ہوتے ہی محرم خاں باریاب ہوا...... عرض کیا گیا کہ خلعت نامقبول اور دعوت نامنظور رہوئی۔"

نجابت اور شرافت پر اتنا غرور...... ایسا تجبر...... معاذ اللہ..... معاذ اللہ۔ ایک جام اور عنایت کہ زبان خشک ہونے لگی۔

(شراب ڈھالتی ہے...... اور ایک ہی سانس میں آبگینہ ختم ہو جاتا ہے)

"جہاں پناہ۔"

"گوش گزار کیا گیا کہ ارم آشیانی علیہ حضرت مریم زمانی ورودِ مسعود فرما رہی ہیں..... سلام کے جواب میں ارشاد ہوا کہ شیخو بابا کو اس مغرور لڑکی میں کیا نظر آگیا کہ مغل جبروت و جلال کی بازی لگا دی گئی...... ما بدولت سکوت فرما رہے.... جب سکوت حدِ ادب سے گزرنے لگا تو علیہ حضرت نے سنا کہ صائمہ بیگم سر سے پاؤں تک کرشمۂ الٰہی ہے لیکن آنکھوں کی بے پناہی زمین و آسماں کے درمیاں اپنی مثال نہیں رکھتی...... سورج شاہ برج سے رخصت کی اجازت مانگ رہا تھا کہ علیہا حضرت ثانی کا غلغلہ بلند ہوا خوش خبری سنائی گئی کہ سفارش خاص پر نواب صائمہ بیگم رات کے کسی پہر قلعۂ مبارک میں جلوس فرمائیں گی۔"

"ظل الٰہی نے اس خوشخبری کو کس طرح قبول فرمایا؟"

"مابدولت نے غسل فرمایا۔۔۔۔ نیا لباس زیب تن کیا۔۔۔۔۔ نئے جواہر سے آراستہ ہوئے۔۔۔۔۔۔ اور خاصہ تناول فرمایا۔۔۔۔۔۔ داروغہ چاندنی خانہ کو حکم ہوا کہ ارگ معلی کا چپہ چپہ روشنی میں غرق کر دے۔

داروغۂ بیوتات کو فرمان ملا کہ ذرہ ذرہ مشک و عنبر سے معطر کر دے اور داروغہ جواہر خانہ کو پروانہ پہونچا کہ شاہ برج کے طاق جواہرات سے لبریز کر دے قلعدار کو مطلع کیا گیا کہ نواب صائمہ بیگم بہادر کی سواری کو نوبت خانے کی سیڑھیوں تک آنے کی اجازت عطا ہوئی۔ احکامات کی تعمیل ہو چکی تھی اور مابدولت انتظار کے تخت پر جلوہ افروز تھے۔"

"ظل اللہ کے دہن مبارک سے انتظار کا لفظ عطا ہو کر کنیز کی سماعت پر اس طرح گرتا ہے جیسے طاؤس پر عقاب۔"

"مقربین بارگاہ نے تہنیت دی کہ حضرت نواب صائمہ بیگم بہادر کی سواری نوبت خانے کی سیڑھیوں پر لگا دی گئی۔۔۔۔۔ چوبداروں کی آواز پر ملاحظہ فرمایا کہ وہ سیاہ سوتی برقعہ پر بھاری نقاب ڈالے، دونوں بازوؤں پر عورتوں کا سہارا لیے ہاتھوں میں ایک سرخ پیالہ سنبھالے آہستہ آہستہ آ رہی ہے۔ نقیب خاص کی آواز پر عورتوں نے اس کے بازو چھوڑ دیے اور وہ کورنش ادا کرنے کے بجائے گھٹنوں پر گر پڑی اور کانپتے ہاتھوں نے دراز ہو کر پیالہ تخت کی طرف بڑھا دیا۔۔۔۔۔۔۔ مابدولت تخت سے اتر پڑے دستگیری عطا کرنے کے بجائے اس کی نذر قبول کی۔۔۔۔۔۔ پیالہ ہاتھ میں آیا تو بیگم۔۔۔۔۔۔ جیسے آنکھوں سے بصارت چلی گئی۔"

"جہاں پناہ۔"

"پیالے میں اس کی آنکھیں تڑپ رہی تھیں۔"

"ظل الٰہی۔"

"ہاں بیگم اس کی آنکھوں کے دیدے پیالے میں رکھے تھے۔۔۔۔۔ شہنشاہی کی پوری عمر میں آداب شہنشاہی کبھی اتنے بھاری نہ معلوم ہوئے۔۔۔۔۔۔ تاہم انھوں نے اس کا

نقاب اٹھا دیا...... آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ زرد سنگ مرمر سے تراشا ہوا چہرہ ساکت تھا۔ پائے مبارک میں جیسے کسی نے زنجیریں ڈال دیں۔"

"نصیب دشمناں۔"

"صرف اس قدر ادا ہو سکا کہ نواب صالحہ بیگم بہادر نے یہ کیا کر لیا۔"

آواز آئی۔

"شہنشاہوں کی پسند غریبوں کو زیب نہیں دیتی۔ ناچیز کی آنکھیں جہاں پناہ کو پسند آگئیں...... نذر میں گزار دی گئیں........ کل کی گلوریوں کی طرح قبول فرمایئے۔"

"سر سے پاؤں تک آنسوؤں میں پروئی ہوئی ہماری اجنبی آواز ایک ایک طبیب کا دامنِ سماعت پکڑ کر فریادی ہوئی...... لیکن بیگم۔"

"ظلِ الٰہی۔"

"جب بھی تنہائی بار یاب ہوتی ہے........ جہانگیر کی پیٹھ پر اس آواز کے تازیانے برسنے لگتے ہیں...... آنکھوں میں وہ زندہ دیدے انگاروں کی طرح دہکنے لگتے ہیں...... کاش وہ زندہ رہتی تو جہانگیری محل اس کو تفویض کر دیا جاتا اس کی دلداری اور دلاسائی کی جاتی تو شاید اس چوٹ کی تڑپ کم ہو جاتی بیگم۔"

"جہاں پناہ۔"

"ایک جام اور عطا کر دیجیے کہ سماعت جلنے لگی ہے اور بصارت دہکنے لگی ہے۔"

صغرا مہدی
اسلام اینڈ ماڈرن ایج سوسائٹی
جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۔ ۲۵

(افسانہ)

احسان فراموش

بیگم صاحب تو خیر اس شاک سے ابھی تک سنبھلی نہیں تھیں، گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے نڈھال پڑی تھیں۔ ایرکنڈیشنڈ کمرے میں بھی ان کی کشادہ پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں، گندمی رنگ غصے سے تمتایا ہوا تھا مگر رافع اب بھی مورچہ پر ڈٹے ہوئے تھے۔

کہانی کی ابتدا تو خوب ہے۔ اس نے اخبار پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔

"قطامہ، بدچلن، نمک حرام۔"

"قطامہ کا مطلب تو مجھے معلوم نہیں۔ چال چلن، تو اس کے بارے میں آپ کچھ نہ کہیں تو بہتر ہے اور نمک کی تو تم ایک ایک کنکری وصول کر چکے ہو۔ رافع میاں....."

"اُف کس بلا کی کاٹ ہے اس لڑکی کے جملوں میں" میں نے سوچا۔

"ارے دربان کہاں ہے؟ چپراسی، بیرا، سب کہاں مر گئے ——— پولیس کو خبر کرو ———"

بیگم صاحب کو اپنے شوہر کے ترکے میں ملے۔ ملازمین ہر آڑے وقت میں یاد آجاتے۔

"اُفوہ کیا قیامت مچی ہے۔ ذرا خیال نہیں کہ باہر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں" بہو بیگم اپنی قیمتی ساڑی سنبھال کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئیں جہاں وہ مہیلا سدھار کمیٹی کی ایگزیکیوٹو میٹنگ کی صدارت کر رہی تھیں۔

رافع میاں ایک دم دبک گئے۔ بیگم صاحب نے گھبرا کر تکیہ پر سر ڈال آنکھیں بند کر لیں۔ مگر نازلی اسی چیلنجنگ انداز میں کھڑی رہی، جیسے کہہ رہی ہو ——— دیکھیں کوئی میرا

کیا کرتا ہے؟

مہو بیگم نے نفرت و حقارت کی نظر اس پر ڈالی اور پھر میاں اور ساس کی طرف مخاطب ہوئیں ـــــ "سمجھ میں نہیں آتا، ان کمینوں کے منھ لگنے سے کیا فائدہ ہے؟ انھیں کان پکڑ کر نکال دو، ان کی تو کوئی عزت نہیں مگر ہم تو عزت دار...." "اس میں کیا شک ہے دلھن بیگم تم لوگوں سے بڑھ کر عزت دار کون ہوگا۔ دوسروں کی خون پسینے کی کمائی پر عیش کرنے والے اگر عزت دار ہوسکتے ہیں تو تم بھی ہو مگر سماج سدھار کمیٹیوں کی ممبر بن کر عزت حاصل نہیں کی جاتی دلھن بیگم!"

رافع غصے سے بے قابو ہوکر نازلی کی طرف بڑھے مگر قبل اس کے کہ ان کا ہاتھ نازلی کے گال پر پڑتا ـــــ وہ اس کی گرفت میں تھا اور رافع میاں کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

مجھے ایک انجانی خوشی کا احساس ہوا کاش ـــــ کاش نازلی ایک ہاتھ جڑ دے مگر یہ یاد کر کے میں ایک دم گھبرا گیا کہ رافع میاں میرے حقیقی ماموں ہیں۔

لے اب بول کم بخت بد نصیب ـــــ جنم جلی ـــــ ارجمند خالہ بری طرح ہانپ رہی تھیں اور اپنی لاٹھی سے نازلی کو مارنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر لاٹھی بجائے نازلی کے جسم پر پڑنے کے زمین پر پڑ رہی تھی رافع سر جھکائے ہوئے اپنے کمرے میں یہ سوچتے ہوئے چلے گئے کسی کو آج تک ان سے مقابلہ کرنے کی جرات نہیں ہوئی تھی کسی کو انھوں نے اپنی حکمت عملی سے زیر کیا تھا کسی کو سیاست سے اور کسی کو مخالفت اور دشمنی کی تلوار سے مگر ان کے گھر کے ٹکڑوں پر پلی اس حقیر سی لڑکی کی یہ مجال کیسے ہوگئی کہ ان کے مقابلے پر آ گئی۔

ادھر ارجمند خالہ بیگم صاحب کے پیروں پر پڑی گڑگڑا رہی تھیں۔ "تم لوگوں نے ہمارے احسانوں کا یہ بدلہ دیا ہے اور اب تم لوگ منھ کالا کرو، بس بہت ہو چکا۔" بیگم صاحب گرج رہی تھیں "مجھے اپنے قدموں میں رہنے دو بیگم اب بڑھاپے میں کہاں ٹھوکریں کھاؤں گی۔" ارجمند خالہ کہہ رہی تھیں۔

نہیں اب تم لوگ ہم کو معاف ہی کرو، اور دیکھو یہ نہ ہو کہ تمھاری نواسی اور بیٹی تو چلی دیں اور تم نمک خواری کا ڈھونگ رچا کر یہیں پڑی رہو۔ دلھن بیگم نے اپنی ساڑی کی کرنز

درست کرتے ہوئے کہا اور ڈرائنگ روم کی طرف مڑ گئیں جہاں ممبران کمیٹی ان کا انتظار کر رہے تھے انھوں نے ممبران کمیٹی سے نہایت معذرت کی اور بتایا کسان کے گھر کی پلی لڑکی جنھیں ان کے خاندان والوں نے اسے بچوں کی طرح پالا تھا بگڑ گئی ہے کچھ نفسیاتی گتھیاں پیدا ہو گئی ہیں جنھیں ہم سب سلجھانے کی فکر میں ہیں، سب ممبران نے ان کے اسی جذبے کی تعریف کی اور مہتا جی نے تو بہو بیگم کے میکے اور سسرال کی قومی خدمات پر ایک چھوٹی سی تقریر کر دی۔ بہو بیگم مطمئن ہو کر مہیلا سدھار کمیٹی کی تجاویز پر غور کرنے لگیں۔

میری نظریں اپنے دادا کے بارعب پروقار قدآدم تصویر پر جا کر رک گئیں، جس کہانی کی ابتدا آپ کے ہاتھوں میں ہوئی تھی، دادا میاں وہ آج اپنے کلائمکس پر پہنچ گئی ہے۔

کہانی یہی تھی، کہ آج سے پچیس برس پہلے آپ نے بے سہارا جمن خالہ اور ان کی بیٹی باجرہ آپا کو پناہ دی تھی اور دادی اماں سے کہا تھا۔ رافع کی ماں ان کو بہن اور بھانجی بنا کر رکھنا اور دادی اماں بگڑ گئی تھیں ان کو اپنے میاں کی یہ باؤلی باتیں سدا سے ناپسند تھیں" خدا رکھے میری بہن اور بھانجیوں کو مجھ پر کیا مصیبت ہے کہ ان ٹکڑ گدی لاوارث عورتوں کو اپنی بہن اور بھانجی بناؤں"۔ اس وقت وہ ایک ٹھیٹھ جاگیردار خاندان کی سیدھی سادھی اجڑ بیوی تھیں۔ یہ انداز تمکنت تو ان میں بہت دنوں کے بعد آئے تھے، اس وقت اپنے شوہر کی پوزیشن کا احساس بھی نہ تھا کہ وہ کیا کارنمایاں کرنے والے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھیں کہ جن کے رستے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے۔ بچارے دادا میاں زندگی بھر اپنے رتبوں اور مشکلات کے درمیان تال میل پیدا کرتے رہے۔

جو بھی ہو یہ کریڈٹ تو دادا میاں کو جاتا ہی ہے کہ انھوں نے جمن خالہ اور باجرہ آپا کو منہ سے نوکر بہرحال نہیں کہنے دیا اصل میں یہ بات تھی کہ جمن خالہ کے سلیقے محنت اور باجرہ کی پھرتی نے دادی اماں کو خوش کر دیا، انھیں یہ سودا برا نہیں لگا ٹھیک ہے بچے خالہ کہدیں کیا حرج ہے۔ ارے رہے گی تو نوکر۔ میاں بھی خوش آرام کا آرام۔ اور پھر باجرہ آپا نے تو دادی اماں پھوپھی اماں اور بچی جان کی تربیت پا کر گھر کے سارے کاموں کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا لیا تھا۔ اب یہ بتانا نہ پڑتا کہ گھر میں آج کیا پکے گا، بچوں کی فیس کب ادا کی جائے گی۔

دادامیاں کا حیک اپ کب ہوگا۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کیسے ہوگی، کون سے مہمان ایسے ہیں جن کی تواضع شربت یا چائے سے کی جائے گی۔ کن مہمانوں کے سامنے چائے کے ساتھ مٹھائی اور پھل پیش کیے جائیں گے اور کن مہمانوں کو محض پان پر ٹرخا دیا جائے گا جب ہی تو بچاری دادی اماں کا دل ہاجرہ آپا کو اپنے سے الگ کرنے کے خیال سے ہی ہولنے لگتا ــــ نامراد کو چھوٹا سا اپنے پاس رکھا ہے، دل نہیں مانتا نگوڑی کو کہیں دور کھسکنے کو۔" چنانچہ ایک دن فجو پان والے جن کی بیوی عرصہ ہوا، فوت ہوچکی تھیں اور چھ بچے ننہال میں پل رہے تھے ایک دن دولھا بن کر دادامیاں کے شاندار گھر میں آ گئے، اس لیے کہ ان کو ایک کوٹھری کی ضرورت تھی۔ دادامیاں نے بذات خود کھڑے ہوکر براتیوں کا استقبال کیا، براتی جن میں رسول خاں پھل والا، نائب دین سائیکل ٹھیک کرنے والا، غفور اسبزی بیچنے والا شامل تھے کھانے کے وقت دادامیاں نے الگ الگ سب سے پوچھا کہ کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں، ہاجرہ آپا اسی شام دادامیاں کی کوٹھی سے بیاہ کر کوٹھی کے عقب میں واقع کوٹھری میں چلی گئیں۔ بستی میں اس کے چرچے دنوں ہوتے رہے۔ میر دلدار حسین نے خود کھڑے ہوکر فجو پان والے کی برات کا استقبال کیا، کھانا کھلوایا، بھائی چارے، انسان دوستی، اور رواداری کی ایک مثال قائم کر دی ــــ واقعی ایسے لوگ اب دنیا میں کہاں ہیں۔

"اے فجو نگوڑمارے کی عمر ہی کیا ہے۔ ان لوگوں میں تو بچوں کی شادیاں کر دیتے ہیں، دمہ نے اس کا یہ حال کر دیا ہے۔ دادی اماں کچھ نکتہ چیں قسم کے لوگوں کی معترض نگاہوں کا جواب ان کے سوال سے پہلے ہی دے دیتیں اور مطمئن ہو جاتیں۔

شادی کے ایک سال بعد نازلی پیدا ہو گئی ــــ دادی اماں کو چھوٹے بچوں سے عشق تھا، نواسوں اور پوتوں میں گھری رہتیں، ایک گود میں لیٹا ہے تو دوسرا پالنے میں پڑا ہے، تیسرا پاس بیٹھا کھیل رہا ہے نازلی کو بھی وہ اپنے پاس تخت پر ڈالے رکھتیں، اور ہاجرہ آپا کام میں جٹی رہتیں ــــ جمن خالہ تو اب بوڑھی ہو گئی تھیں کچھ بنتا نہیں تھا بس سبزی بنا دیتیں چھالیہ کتر دیتیں، اور بقول دادی اماں دن بھر پڑی کھانسا کرتیں، صبح پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک ہاجرہ آپا گھر میں پھرکی کی طرح گھومتی رہتیں، ابا جو وضو کا پانی ــــ

باجرہ جوتوں پر پالش، باجرہ ناشتہ، باجرہ استری۔ غرض باجرہ کی آوازوں سے کوٹھی گونجا کرتی۔ زنانی آوازیں۔ مردانی آوازیں، جوان آوازیں، بوڑھی آوازیں، بچکانی آوازیں۔
نازلی دو سال کی تھی کہ فجو میاں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ باجرہ آپا کو ان کا غم منانے کی فرصت بھی نہ ملی کہ ان دنوں بڑی بہو بیگم جلتے میں تھیں —— دادی اماں نے بھی یہی سمجھایا کہ "بیٹھو گی اور غم ہو گا، خود کو کام میں بہلاؤ باجرہ! جو قسمت کا بدا تھا پورا ہو گیا۔"
زندگی کے صبح و شام گزرتے رہے، نازلی، رافع میاں، ولارے بھیا اور سجن بٹیا کے بچوں کی شیشیوں کا بچا دودھ اور ان کی اترن پہن کر بڑی ہو گئی —— رافع کی بڑی لڑکی رفعت کو نازلی سے عشق تھا، ایک منٹ کو نہ چھوڑتی۔ چنانچہ نرسری سے کالج تک نازلی کو رفعت کے ساتھ پڑھانا بھی پڑا۔ دادی اماں کو یہ بات بہت ناگوار تھی مگر کرتیں کیا۔ رافع میاں اپنی بیٹی کے دیوانے تھے اور رافع میاں ان کے لاڈلے بیٹے تھے۔ اللہ رکھے رفعت جوان ہو گئی مگر نازلی کا عشق بڑھتا ہی گیا، بس ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھتی، اپنے ساتھ کمرے میں سلاتی، بات بات پر لیکچر پلایا کرتی تھی خود دلہن بیگم نے اپنے کانوں سے سنا کہ وہ نازلی سے کہہ رہی تھی: "نازلی خدا کے لیے تم باجرہ آپا اور جمن خالہ کی طرح ہمارے خاندان کے ہاتھوں ایکسپلائٹ نہ ہونا ——" بہو بیگم نے رفعت کو ڈانٹا تو وہ الٹے ان کے گلے پڑ گئی۔ لگی سوال و جواب کرنے بیچاری دلہن بیگم چپ ہو گئیں —— مگر آج یہ سب ہنگامہ تو اس بات پر ہوا کہ انھوں نے نازلی کی شادی کی بات اٹھائی تھی۔ جب سے رفعت نے بغیر خاندان کی مرضی کے عدالت میں شادی کی تھی، رافع میاں کو نازلی کا چال چلن شتبہ لگنے لگا —— پھر اپنے ضدی اور سر پھرے بھانجے کی نازلی پر بڑھتی مہربانیوں سے وہ متوحش تھے، رافع میاں تھے بڑے دوراندیش —— زندگی میں ہر سودا انھوں نے نفع پر کیا تھا، انھوں نے باجرہ آپا کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ نازلی کی شادی اپنے ڈرائیور سے کر دیں۔ نازلی تو یہ سن کر آپے سے باہر ہو گئی —— اور اس پر یہ طومار باندھا تھا۔ رافع میاں پریشان تھے کہ یہ زمانہ نازک ہے۔ خاص طور سے آج کل جب ان کے حریف اس ٹوہ میں ہیں کہ کوئی بات ہو اور ان پر کیچڑ اچھالیں۔ خیر رافع کچھ بھی سوچ رہے ہوں مگر میں نے تو اس کہانی کا یہ انجام سوچا تھا کہ ابھی

کچھ دیر میں نجمی بھیا آکر نازلی کو پروپوز کریں گے نہیں نہیں نازلی تم نہیں جاؤ گی، تم یہیں رہو گی ——— میری دل کی رانی بن کر ——— تم میری ہو۔ ہمیں کوئی جدا نہیں کرسکتا" اور نازلی پہلے تو انکار کرے گی۔ سب لوگ خفا ہوں گے پھر گھبرائے گی اور پھر شرما کر لجا کر اقرار کرے گی" سب لوگ خفا ہوں گے ——— بھائی جان گھر چھوڑنے کی دھمکی دیں گے۔ مگر یہ سب ہوا تو مگر نازلی کا جواب کچھ اور تھا۔ اس نے بھائی جان سے کہا تھا ——— " اچھا تو آپ بھی اپنی خاندانی روایات کے مطابق رحم و انصاف، انسان دوستی اور مساوات کا جھنڈا گاڑنا چاہتے ہیں ——— " بھائی جان حیران رہ گئے تھے، اس لیے کہ شاید وہ بھی وہی سوچ رہے ہوں جو اس نے سوچا تھا۔ نازلی کہے جا رہی تھی ——— " آپ چاہتے ہیں کہ زندگی بھر میں بھی آپ کے اور آپ کے خاندان کے احسانوں تلے دبی اپنی اصلیت پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کرتی رہوں۔ نجمی تم بڑے لوگ خوب گُر جانتے ہو ہم کم ذات غریب لوگوں کو غلام بنانے کا ——— نہیں ہرگز نہیں، کبھی نہیں، میں اس خاندان میں جاؤں گی جہاں خود کو فجو پان والے کی بیٹی کہہ سکوں "

اسی رات ارجمند، ہاجرہ اور نازلی ——— میر ولدار حسین کی کوٹھی سے رخصت ہو گئیں۔
دوسرے دن میں نے سنا نازلی کا نکاح غفور چپراسی کے ہینڈسم، اسمارٹ اور وسیر بیٹے سے ہو گیا۔

اس کہانی کا یہ انجام تو میں نے نہیں سوچا تھا۔

اصغر وجاہت

ساری تعلیمات

ہر تین چار سال کے بعد شہر میں فساد ہو جاتا ہے۔ ڈھاٹے باندھے ہوئے "ہر ہر مہادیو" کا نعرہ لگاتے ہندوؤں کے گروہ مسلمانوں کے محلوں پر حملہ کرتے ہیں اور مسلمان ہندوؤں پر جہاد بول دیتے ہیں۔ آگ لگائی جاتی ہے جو ہولی، عید ملن، ایکتا کے سدھانتوں اور سامپر دائکتا درودھی کمیٹیوں کی کاغذی دیوار کو بھسم کر دیتی ہے۔ دو چار دن گروہ سرگرم رہتے ہیں۔ تیزاب چاقو، لاٹھیاں، بلّم اور ایک آدھ بندوق، دیسی کٹّے لیے دشمن کی تلاش میں صرف ایک آدھ آدمی، عورت یا دوکان ہی نظر پڑتی ہے جس کا فوراً صفایا کر دیا جاتا ہے۔ قاسم پورے میں افواہوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ "آج رات دو ہزار ہندو حملہ کرنے والے ہیں" "محلے کے لڑکے اپنی اپنی چھتوں پر اینٹیں جمع کرنے لگے ہیں۔" "آج پولیس نے ماسٹر رحمت علی کا گھر جلا دیا" —— "جھوٹ؟ کیا بکتے ہو؟ غفور نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے" —— "یہی تو گڑبڑ ہے میاں، پولیس بھی ان کا ساتھ دیتی ہے، نہیں تو ان دھوتی باندھنے والوں کو تو ایک گھنٹے میں ٹھیک کر دیں" "مگر سرکار سے کون لڑ سکتا ہے؟" قاسم پورہ، نواب گنج، رحمت آباد میں مسلمانوں کی سو فی صدی آبادی ہے۔ لیکن پورے شہر میں پھر بھی ہندو زیادہ ہیں۔ اگر حملہ بول ہی دیا تو کیا ہوگا؟ موت کا ڈر محلے کی رگ رگ میں چمک جاتا ہے۔

سڑکیں اُدھر کی طرح سنسان ہو جاتی ہیں۔ پولیس والوں کے جوتوں اور سیٹیوں کی آوازوں کے سوا کچھ نہیں سنائی دیتا۔ کبھی کبھی پولیس جیپ کی آواز آتی ہے اور پھر سناٹا چھا جاتا ہے —— "بڑے پل کے پاس مسلمان کی لاش ملی ہے" —— "آج پولیس گشت نہیں ہو رہا ہے، ضرور حملہ ہوگا" پورا محلہ ایک سرد بھیانک تناؤ میں غرق ہو جاتا ہے۔

چار پانچ دن کے بعد چھٹ پُٹ چاقو کی وارداتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ پتلی تنگ گلی کے کونے پر تین چار آدمی مل کر راشن کی تلاش میں نکلے کسی تھیلی والے یا رکشے والے کو چاقو مار دیتے ہیں۔ گھٹی گھٹی سی بھیانک تیخ، بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں، کھڑکیاں کھلنے کا شور اور پھر "اللہ اکبر" کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔

ہر فساد کے بعد ہندوؤں کے محلوں کے پاس رہنے والے مسلمان کسی مسلمانی محلے میں آجاتے ہیں اور مسلمانوں کی بستی کے پاس رہنے والے ہندو رستوگی گنج یا رکھو بیر پورہ چلے جاتے ہیں۔

مسلمانی محلوں میں داڑھیوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ مساجد میں نمازی زیادہ آنے لگتے ہیں۔ لوگ دیر تک گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگتے ہیں۔ غنڈہ پارٹی لوٹ کے مال کو ادھر اُدھر کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اسلحہ جمع کرنے کا چندہ وصول کرتی ہے۔ پتہ نہیں اگلے فساد میں صرف گولیاں ہی چلیں شہر میں کتنے ہندوؤں کے پاس بندوقیں ہیں اور کتنے مسلمانوں کے پاس؟ دس اور ایک کا بھی تو اوسط نہیں پڑتا۔ کارتوس جمع کیے جاتے ہیں۔ لیکن پولیس کا خیال آتے ہی سب کی ہوا اُکھڑ جاتی ہے۔ جُگن، رحمت کے ہوٹل کے سامنے بہتی نالی میں بلغم تھوک کر کہتا ہے ــــ "یہی تو گڑبڑ ہے جگو ــــ پولیس اگر کسی طرف سے ......"

"ابے سالے حاجی جی سے چندہ کیوں نہیں لیتے؟ کارخانہ چلاتے ہیں حرام میں؟"

حاجی جی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے ہیں ــــ "اس بار تو ماشا اللہ تم لوگوں نے بھی کچھ کیا۔"

"حاجی جی آپ ہاتھ رکھ دیں تو دیکھیے کیا نہیں کر دکھاتے۔"

حاجی جی ایک ہزار روپیہ چندہ دیتے ہیں اور جگن کی پارٹی چل جاتی ہے۔ ویسے حاجی جی کو ایک ہزار چندہ دینے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی، کیونکہ ان کا کارخانہ قاسم پور کے درمیان میں ہے۔ کاریگر بھی سو فی صدی مسلمان ہیں حاجی جی ہندوؤں کو رکھتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں، قوم کی خدمت کرنے کا موقع خدا نے دیا ہے تو اسے کیوں

چھوڑوں ؟" مسلمان کاریگر بھی حاجی جی کے کارخانے میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ جان پیاری ہے پیسہ نہیں۔

شہر تین حصوں میں تقسیم ہے۔ اسٹیشن سے شمال کی طرف چلے جائیے تو سول لائین کا علاقہ ہے۔ چوڑی سڑک پر دور تک کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔ ڈی۔ ایم کی کوٹھی سے سڑک شروع ہوتی ہے اور انجینیر صاحب کی کوٹھی کے پاس سے مڑ جاتی ہے۔ یہاں حاجی کریم اور روریندر بابو کی کوٹھیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ رفیق منزل، جہاں کبھی محمد علی جناح قیام کرتے تھے، کے برابر جن سنگھ کے صدر پنڈت سوم دت گوڑ کا بنگلہ ہے۔ نواز عبدالمجید خاں، جو فرنگیوں کے دور حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائض رہ چکے تھے، کی کوٹھی کے بالکل سامنے ضلع کانگرس کے نیتا جی کا وشال "سوراج نواس" ہے۔

اسٹیشن سے جنوب کی طرف جائیے تو چمکتا ہوا صاف بازار ملے گا۔ جس کی بڑی بڑی دوکانوں میں سامان اتنا بھرا ہوا ہے کہ اگر ہر ایک گھر میں ایک ایک چیز پہنچا دی جائے تب بھی کسی کو کسی چیز کی کمی نہ پڑے۔ اس سڑک پر رکشوں، موٹروں، سائیکلوں کی بھیڑ میں چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی سڑک پر شہر کے بڑے رستوران بھی ہیں اور سنیما گھر بھی۔ شراب کی دوکانیں بھی اور جوہریوں کی گدیاں بھی۔ یہاں رات میں جھلملاتی ہوئی "ٹیوبس" کی روشنی ہوتی ہے اور کوٹھے سے کوٹھا پھلتا ہے۔ اسی سڑک کے دونوں طرف گلیاں ہیں۔ کچھ حد تک صاف ستھری اور پکی گلیوں میں پکے مکان بنے ہوئے ہیں جن میں ہندو رہتے ہیں۔ ان محلوں میں دکان لینے کوئی مسلمان نہیں جاتا۔ جیسے ان کو معلوم ہے کہ شہر کا یہ حصہ دوسری طرح کے لوگوں کے لیے بنا ہے اور وہ دوسری طرف کے لوگ ہیں۔ دفتروں کے بابو اسکولوں کے ماسٹر، چھوٹے دوکان دار، الگ نوکریوں اور دھندوں میں لگے ہوئے وہ سب ہندو ہیں — اسی سڑک پر اور آگے بڑھتے چلے جائیے تو بڑے چوراہے کے بعد چمکیلی دوکانیں ختم ہو جائیں گی۔ کچھ کھیل بیچنے والوں کی چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہیں۔ اس کے بعد بانس بیچنے والوں کی اور چھوٹی اور پرانی دوکانیں ہیں جن میں بیٹھے ہوئے دوکاندار صورت ہی سے مسلمان لگتے ہیں۔ جوانوں کے چہروں پر کالی خشخشی داڑھی اور آنکھوں میں سختی نظر

نظر آتی ہے۔ بوڑھوں کے چہروں پر سفید لمبی داڑھیاں، ماتھے پر گھٹے کا نشان۔ وہ اپنی دوکانوں پر اس طرح بیٹھے ہیں جیسے گھر میں آرام سے بیٹھے ہوں۔ بیٹھے بیٹھے "نہیں" کہہ دیتے ہیں ان کا کوئی جواب نہیں ہے۔ خریداروں کو دیکھ کر نہ ہنستے ہیں اور نہ مسکراتے ہیں۔ شاید خریدار کا آنا ان کو اچھا نہیں لگتا۔ نہ ان کی پوری بات سننے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ اپنی پوری بات ان کو بتاتے ہیں۔ باندوالوں کی دوکانوں کے بعد سے بازار کی چہل پہل اپنا رنگ ڈھنگ بالکل ہی بدل دیتی ہے۔ اب بائیں طرف ایک لائین سے بسکٹ بنانے والوں کی دکانیں ہیں جہاں دوکاندار تہبند باندھے، بنیائن پہنے بسکٹوں کے لیے میدہ پھینٹتے نظر آتے ہیں۔ آٹھ نوسال کے بچے بڑے بڑے برتنوں کو دھوتے، گندی گندی گالیاں بکتے رہتے۔ ہر دوکان پر ایک آدھ آدمی بیکار بیٹھا نظر آتا ہے۔ بسکٹ بنانے والوں کی گندی دوکانوں کے سامنے لائین سے دور تک کھانے کے ہوٹل ہیں۔ کبھی کبھی یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس بستی میں رہنے والے لوگوں نے کھانے کے علاوہ اور کسی چیز کی دوکان کھولنے کی بات کیوں نہیں سوچی؟ صرف چائے کے ہوٹل، کباب کی دوکانیں ہی دور تک دکھائی دیتی ہیں۔ پہلا یاسین ٹی اسٹال ہے اندر سفید پتھر کی میزوں پر ہر وقت مکھیاں بھنکتی رہتی ہیں۔ اردو کے ایک دو اخبار جن پر کافی چائے گر چکی ہوتی ہے، بلند آواز میں پڑھے جاتے ہیں۔ یاسین دوکان کے سامنے والے درمیان بھٹی کے سامنے کھڑا چائے بناتا رہتا ہے۔ یا اوپر رکھے ریڈیو کے کان اینٹھتا رہتا ہے، جس پر جالی دار غلاف چڑھا ہے۔ بھٹی کے داہنی جانب شیشے کے گندے مرتبانوں میں بسکٹ بھرے رہتے ہیں جن سے یاسین بالکل بے تعلق نظر آتا ہے۔ ان بسکٹوں کو جب کوئی خریدار مانگتا ہے تو یاسین بڑی بیزاری سے ایک بسکٹ اس طرح میز پر رکھ دیتا ہے جیسے گالی دے رہا ہو۔ یہ پرانے بسکٹ صرف اُونی ہوئی چائے میں ڈبو کر ہی کھائے جاسکتے ہیں۔ یاسین ٹی اسٹال کے بعد ایک کباب والے کی چھوٹی سی دوکان ہے جو بھینس کے قیمہ کی سیخ لگاتا ہے۔ اس دوکان کے سامنے کھڑے ہونے پر آگ کی چنگاریوں کے ساتھ بھونے ہوئے گوشت کی خوشبو ناک میں گھس جاتی ہے۔ ساتھ ہی لگا ہوا کھانے کا ایک اور ہوٹل ہے، جس کے نام کا بورڈ کئی

برساتوں کو برداشت نہ کر پانے کی وجہ سے زنگ آلود ٹین بن چکا ہے۔ ایک بہت بڑے تھال میں رکھی بریانی کے پیچھے موٹا عبدالغفور بیٹھا گوشت نکالا کرتا ہے۔ اس کے چاروں طرف بڑی پتیلیوں میں قیمہ، کلیجی، بھیجہ، چھوٹے کا اور بڑے کا گوشت سجا رہتا ہے۔ سب چیلے کتے ہوٹل کے اندر آکر میز کے نیچے سے ہڈیاں اٹھالے جاتے ہیں۔ ہوٹل میں کام کرنے والے لڑکے گندے اور چکیٹ کپڑے پہنے گاہکوں کے سامنے بڑے گوشت کی رکابیاں اور روٹیاں پٹک دیتے ہیں۔ ہڈی کو چبا کر نیچے فرش پر پھینک دینے یا کھانا کھانے کے بعد کرسی پر بیٹھے بیٹھے گلاس کے اندر ہاتھ ڈال کر ہاتھ دھو لینے پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ دیواروں پر اسلامی کلنڈر یا مکہ مدینہ کی تصویریں یا قرآن کی آیتیں۔ سب آنے جانے والوں کو دیکھتی ہیں۔ ہوٹل کے بیرے جنھیں کسی بھی طرح آپ برا نہیں کہہ سکتے، سے کھانے کے بارے میں دریافت کریں تو وہ ایک ہی سانس میں دس کھانوں کے نام گنوا کر آپ کی طرف اس طرح دیکھے گا جیسے بڑا احسان کیا ہو۔ اس کے بعد بسم اللہ ہوٹل بے جوا اور کبھی سستا و گندا ہے۔

ان دوکانوں اور ہوٹلوں سے یہ تو پتہ چل ہی جاتا ہے کہ ان محلوں میں رہنے والوں کو کھانے اور خاص طور سے گوشت کھانے میں بڑی دلچسپی ہے۔ گندے اور پھٹے کپڑے پہنے، کھانسی سے بے طرح پریشان، چھوٹے چھوٹے لڑکے ہاتھ میں کئی جگہ سے چپٹا المونیم کا پیالہ لیے آتے ہیں۔ "قیمہ دے دو، قیمہ ایک پلیٹ" اور قیمہ لے کر گلی میں بھاگ جاتے ہیں۔ ان گلیوں میں اتنی جگہ بھی نہیں ہے کہ تین چار آدمی ایک ساتھ چل سکیں۔ دونوں طرف نالیاں اور ان میں بڑے پاخانے اور پیشاب کی تیز کھاری بدبو ہر وقت گلی میں تیرتی رہتی ہے۔ جہاں کہیں بھی گلی ذرا بھی چوڑی ہے، وہاں جمعدار کی ٹوکری رکھی دکھائی دیتی ہے۔ گلی کے فرش پر لگائی گئی اینٹیں بری طرح گھس کر اوبڑ کھابڑ ہو گئی ہیں۔ دونوں طرف اونچی دیواریں ہونے کی وجہ سے گلی میں ہلکا سا اندھیرا اور سیلن رہتی ہے۔ ککئی اینٹوں سے بنی دیواروں پر مردانگی بڑھانے والی دواؤں کے اشتہار یا اردو میں لگے پوسٹر دکھائی پڑتے ہیں جو کسی "میلاد شریف" یا "اردو کے قتل" اور "قوم پر آفت" کی اطلاع دیتے ہیں۔

عام طور پر گھروں کے ناب دان گلی میں کھلتے ہیں جن کے اوپر لٹکا ہوا ٹین گل کر غائب ہو چکا ہوتا ہے۔ اوپر کوٹھوں سے ریڈیو کی تیز آواز یا چیخ پکار سنائی دیتی رہتی ہے۔ ٹین کے گلے پائپوں سے اوپر کا گندا پانی گلی میں گرتا ہے تو اس کے چھینٹے پوری گلی میں پھیل جاتے ہیں۔ گلی میں کھلنے والے پرانے اور برساتی پانی میں گلے دروازوں پر سے ٹاٹ کا چیتھڑا پردہ کسی بھی وجہ سے کبھی ہٹ جائے تو دھواں مارا دالان نظر آتا ہے۔ صبح اور شام جب کوئلے کی انگیٹھیاں گلی میں آجاتی ہیں تو پوری گلی نیلے دھوئیں سے گھر جاتی ہے۔ کسی پردے کے پیچھے سے کوئی پتلے اور پیلے چہرے والی لڑکی جھانکتی ہے اور دو ننگے بچّے، جن کے پیٹ پھولے ہوتے ہیں، اندر گھس جاتے ہیں۔

یہ شہر کا تیسرا حصہ ہے۔ جہاں سو فی صد مسلمان رہتے ہیں۔ ان محلوں میں شاید ہی کبھی کوئی ہندو آتا ہو۔ آنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اور مکان لینے یا رہنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں! ان محلوں کے آس پیچھے کچھ چمار، پاسی یا کچھ اس طرح کے لوگ جو نیڑیوں میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اسی طرح کی ذلیل زندگی گزار رہے ہیں۔ جیسی کہ محلے کے دوسرے لوگ۔

اس محلے سے میونسپلٹی میں مسلمان ہی الیکشن جیتتے ہیں ہندو کھڑے ہی نہیں ہوتے۔ اسکول کے ماسٹر مسلمان ہیں۔ ڈاکٹر مسلمان ہیں، دوکاندار مسلمان ہیں، چھوٹے موٹے دوسرے کام کرنے والے مسلمان ہیں۔

اسی نیم کے پاس والی گلی سے اندر چلے جائیے تو آگے چل کر ایک بڑا سا پرانا مکان دکھائی پڑے گا جس کے دروازے پر چھوٹی سی تختی میں "حاجی کریم اینڈ کو" لکھا دکھائی دے گا۔ یہی حاجی جی کا کارخانہ ہے۔

"حاجی عبدالکریم اینڈ کو" کے تالے ہی ہندوستان کے مشہور تالے ہیں۔ آجکل تو کوئی بھی ایرا غیرا نتھو خیرا تالا بنانے کا کام شروع کر دیتا ہے۔ نہیں تو سنہ تین میں صرف حاجی جی کا ایک کارخانہ تھا۔

ایک ہزار روپیہ دینا حاجی جی کو کھل گیا تھا۔ لیکن اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہی لوگ وقت پر کام آتے ہیں۔ کامریڈ تھان سنگھ نے جس زمانے میں مزدوروں سے دوستی کرنی شروع

کر دی تھی تو حاجی جی نے جگن ہی سے کہا تھا۔ اور جگن نے سب ٹھیک کر دیا تھا۔

حاجی جی نے ٹوپی اتاری سر پر ہاتھ پھیرا اور "اللہ اللہ" کر کے تخت پر لیٹ گئے۔ اندر کارخانے میں کام ہو رہا تھا۔ حاجی جی نے لیٹے ہی لیٹے ایک انگڑائی لی اور زور سے بولے "رحمت، مجھے ایک کٹورہ پانی پلا دے۔"

اندر لوہا پیٹنے اور چھوٹے بڑے ہتھوڑوں کے چلنے کی آوازوں میں حاجی جی کی آواز دب گئی۔ وہ پھر زور سے چلائے۔ "کہاں رہتے ہو؟ تمھیں گھنٹوں سے پکار رہا تھا" حاجی جی رحمت کو دیکھ کر بولے۔ وہ اندر سے نکل آیا تھا۔ "مجھے ایک کٹورہ پانی پلا دو۔ اور وہ آرڈر والا خط لکھا یا نہیں؟ آج اسٹیشن سے بلٹی بھی چھڑانی ہے۔ اور لیور، کمانی، اسکرو کا جو کام محلے میں بٹا تھا وہ واپس ہو گیا یا نہیں؟" وہ گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ ان کی بڑی توند ایک چھوٹا سا ٹیلہ لگنے لگی۔ آٹھ سو پاس رحمت حاجی جی کا منیجر ہے دفتر میں جھاڑو دینے سے لیکر لکھا پڑھی تک کا کام کرتا ہے۔ حاجی جی اُس سے بہت خوش رہتے ہیں مگر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ سو روپے میں آجکل ایسا منیجر کہاں ملے گا؟

"ابن ہی کا کام ابھی تک نہیں آیا ہے۔ فساد میں اس کا گھر جل گیا تھا نہ اس وجہ سے۔"

"کتنے کا مال تھا؟"

"تین سو کا"

"ٹھیک ہے مزدوری میں دھیرے دھیرے کاٹ لو آئے تو اور مال بنانے کو دے دینا۔ اللہ اللہ قوم پر کیا مصیبت آئی ہے" وہ پانی پی کر لیٹ گئے۔

لیور، کمانی، اسکرو اور رپٹ وغیرہ بنانے کا کام حاجی جی محلے میں بٹوا دیتے ہیں۔ بلکہ عورتیں خود ہی آکر لے جاتی ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے کام عورتیں بچے مل کر کر لیتے ہیں۔ دن بھر عورتیں، لڑکیاں اور بچے کام کر کے شام کو کارخانے میں آکر دے جاتے ہیں اور ماہ بماہ حساب ہو جاتا ہے۔ حاجی جی بڑے فخر سے کہتے ہیں — "اس لیے تو میں بڑی مشینیں نہیں لگاتا ان غریبوں کی روٹی ماری جائے گی۔ ابھی کم سے کم پیٹ بھر کھانا تو مل جاتا ہے۔"

حاجی جی پڑھے کم لیکن کڑھے زیادہ ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ بڑی مشینیں لگانے سے وہ مٹ بھی سکتے ہیں۔ وہ بالکل گھاٹے کا کام ہے۔ ابھی تو فیکٹری ایکٹ ہی لاگو ہوتا "حاجی کریم اینڈ کو" پر۔ جبکہ دوسو آدمی کام کرتے ہیں اور چھوٹا موٹا وہ کام جو کم سے کم تین سو آدمی کرتے، محلے کی عورتیں کر دیتی ہیں۔ لیبر انسپکٹر کے آنے سے پہلے ہی چندو کا لونڈا۔ جو لیبر آفس میں چپراسی ہے۔ آکر حاجی جی کو بتا دیتا ہے۔ حاجی جی آدھے سے زیادہ مزدوروں اور کاریگروں کو پچھلی کھڑکی سے باہر کر دیتے ہیں۔ ایسی بات نہیں کہ لیبر انسپکٹر نہیں جانتا حاجی کو منھ بند رکھنے کے طریقے معلوم ہیں۔ اب جب فیکٹری ایکٹ ہی لاگو نہیں ہو پاتا تو چھٹیاں، بونس، ای۔ ایس آئی کا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے۔ حاجی جی اتوار کی چھٹی بھی نہیں دیتے۔ کہتے ہیں وہی ہوگا جو ہوتا چلا آیا ہے۔ جسے نہ کرنا ہو وہ وریندر بابو کے کارخانے میں چلا جائے۔ وریندر بابو کے کارخانے کا نام آتے ہی سب کے چہرے اُتر جاتے ہیں۔ سینکڑوں ہندوؤں کے بیچ ایک آدھ مسلمان کیسے کام کر سکتا ہے؟ اگر کسی دن فساد ہو گیا؟

حاجی جی کڑا کرنے کے بعد ملایم لہجے میں سمجھاتے ہیں "اسلام تمھیں نہیں سکھاتا ہے کہ مسلمان کے کارخانے میں کام نہ کرو اور تھوڑے کے لالچ میں ہندو کے کارخانے چلے جاؤ؟ وریندر بابو سے تمھارا کیا رشتہ ہے؟ میں نے مانا تمھیں یہاں تکلیف ہے تھوڑی مگر آرام بھی تو ہے۔ عید بقرعید کی چھٹی دیتا ہوں۔ نماز روزے میں تمھارے ساتھ ہوں۔ ارے بھائی میں تو یہاں سے وہاں تک تمھارے ساتھ ہوں۔ کوئی زیادتی کروں تو اللہ کے یہاں دامن تھام سکتے ہو۔ لیکن وریندر بابو کے یہاں کیا کروگے؟ اگر کبھی فساد ہو گیا تو وہیں تو دبے جاؤگے نا؟ اسلام کی ساری تعلیمات کو بھول گئے ہو؟ یہی تو قوم میں سب سے بڑی خرابی ہے کہ ایک مسلمان کسی دوسرے بھائی کا فائدہ نہیں دیکھ سکتا۔ جاؤ بھائی جاؤ، جسے جانا ہو جاؤ۔ میں تو وہی کروں گا جو کرتا آیا ہوں۔"

وہ اپنی لال آنکھوں سے مزدوروں کی طرف دیکھتے ہیں "جاؤ وریندر بابو کے کارخانے اپنے مسلمان بھائی کے مٹ جانے کی فکر کیوں کرتے ہو؟" ان کی آنکھوں میں پانی بھر آتا ہے "اللہ اللہ۔"

کوئی نہیں جاتا۔ سب سچے مسلمان ہیں۔ پاور پریس چلنے لگتی ہے۔ لوہا گلایا جانے لگتا ہے۔ اور پرانا بڑا مکان دھوئیں اور اس کی بدبو سے بھر جاتا ہے۔ سیٹھ حاجی کریم باہری کمرے یعنی آفس میں گاؤ تکیے سے لگ کر لیٹ جاتے ہیں۔ سوچتے ہیں، اللہ کی بڑی مہربانی ہے اُن پر۔ دوسرے کارخانوں میں کبھی پی، ایف کا جھگڑا ہوتا ہے تو کبھی کمپن سیشن گریجویٹی کے لیے دھرنا ہوتا ہے۔ لے آف اور لاک آوٹ کے چکر میں کہیں کام ہو سکتا ہے؟ انکم ٹیکس، پروفیشنل ٹیکس اور اور پتہ نہیں کیسے کیسے ٹیکس لگے ہوئے ہیں۔ کسی مزدور کو نکال نہیں سکتے کسی کو رکھ نہیں سکتے تو پھر مالک کاہے کے؟ حاجی جی اللہ اللہ کر کے پھر لیٹ گئے۔ کارخانے میں کام ہو رہا تھا۔

نجمہ شہریار

مٹّی کا مادھو

سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے اُس نے محسوس کیا کہ اس دیہات کا آسمان شہر کے آسمان سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔ یہاں ملوں کا دم گھونٹنے والا دھواں اور ٹریفک کا شور نہیں ہے۔ یکسوئی کے ساتھ تخلیقی کام کرنا یہاں کتنا آسان ہے۔ یقیناً وہ تھوڑے ہی عرصہ میں بہت کچھ لکھ سکے گا۔

ہوا کے ایک تیز جھونکے سے دیوار پر لگا ہوا کلینڈر ہلنے لگا۔ سامنے کھنڈر پرسکون تھا ــــــ اس کے کنارے گھنے سایہ دار، خاموش اور اُداس درخت ــــــ کون سا اسرار ہے ان درختوں کے پیچھے۔ کتنی خاموشی، کتنا سکون...... ذوقِ نظارہ نے تخیل کے در کھول دیے ہیں لگتا ہے اس حُسن کی لذّت میں سارا جسم تحلیل ہو جائے گا ــــــ اتنا سکون ــــــ کوئی شور نہیں، کوئی آواز نہیں...... بھئی اب کچھ لکھنا چاہیے اور اس نے قلم اُٹھایا ــــــ

اور کھٹ کھٹ کی ایک زور دار آواز نے اس کے خیالات کو منتشر کر دیا۔ وہ آواز قریب ہی کہیں سے آ رہی تھی ــــــ اُس کے سر میں دھمک سی ہونے لگی ــــــ تو سکون یہاں بھی نہیں ــــــ پھر آدمی کہاں جائے ــــــ

وہ بے ہنگم آواز برابر آ رہی تھی۔ بکھرے خیالات کو یکجا کرنے کی اس نے بہت کوشش کی اور ناکام ہونے پر کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا ــــــ اور آنکھیں بند کر کے اُس آواز کے رُکنے کا انتظار کرنے لگا ــــــ لیکن "کھٹ..... کھٹ...... کھٹ" اُسے بڑی جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی ــــــ صبح وہ ضرور معلوم کرے گا کہ آخر یہ آواز کہاں سے

آتی ہے اور کون ہے جسے رات کا سکون برباد کرنے میں اتنی دلچسپی ہے۔
اس نے سگریٹ سلگائی اور اس کی خوشبو اُسے اس وقت بیحد لطیف محسوس ہوئی۔
شیڈ دار، خوبصورت آرٹسٹک لیمپ جیسے اُسے دعوت دے رہا تھا کہ آؤ اور ہماری روشنی میں اپنے بیش بہا خیالات کو صفحۂ قرطاس پر اتار دو—— کھڑکی کے اس پار آسمان بے حد حسین تھا۔ تالاب کے پانی میں پڑتا ہوا چاند کا عکس اور درختوں کے پُر اسرار و مہیب سائے۔ کتنا مناسب ماحول اور اُس کے برخلاف "کھٹ کھٹ" کی اتنی ناگوار اور بیہودہ آواز—— غصہ جب اور بڑھا تو اس نے بتّی گل کر دی اور سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا—— وہ آواز مسلسل آرہی تھی۔
"کھٹ..... کھٹ.. ..." سارا موڈ چوپٹ ہوگیا۔ اُس وقت وہ یقیناً بہت اچھا کچھ لکھ سکتا تھا۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک موچی رہتا ہے جو دن رات اپنا کام کرتا ہے۔ محلہ والوں نے بے حد چاہا کہ وہ رات کو کام کرنا بند کر دے لیکن اُس نے کسی کی ایک نہ سُنی۔ اور اب تو محلہ والے اس آواز کے عادی بھی ہو چکے ہیں۔
اور جس وقت وہ اُس موچی سے بات کرنے پہونچا تو وہ اپنی جھونپڑی کے سامنے بیٹھا ہوا جوتے بنا رہا تھا۔ سارا سامان بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ کئی جوڑ جوتے...... پالش سے چمکتے سیاہ جوتے، پھٹے ہوئے اور مٹی میں لتھڑے ہوئے جوتے اور چپلیں لال، ہری، نیلی چمڑے کے ٹکڑے، کیلیں اور جوتا بنانے کے اور دوسرے اوزار اس کی دھوتی پر جا بجا پالش کے داغ تھے—— اور واسکٹ مزید مرمت کے لیے ہرگز تیار نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس کے دائیں کان کے اوپر ادھ جلی بیڑی کا ٹکڑا بالکل صاف نظر آرہا تھا۔
"رام دلارے"—— وہ موچی سے دھیرے سے مخاطب ہوا۔ نام اس نے پہلے ہی معلوم کر لیا تھا۔
رام دلارے گھبرا سا گیا۔ اپنے برابر "جنٹلمین" کو کھڑا دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ اُس کے پیروں کی طرف بڑھائے۔

"سرکار —— جوتا یا لش ؟"

"نہیں رام دلارے مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ تم رات رات بھر شور کیوں کرتے رہتے ہو۔ کل رات نہ تو میں لکھ پڑھ سکا اور نہ ہی سو سکا۔"

اتنے میں رام دلارے نے پاس کھڑی ہوئی کھاٹ بچھا دی۔ "بیٹھ جاؤ بھیا —— ہاں تو کا کہا —— ارے ٹھاڑے دکھڑے، کاہے ہو میاں بیٹھ جاؤ تنی ——"

اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اس نے دیکھا —— رام دلارے کے چہرے پر پڑی جھرّیوں، اندر کی طرف دھنسی آنکھوں، خشک اور اُلجھے ہوئے بالوں اور ننگے پیروں کی طرف ....

"ہاں بھیتے تو تم کا کہہ رہے تھے —— ؟ کھٹ کھٹ ہوت ہے۔ وہ تو جانو ہم اپنا کام کرت ہیں۔ دن کا بچا کھچا کام رات کا ختم ہو جات ہے۔"

"رام دلارے میں رات کو اپنا بہت ضروری کام کرتا ہوں۔ لکھتا پڑھتا ہوں اس میں تمہاری ہتھوڑی کی آواز سے بہت حرج ہوتا ہے۔ کیا تم ایسا نہیں کر سکتے کہ دن میں اپنا کام ختم کر لو۔"

"کا بھیا تم کوئی بیوپاری اوپاری ہو۔ ہم تو اُہی جانت ہیں سائد تحصیل ہی ما نوکر ہو۔ کاہے بھیا ..... ہاں تو بھیا تم کیا کہہ رہے تھے رات ما ہم کام نہ کیا کری —— یو بھلا کیسے ہو سکت ہے۔ بھیا دن ما تو جانو ہمرا کام کچھو کھتم ناہیں ہوت ہے۔ ابھیں دیکھو اتنے سارے جوتے پڑے ہیں۔ رات بھر کام کیا ہم تبھوں اتنا کام بچ گوا۔ تم تو جانو میاں ندھن آدمی ہیں۔ ابھیں بڑی بٹیا کیر ابیاہ کیا رہے سو بدھیا بیٹھ گئی ہمری۔ تبھوں سسراری منٹی کہت رہیں کہ دہیج کم دہن" —— یہ کہہ کر اس نے بڑے جوش سے ہتھوڑی کیل پر مار دی۔

اتنی سخت محنت، اس پر اتنی مفلسی، زندگی کتنی کٹھن ہے اور اس پر وہ اس کو کام سے منع کر رہا ہے۔ لیکن اس کے ذہن میں خیال ابھرا —— تو پھر آخر وہ خود کیسے لکھے گا۔ فن کی تخلیق کیے بغیر وہ بھی تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر اسے سکون کی تلاش میں اور کہیں جانا پڑے گا لیکن —— یہ خوبصورت تالاب، یہ سایہ دار، پراسرار درخت،

یہ پُرسکون آسمان ـــــ نہیں وہ یہ جگہ تو کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ پھر اُسے اپنا ناول بھی تو بہت جلد ختم کرنا ہے۔ اسے اپنے فن سے محبت ہے ـــــ اور ایک بار پھر رات کی خاموش فضاؤں میں اُبھرنے اور ذہنی سکون کو برباد کرنے والی تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"تو رات کو کام کرنے پر تم پورے مہینے میں کیا کما لیتے ہو؟"

"اہی کوئی پندرہ بیس روپیہ اور کا ـــــ بس گجر بسر ہو جات ہے۔" وہ کھانستے ہوئے بولا۔

"اچھا تو تم اس سے زیادہ روپیہ مجھ سے لیلو اور رات کو کام کرنا بالکل بند کر دو۔"

اس وقت رام دلارے کی بیوی آگئی بولی "چھٹکے کا بکھار بہت تیج ہے دوا لے کھات کب جیہو۔؟"

اسی وقت رام دلارے کو بہت تیز کھانسی اُٹھی۔ کھانستے کھانستے اس کا سانس اُلٹنے لگا ـــــ پاس رکھی ہوئی چلم کے انگارے سگ سگ کر راکھ ہو چکے تھے اور اندر سے بچے کے رونے کی غرغرے دار آواز آرہی تھی۔

"دیاکھت ہو یہ میاں کہت ہیں کہ ہم سے پیسہ لے لیو اور رات کا کام نہ کیا کرو۔ تو بھلا کیسے ہو سکت ہے؟"

"اور کا ہم اِتّی بار کہا تم سے پر تم مانت کب ہو نکلے ڈلے کے منئی کہت کہت تھک مرے۔ بھیا۔ جب پیسہ دے کا کہت ہیں تو لیو میہنت کی رکم اور ٹُبو یہ کے رات کا بال .... وہ ذرا غصّہ سے بولی۔

"اری توری کا تو جانو یہی پری رہت ہے۔ کچھ سو جھت ہے رات کا کام نہ کری تو پیٹ کیسے بھرے؟" اس نے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــــ "ابھی چھٹکی بٹیا اکیرا بیاؤ کرے کا ہے اور دیوے ناہیں کھلت ہیں جوڑ" یہ کہکر اُس نے کان کے اوپر پھنسا ہوا بیڑی کا ٹکڑا نکال کر سلگا یا اور ہتھوڑی اُٹھالی۔

"رام دلارے تمھاری بہت مہربانی ہوگی اگر تم رات کو کام نہ کیا کرو۔ میں تم کو کافی پیسے دوں گا۔ تھوڑے ہی دن بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا پھر تم جب چاہنا کام کرنا۔"

اور رام دُلارے کی بیوی چوکر پہ ہاتھ رکھے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی
پیچ وتاب کھاکر بولی

"کاہے مفت آئی رکم کا کھوت ہو۔ کچھ دن پچھے سے جین کی بنسی کا ہے نا ہے بجابت ہو۔ ہوں نہ ـــــ یو تو سمات ناہیں کرت ہیں۔ تم رکم ہم کا دیو ہم ان کا سمجھائے دیب۔"

رام دلارے فیصلہ کن انداز میں بولا "اس کی تو یہی باتیں رہت ہے چاہت ہے ہم دن رات جنوا ینڈ یا وا کریں۔ بھیّا ہم کام کیے بنا کیسے رہ سکت ہیں۔"

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔ کہیں اور چلا جاؤں گا ـــ" بہت مایوس ہو کر وہ بولا۔ رام دلارے نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ہتھوڑی پرے سرکائی۔ اور اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا بھیّا تو اپن جیئو چھوٹا نہ کرو۔ لاؤ رکم ہم کا دیو۔ آج سے ہم رات ما کام نہ کرب۔"

وہ اس غیر متوقع عنایت سے بہت خوش ہوا۔ جلدی سے پچاس روپیہ نکال کر رام دلارے کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

"لو یہ روپیہ۔ اور ہاں وعدہ پکّا رہا سمجھے۔ وہ مسکرایا۔

رام دلارے نے سر ہلا کر گویا اُسے یقین دلایا۔ اس کی بیوی کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

"بھگوان جب دیت ہے تو چھپر پھاڑ کے دیت ہے۔ اب رکھوان پیسوں کا للّی کے بیاہ دکھاتن" پھر وہ اس سے مخاطب ہوئی۔

"بھگوان تم کا جندہ رکھے جُگ جُگ جیو۔ یو اب تے رات کا کام ناہیں کریہیں۔"

وہ اسے یقین دلاتے ہوئے بولی۔ وہ بہت خوش تھی اور اندر بچہ بہت زور شور سے رو رہا تھا۔

وہ مطمئن سا ہو کر وہاں سے چل دیا۔ خوشی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا احساس دل میں لیے جیسے کوئی اس سے کہہ رہا ہو کہ تمہارا یہ فعل کچھ زیادہ مناسب نہیں تھا۔ تم جو ایک فنکار ہو آرٹسٹ ہو۔ تم کو محض پیسہ کے زور سے اس موچی کو کام سے روکنے کا یقیناً کوئی حق نہیں تھا۔ وہ شخص جسے پیسے کی اشد ضرورت ہے۔ جسے اپنی بیٹی بیاہنا ہے اپنے بچے

کی دو والا نل ہے۔ اگر کوئی تم سے آکر کہے کہ تم رات کا کام نہ کرو۔ لکھنا بند کر دو تو کیا کرو گے۔ اپنے شدید جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے کیا تم تڑپ نہ اُٹھو گے؟ تمھارے ذہن میں اُبلنے والے لاوے باہر آنے کو بے چین نہ ہوں گے؟ یہ تم نے کچھ اچھا نہیں کیا تو پھر واپس جاکر اس موچی سے کہہ دوں کہ وہ آزادی سے جب جی چاہے اپنا کام کرے۔ پھر اُسے رام کا خیال آیا۔ کتنی خوش تھی وہ روپیہ ملنے پر ——— پھر دل کے اندر سے آواز آئی تم فن کی تخلیق کیسے کر سکو گے؟ ہتھوڑی کی وہ تیز آواز تم کو ذہنی سکون کیسے نصیب ہونے دے گی؟ پھر شہر کے ہنگاموں اور دیہات کی پرسکون فضا میں فرق ہی کیا رہ جائے گا؟ او نھو دیکھا جائے گا اسے یہاں رہنا ہی کتنے دن ہے۔ صرف ایک ماہ۔ اور اتنے دن وہ سکون کے ساتھ یقیناً وہ بہت کچھ لکھ سکے گا ——— اور پھر اُس نے مفت اتنی بڑی رقم بھی تو اس کو دی ہے۔

پھر کئی شامیں اور راتیں انتہائی خاموشی اور سکون سے گذر گئیں، آدھی آدھی رات تک وہ بے تکان لکھتا رہتا ——— یہ ماحول، یہ سکون ——— یہ خاموشی تخلیق فن کے لیے یہ سب کتنے ضروری ہیں۔ یہ بکیسوئی شہر کے ہنگاموں میں کہاں ـــ

"صاحب آپ سے ملنے کوئی آیا ہے" نوکر نے چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کون ہے؟"

"صاحب وہ نام نہیں بتاتا۔ بس آپ کو بُلاتا ہے" اور رام دلارے نوٹوں کی وہی گڈی لیے کھڑا تھا جو ایک ہفتہ پہلے اُس نے اُسے دی تھی۔

"ارے رام دلارے تم ——— ؟" وہ حیران تھا۔

رام دلارے کے چہرے پر پشیمانی اور ندامت کے آثار تھے۔ نگاہیں جھکائے وہ اس طرح کھڑا تھا جیسے بہت بڑی خطا اس سے سرزد ہوگئی ہو ——— دھوتی اور زیادہ میلی ہوگئی تھی۔ اس پر پڑے ہوئے سیاہ داغ اور واضح ہو گئے تھے اور اُس کے پیر ننگے تھے ———! حالانکہ اس کی ساری عمر محض جوتے بنانے ہی میں گذری تھی۔

"بھیّا ہم کا بہت شرم لگت ہے تم سے یوں کہتے ——— " وہ رک رک کر جھجکتے ہوئے

بولا کہ ـــــ "بھیا...... ہم کا یو روپیہ ناہیں چاہیے ـــــ تم جانو اس بیچ ہم کا ایک رات ناہیں چین پڑی۔ ہر سمے ہمرا ساتھ ہتھوڑی کی النگ (طرف) جات رہے۔ ہم بار بار اپن کا روکا کہ ہم وا دا کیا بھیا سے تو وہ کا کہیں کچھ کما ناہیں جات ہے۔ کام کیے بنا جو ہم رہ ناہیں سکت ہیں۔ ہم کا بھیا یو روپیہ ناہیں چاہیے۔"

نوٹوں کی گڈی اس نے جھک کر آگے بڑھا دی ـــــ "ہمکا مابھی دیو سرکار ـــــ ہم کا مابھی دیو سرکار ـــــ رام رام۔" اس نے ہاتھ جوڑے ـــــ ندامت سے اس کا سر جیسے اُٹھ نہ رہا ہو ـــ وہ تیزی سے مڑا ـــــ اور چند لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اظہار الحسن

شعبۂ جغرافیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تصویر کی زبان

نیشنل آرٹ گیلری میں میری پینٹنگ کی نمائش کا یہ ساتواں اور آخری دن تھا۔ اس ایک ہفتہ کے دوران ہزاروں شائقین نے اس نمائش کو دیکھا تھا اور میری حوصلہ افزائی کی تھی، میرے آرٹ کو سراہا تھا لیکن میرا دل بجھا بجھا تھا۔ میرے ذہن میں کدورتوں اور غم و غصہ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ مجھے تعجب اور افسوس اس بات پر تھا کہ جو پینٹنگ مجھے سب سے زیادہ پسند تھی، جس کے بارے میں میں نے سب سے زیادہ سوچا تھا سب تصویروں سے زیادہ وقت صرف کیا تھا جسے تیار کرنے میں رنگوں کے ساتھ اپنا خون جگر لایا تھا جس کی تکمیل میں نہ جانے کتنی راتیں، کتنے دن مسلسل بیٹھ بیٹھ کر گزارے تھے اس تصویر کو کسی نے قابل توجہ نہیں سمجھا تھا، اسے کسی نے نہیں خریدا تھا۔ دوسری پینٹنگ بک ہو گئی تھیں۔ ہر آنے والا اس تصویر پر اچٹتی نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتا تھا اور میرا دل کڑھ کر رہ جاتا۔ بد ذوق کہیں کے میری نفرت زبان اختیار کر لیتی۔

فنکار کی اور عوام کی پسند میں فرق تو ہونا ہی چاہیے۔ یا ہو سکتا ہے اس کی قیمت زیادہ تھی اس لیے اس تصویر کو کسی نے بک کرانے کی ہمت نہ کی ہو۔ میں نے خود کلامی کرتے ہوئے اپنے دل کو تسلی دی تھی لیکن اس سے زیادہ قیمت بارہ سو روپیہ کی ایک پینٹنگ بک ہو چکی تھی اس کی قیمت صرف سات سو پچاس روپیہ ہی ہے، میرے اندر کے آرٹسٹ نے کہا تھا اور میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات اندھیروں اجالوں کی طرح ابھرتے ڈوبتے رہتے تھے۔ ساری دنیا کے لوگ مجھے سینکڑوں میٹر پھیلے ریگستان کی طرح خشک نظر آنے لگے تھے۔ شاندار کوٹھی، خوبصورت موٹریں،

پرکشش شخصیت بنانے والے بیش قیمت لباس تو بازاروں سے خرید کر لوگ مہیا کر لیتے ہیں لیکن فن کو پرکھنے اور پہچاننے والی نظر کسی بازار سے نہیں خرید جا سکتی، کوئی سرمایہ دار اپنی تمام دولت دے کر بھی اسے نہیں خرید سکتا۔ بے چارے یہ مالدار لوگ ——— میں اپنے دل کو تسلیوں کی وادی میں گھما رہا تھا۔

ابھی نمائش ختم ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے اور میری امید کی نظروں کے تار ابھی ٹوٹے نہیں تھے۔ شاید اب بھی کوئی آ جائے۔ ایک آس تھی جس نے میری نگاہوں کو اس تصویر پر جما دیا تھا میری پوری توجہ کا مرکز بن گئی تھی وہ تصویر۔!

تصویر سے زیادہ اب مجھے اس تصویر شناس کی جستجو تھی جس کے قدم اس تصویر کے سامنے ٹھہر جائیں جو اس تصویر کو پہچان سکے اس کے رنگوں میں چھپے ہوئے مطلب کو سمجھ سکے اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر سکے۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے دیکھا، ایک لڑکی آئی اور اس پینٹنگ کے سامنے آ کر تصویر بن گئی۔ میرا دل سینے کی پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ میری اداسیوں کے خاموش سمندر میں خوشی کی لہریں اٹھنے لگیں۔ میری نگاہیں اس لڑکی پر جم گئیں اور وہ لڑکی گردوپیش کے ماحول سے بے خبر تصویر میں کھوئی رہی۔ تقریباً ایک گھنٹہ مسلسل جائزہ لینے کے بعد وہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی "میرے نام اس پینٹنگ کو بک کر دیجیے"، اس نے پرس سے سو روپیہ کا ایک نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے درخواست کی تھی اور میں نے سیلز کارڈ اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ سفید چمکیلے کارڈ پر اس نے سیاہ روشنائی سے "نیلم" لکھ کر کارڈ مجھے واپس کر دیا تھا

"آپ نے دوسری تصویروں کو تو دیکھا ہی نہیں" میں نے سوال کیا تھا۔

"اس تصویر کو دیکھنے کے بعد میں نے دوسری تصویروں کو دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی" اس نے ایک فنکار کی روح کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ میں نے ایک نظر اس کے سراپے پر ڈالی تھی۔ اس معمولی سی شکل و صورت والی لڑکی میں بے شمار پینٹنگیں نہاں تھیں۔ اس کا چہرہ پرکشش اور فنکارانہ تھا اس کے تناسب جسم میں آرٹ کی دنیا سکڑ رہی تھی کسی بھی آرٹسٹ کے نقطۂ نظر کے مطابق وہ خوبصورت کہی جا سکتی تھی۔

"میں ایک درخواست آپ سے اور کرنا چاہتی ہوں...... میں آپ کا اسٹوڈیو دیکھنا چاہتی ہوں اور اگر آپ اجازت دیں تو یہ تصویر بھی میں کل آپ کے اسٹوڈیو سے ہی لے لوں گی۔
اس نے مسکراہٹوں کے پھول بکھیرتے ہوئے درخواست کی تھی اور میں لاجواب ہو کر رہ گیا تھا۔
"کل شام چار بجے" ؟ کہہ کر وہ فضا کو مترنم بناتی ہوئی آرٹ گیلری کے دروازے سے باہر نکل گئی تھی اور میری نگاہوں نے آخری حد تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

دوسرے دن وہ ٹھیک چار بجے میرے اسٹوڈیو آگئی تھی۔ میری اجازت سے وہ کینوس پر ابھرتی پھیلتی تصویروں کو دیکھنے میں مشغول ہو گئی تھی...... میں نے کہا تھا "آپ ان نامکمل تصویروں کو دیکھ کر کیا کریں گی ؟

مجھے نامکمل چیزوں کو دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ہر ادھوری چیز میں پیاس ہوتی ہے ، ایک تشنگی ہوتی ہے اور یہی تشنگی زندہ رہنے اور زندگی کی علامت ہوتی ہے.........
اب آپ ان تصویروں کو ہی دیکھ لیجیے ، ان کی تشنگی دور کرنے کے لیے جب آپ کا برش آگے بڑھے گا تو یہ تصویریں نہ صرف اس کا خیر مقدم کریں گی بلکہ اپنے روح کی گہرائیوں میں اسے پوشیدہ کرلیں گی۔ پھر یہ مکمل زندگی بن جائیں گی۔ مجسم آرٹ کا نمونہ بن جائیں گی، مجسم آرٹ کا نمونہ بن جائیں گی یہ تصویریں...... وہ اس طرح بات کر رہی تھی جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کو مدت سے جانتے ہوں۔ بات بات میں وہ میرے بہت نزدیک آتے ہوئے کہنے لگی"۔

"ساگر صاحب کیا میں آرٹسٹ نہیں بن سکتی ؟ دیکھیے میری انگلیاں کس قدر آرٹسٹک ہیں ، دیکھیے دیکھیے ، کہتے ہوئے اس نے بہت معصومیت کے ساتھ اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں پر رکھ دیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گلاب کے پھولوں کی پنکھڑیوں کی ایک تہ میرے ہاتھوں پر رکھ دی گئی ہے۔ چمیلی کی شاخ کی طرح نازک مخروطی انگلیاں واقعی آرٹسٹک تھیں "آپ کی صرف انگلیاں ہی نہیں پورا جسم بہت آرٹسٹک ہے" میں نے سچ بولتے ہوئے کہا تھا میری سچائی سن کر وہ پھولوں سے لدی شاخ کی طرح لچک لچک گئی تھی ، اس کا چہرہ گلنار ہو گیا تھا۔
میری دیرینہ خواہش ہے کہ میں آرٹسٹ بن جاؤں اگر آپ مجھے سہارا دیں تو میرا یہ خواب حقیقت بن سکتا ہے...... اس نے میری طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

اور میرا دل کہہ رہا تھا۔ کاش یہ روز میرے اسٹوڈیو آیا کرے۔ اس کی موجودگی میری تصویروں میں ایک نئی روح پھونک دے گی۔ میری پسند کے رنگوں کا امتزاج ہے یہ لڑکی۔ پھر بھی میں نے امتحان لینے کی غرض سے کہا تھا۔ اگر آپ نے میرے ایک سوال کا جواب دے دیا تو میں آپ کی درخواست پر غور کروں گا۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ نے اس تصویر کو کیوں پسند کیا۔ آرٹسٹ اس کے ذریعہ کیا دکھانا چاہتا ہے؟

میرا سوال سن کر وہ صبح کے پھول کی طرح کھل اٹھی تھی" ساگر صاحب! آج کے دور کی نمائندگی کرنے والی اس سے بہتر کوئی دوسری تصویر نہیں ہو سکتی ..... ایک طرف کامیابی کی معراج چاند تاروں تک رسائی، دولت کی فراوانی، عیش و عشرت کی بہتات بادلوں کی چومنے والی بلند عمارتیں، دوسری جانب افلاس کی حکمرانی، فٹ پاتھ کے سینے پر روتے بلکتے اور سسکتے ہوئے معصوم جسم، ہوس پرستوں کی آغوش میں مجبور جوانیاں...... کیا کچھ نہیں ہے اس تصویر میں۔ یہ تصویر مکمل داستان ہے اس بیسویں صدی کے دور کی!" اس نے یہ جملے اس طرح ادا کیے تھے جیسے تصویر کو زبان بخش دی گئی ہو اور وہ بول رہی ہو۔ اور میں سوچنے لگا تھا یہ سادہ سی لڑکی کتنی صلاحیتوں کی مالک ہے۔

اب وہ روز میرے اسٹوڈیو میں آنے لگی تھی اس کے ذہن میں نئے نئے خاکے جنم لیتے رہتے اور رنگوں کی شکل میں کینوس پر پروان چڑھتے رہتے۔ اس کی انگلیوں کی حرکات بتاتی تھی کہ اس سے پہلے بھی وہ پینٹنگ کرتی رہی تھی جس کا اظہار اس کی زبان سے کبھی نہیں ہوا تھا۔

پہلے ہفتہ میں اس نے دو پینٹنگ تیار کیں۔ آئل کلر سے بنائی گئی یہ تصویریں کسی بھی آرٹ گیلری کی زیبائش کے لیے کسی طرح سے کم نہ تھیں۔ اچھا اور ہونہار شاگرد ہو تو استاد کی دلچسپیاں بڑھ جاتی ہیں میری توجہ کا مرکز بھی نیلم بن گئی.......

ایک دن جب نیلم اسٹوڈیو آئی تو اس کے ہاتھ میں فولڈ کیا ہوا ایک کاغذ تھا۔ آتے ہی مسکراتے ہوئے کہنے لگی

" ساگر صاحب کیا آپ سمندر کو کاغذ کے اندر بند کر سکتے ہیں؟" اور میری زبان سے

بے ساختہ "نہیں" نکل گیا۔
"لیکن میں نے کیا ہے؟" کہتے ہوئے اس نے وہ کاغذ کھولا تھا۔ چارکول سے بنایا گیا میری تصویر کا یہ پوٹریٹ تھا جس کے نیچے لکھا تھا "ساگر"
اوہ تو یہ بات ہے۔
جی میں نے رات کو یہ تصویر بنائی تھی۔
لیکن میرا فوٹو تمھیں کہاں سے ملا؟
"آپ کا فوٹو تو ہر وقت میرے دل کے فریم میں رہتا ہے۔ آپ کی تصویر میرے ساتھ چلتی پھرتی ہے، یہ میرے ساتھ سوتی ہے، میرے ساتھ جاگتی ہے۔ آپ کی تصویر کا مقام میری روح کی گہرائیوں میں ہے، کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا ہے کہ آئینہ میں اپنی شکل کی جگہ میں آپ کی شکل دیکھتی ہوں۔" وہ جذباتی انداز میں کسی فلمی ہیروئن کی طرح بول رہی تھی اور میں پتھر کے مجسمے کی طرح اس موم کی گڑیا کو دیکھ رہا تھا۔
میرا دل چاہا کہ کہہ دوں "یہ الفاظ تو میرے جذبات ہیں جو تمھاری زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ تم نے تو میرے دل کی ترجمانی کی ہے لیکن نہ جانے کیوں چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکا۔
اس نے اپنے دل کی بات کتنی سادگی اور معصومیت کے ساتھ کہہ دی تھی اور میں بار بار کوشش کے باوجود دو لفظ بھی نہ کہہ سکا تھا...... شاید یہ عمر کا فرق تھا، میرے سامنے بہت سے نشیب و فراز تھے، پوری محبت کی دنیا تھی میرے سامنے۔ مگر۔ نیلم۔ وہ تو......
شام ہوتے ہوتے نیلم چلی گئی اور میں بُت بنا اسٹول پر بیٹھا رہا۔ ذہن کے کینوس پر زندگی کی منزلوں کے خاکے بنتے رہے، ابھرتے رہے۔ مٹتے رہے اور نیلم میرے ذہن پر چھا گئی۔
اب وہ اپنے ہاتھ سے پینٹنگ بنانے لگی تھی کسی کی تصویر پر میں صرف فائنل ٹچ دے دیتا تھا وہ بھی اس لیے کہ نیلم کا یقین تھا کہ جب تک میرا برش اس کی پینٹنگ پر نہیں لگتا وہ مکمل ہوتے ہوئے بھی نامکمل رہتی ہے۔
نیلم یوں تو ہر روز ہی اسٹوڈیو آتی تھی لیکن کبھی کبھی کسی مجبوری کے تحت ناغہ بھی ہو جاتا تھا۔ اس کی عدم موجودگی سارے اسٹوڈیو پر گراں گزرتی تھی میرا دماغ بھی غیر حاضر رہتا تھا۔

123860
22.3.95

میرے ذہن میں الٹی سیدھی لکیریں کھنچتی رہتی تھیں اور وہ رہ رہ کر میری نگاہیں دروازے پر جا کر ٹھہر جاتی تھیں۔ میرے ہاتھ پر رکھا ہوا پیلیٹ مجھ سے نیلم کے بارے میں سوال کرتا تھا۔ ایزل آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیلم کو تلاش کرتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں کینوس پر کوئی رنگ نہ ابھرتا تھا۔ جب وہ کئی دن بعد آتی تو ساری چیزیں اس سے شکایت کرنے لگتیں اور نیلم مجھ سے سوال کرتی۔ "کیا ان دنوں کوئی بھی پینٹنگ مکمل نہیں ہوئی؟ جس طرح میں چھوڑ گئی تھی اسی طرح ہر تصویر ہے" اور میں مسکرا کر رہ جاتا۔ دل چاہتا کہ کہہ دوں، نیلم تمہارے بغیر تو یہ ساگر بھی ادھورا اور نامکمل ہے، تم تصویر کی بات کرتی ہو؟ اس 'ساگر' کی زندگی تو نیلم کے پانی سے ہے۔ یہ "ساگر" خشک ہو جائے گا نیلم۔ اگر تمہارا دل بدل جائے...... لیکن میں کچھ نہ کہہ پاتا...... پھر بھی نیلم میرے خاموش چہرے کی عبارت پڑھ لیتی...... اس کی آنکھیں فراستِ سے نم ہو جاتیں اور ہم دونوں تصویروں کی دنیا میں کھو جاتے۔

نیلم اور میرے درمیان جو پاکیزہ رشتہ تھا اسے صرف محسوس کیا جا سکتا تھا نام نہیں دیا جا سکتا تھا ہمارے تعلقات کے درمیان پراگندگی کے جراثیم کبھی نہ پیدا ہو سکے۔ تعلقات کے صاف و شفاف دامن پر جنسی گندگی کا کبھی کوئی داغ نہ لگ سکا۔ جسم کی راہوں پر ہمارے خیالات کبھی سفر نہ کر سکے۔ محبت کا رشتہ جسم کے رشتہ سے بالاتر ہوتا ہے۔ محبت روح کے ریگستان میں آبیاری کرتی ہے۔ محبت تو وہ اتاہ سمندر ہے جس میں بڑے سے بڑا جسم غرق ہو کر فنا ہو جاتا ہے اور باقی رہ جاتی ہے محبت! صرف محبت، سیپ کی طرح صاف و شفاف۔

ایک شام نیلم نے بغیر مجھ سے مشورہ لیے ایک پینٹنگ کی آؤٹ لائن کھینچ دی۔ اسٹوڈیو سے جاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا تھا۔ "ساگر صاحب، آپ کی اجازت کے بغیر میں نے ایک پینٹنگ کی داغ بیل ڈال دی ہے اور جب تک وہ مکمل نہیں ہو جائے گی آپ کو نہ دکھاؤں گی اور نہ آپ ہی دیکھیے پلیز؟؟"

جب شام کو نیلم جاتی تو اس پر نقاب ڈال دیتی اور میں خواہش مند ہوتے ہوئے بھی اس کی نقاب کشائی نہ کر پاتا۔ میرا دل چاہتا کہ اسے دیکھوں کہ آخر وہ ہے کیا جسے نیلم

مجھ سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے لیکن میں اس خیال سے اسے نہ دیکھ سکا کہ فنکار کا فن جب تک وہ اس کی نمائش نہ کرے، نہیں دیکھنا چاہیے۔

ایک ہفتہ بعد یہ کہتے ہوئے اس نے پینٹنگ میرے سامنے رکھ دی "دیکھیے ساگر صاحب..... میری تصویر مکمل ہو چکی ہے...... ایکسیڈینٹ...... خون..... سڑک پر پڑی ہوئی ایک دوشیزہ کی کچلی ہوئی لاش، خون سے بھری ہوئی سیندوری مانگ.....

تمھیں حادثات آخر اس قدر کیوں پسند ہیں اور وہ بھی اتنے خوفناک؟ میں نے سوال کیا۔ نگاہوں سے نیلم کو قدرِ غصہ کے ساتھ دیکھا تھا۔

"حادثات ہی تو زندگی کا اصلی نام ہیں، مجھے سمندر کا سکوت پسند نہیں ہے، اچھلنے کودنے اور آبشار کی طرح زندگی گزارنا ہی زندگی ہے جو پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر میدانوں میں بکھر جاتا ہے...... تصویر اچھی تھی۔ واش پینٹنگ کی تکنیک سے بنائی ہوئی اس تصویر میں رنگوں کا بہترین امتزاج تھا...... میں تصویر کی تعریف کر رہا تھا اور نیلم کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں.......

دوسری شام، اسٹوڈیو کے سامنے سے گزرنے والی سڑک پر بھیڑ جمع تھی، شور کی آوازوں نے مجھے سڑک پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ "موٹر ٹرک سے کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے" کوئی راہگیر کہتا ہوا گزر گیا تھا۔ میں نے لوگوں کی بھیڑ کو ہٹاتے ہوئے دیکھا تھا، نیلم بے ہوشی کی حالت میں سڑک پر پڑی تھی، جس کے ریشمی سیاہ بالوں میں خون کی لالی رچ گئی تھی اس کے خوبصورت جسم سے خون بہہ بہہ کر کھردری سڑک پر جم رہا تھا۔

ایمرجنسی وارڈ تک پہنچتے پہنچتے نیلم کی روح جسم کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ نیلم کی تصویر مکمل ہو چکی تھی۔

اسپتال سے واپس میں اسٹوڈیو آیا تھا۔ نیلم کی تصویر کہہ رہی تھی۔ آرٹسٹ جھوٹ نہیں بولتا، تصویریں سچ بولتی ہیں...... میں نے تصویر پر سیاہ نقاب ڈال دیا تھا۔ زندگی کے حسین خوابوں کو چھپا دیا تھا۔ آج بھی میرے اسٹوڈیو میں ایک تصویر سیاہ نقاب میں آویزاں ہے۔

طارق ادیب

ایک منٹ اور

جنوری کے آخری ہفتہ کی سرد رات ——— حضرت نظام الدین کا بس اسٹاپ
اُس نے بند گلے کے کوٹ کے تمام بٹن لگا کر اونی ٹوپی کو سر پر اچھی طرح منڈھ لیا۔ جیب سے رومال نکال کر عینک کے شیشے صاف کیے۔ اسے دوبارہ ناک پر جمایا اور ایک نگاہ اپنے پورے جسم پر ڈالی۔ دن میں کئی بار بس سے سفر کرنے اور بھیڑ میں چڑھنے اُترنے کے بعد بھی اپنے آپ کو صحیح سلامت دیکھ کر اطمینان کا لمبا سانس کھینچا۔ دستانے میں محفوظ دائیں ہاتھ سے بیگ سنبھالا اور بایاں ہاتھ جیب سے نکال کر کلائی پر نظر ڈالی دس بجکر تین منٹ ہوئے تھے، گریٹر کیلاش جانے والی آخری بس آنے ہی والی تھی، جامع مسجد سے نو بجکر چالیس منٹ پر روانہ ہونے والی ۱۱۵ نمبر کی بس عام طور پر دس بجکر پانچ منٹ تک یہاں آجاتی تھی۔

رات کی چادر ہر لحظہ گف ہوتی جا رہی تھی۔ مرکری روشنیاں سردی سے ٹھٹھر کر مرئیل ہو چلی تھیں۔ سڑک پر دور نشیب میں، باغ خسرو کے قریب، عرب کی سرائے کا چکر کاٹتی ہوئی متعدد ہیڈ لائٹس تاریکی کا سینہ چیرتی بڑھتی چلی آرہی تھیں ——— اس نے پھر گھڑی دیکھی۔ دس بج کر چار منٹ ہو گئے تھے۔ آگے پیچھے دو بسیں آکر رکیں، پچھلی بس کی پیشانی پر انگریزی ہندسوں میں ۱۱۵ اور ہندی میں گریٹر کیلاش کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔
بس اسٹاپ پر خود کو اکیلا محسوس کر کے اس نے جلدی سے قدم بڑھائے۔ بائیں ہاتھ سے ہینڈل تھام کر فٹ بورڈ پر قدم جمائے ہی تھے کہ کنڈکٹر کی سیٹی اور بس کا انجن دونوں ایک ساتھ جاگ اٹھے۔ بس جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ اس نے ریزگاری کی تلاش میں جیب میں ہاتھ دوڑایا۔ انگلیاں کسی چیز سے ٹکرائیں۔ اسے خیال آگیا جیب میں ثریا کی گھڑی تھی۔ جو

اُس نے دو دن قبل اُسے ٹھیک کرانے کو دی تھی۔ لیکن وہ اپنے دفتر کی سیڑھیاں اتر کر، سڑک پار کر کے اپنے ننھا سا گھڑی ساز کے پاس نہ جا سکا تھا۔ اب کل جمعرات ہے۔ اُدھر کا بازار بند رہے گا۔ اس کا مطلب یہ کہ گھڑی پرسوں سے پہلے ٹھیک ہونے کے لیے نہیں جا سکتی۔ ہونہہ ...... اُس نے جیسے گھڑی کے خیال کو نہیں بلکہ گھڑی کو ہی جیب میں جھٹک دیا۔ دس دس کے تین سکے تلاش کر کے نکالے کنڈکٹر کی طرف بڑھا دیے۔ کنڈکٹر نے استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا اس کے اوپر پھر جھلاہٹ سوار ہونے لگی۔ تیس پیسے میں یہ بس اپنی آخری منزل تک جائے گی، اور اس سے کم کا ٹکٹ نہیں ملتا۔ پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، کہیں کا بھی ٹکٹ دیا جا سکتا ہے۔ وہ احتجاجاً خاموش رہا۔ کنڈکٹر نے بے خیالی میں یا اس کے سکوت سے نالاں ہو کر ٹکٹ دو جگہ سے پھاڑا۔ اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

اوپر کا راڈ تھامے ہوئے بس کے جھٹکوں کو شمار کرتا وہ آگے بڑھ آیا بس تقریباً خالی تھی۔ سردی نے سب کو گھروں میں قید کر دیا تھا۔ لیکن اسے تو دو دفتروں میں کام کرنے کے بعد اسی وقت لوٹنا ہوتا تھا۔ ساڑھے نو بجے مغربی نظام الدین میں اپنے دفتر سے چل کر پندرہ منٹ میں بس اسٹاپ تک آتا تھا، اور آخری بس پکڑ کر مول چند پہنچتا تھا اور پھر پندرہ منٹ پیدل چل کر ایک کمرے کے اس گھر کی سیڑھیاں چڑھتا تھا۔ جسے اس کی مالکہ مکان فلیٹ کہتی تھی۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ وہ رات کو صرف اس لیے گھر آتا ہے کہ صبح پھر آفس جانا ہے۔ بس ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ رک گئی وہ اپنے جسم کا توازن کھو بیٹھا اور ایک سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ کنڈکٹر نے آواز لگائی ——— "آشرم" ——— نہ کوئی سواری اُتری نہ چڑھی۔ بس غرّا کے آگے بڑھ گئی۔ رِنگ روڈ برج کے نیچے سے گزر کر بس چوراہے پر زاویۂ قائمہ پر گھومی اور اُدھر برج پر چڑھنے لگی۔ ایک شخص اُٹھ کر آگے دروازہ پر پہنچ گیا۔ نہرو نگر کے بس اسٹاپ پر بس اس طرح رکی جیسے چلتے چلتے ٹھوکر لگی ہو۔ وہ شخص اُتر گیا۔ ڈرائیور نے پیروں کا دباؤ بڑھایا، غراہٹ پھر گونجی، لیکن ڈرائیور نے انجن بند کر دیا اور بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر اعلان کیا کہ "کلچ کا تار ٹوٹ گیا ہے"۔ مسافر بڑبڑانے لگے: "ٹھسکو دینا ضرورت تھی"۔ دروازہ کھولنے سے کنڈکٹر کی شریر آواز ابھری۔ اس نے بے بسی سے گھڑی کا سہارا لیا۔

سوا دس بجے تھے اب کیا ہو گا۔ نہ جانے یہاں کتنی دیر لگے۔ اب تو کوئی اور بس بھی نہیں آئیگی اسے تو ابھی مول چند کے چوراہے سے ناشتے کے لیے انڈے خریدنے تھے۔ اس کے بعد گپتا مارکیٹ سے گزرتے ہوئے دودھ کی بوتل لینی تھی۔ انڈے والا دوکان بڑھا ہی رہا ہو گا اور نانی والی دوکان ٹھیک ساڑھے دس بجے بند ہو جاتی ہے۔ روزانہ آخری گاہک وہی ہوتا ہے۔ اب اگر جس کو یہاں دس منٹ بھی لگ گئے تو اس کا سارا پروگرام درہم برہم ہو جائے گا۔ جب وہ بس اسٹاپ پر اترے گا تو انڈے والا جا چکا ہو گا۔ دودھ اور نانی کی دوکانیں بند ہو چکی ہوں گی۔ مکان کی مالک بھی پونے گیارہ بجے کی سیٹی کے ساتھ ہی باہر کے گیٹ میں تالا ڈال دیتی ہے پھر گھنٹوں چیخنا پڑتا ہے تب جا کر بڑبڑاتی ہوئی آتی ہے۔ سابقہ کرایہ داروں کے شریفانہ اطوار یاد کر کے اور اس کی بے قاعدگی پر شرمندہ کر کے گیٹ کھولتی ہے۔ انڈے نہیں ملیں گے تو ثریا علی الصبح اٹھ کر سبزی بنائے گی۔ ننھی رجنا کو صبح ہی صبح سرہانے ٹافیاں رکھی نہیں ملیں گی تو اس کا منہ پھول جائے گا اور وہ اپنے توتلے منہ سے کہے گی "کہ ہم ابا سے نہیں بولتے" دن اور رات میں صبح کا یہی نصف گھنٹہ تو ہوتا ہے جسے وہ اپنی پیاری بیٹی کے ساتھ گزارتا ہے۔ اس میں بھی وہ روٹھی رہے۔ پھر صبح چھ بجے اٹھ کر دہلی ملک اسکیم کے ڈپو کی لائن میں لگنا پڑے گا ورنہ دودھ کہاں سے آئے گا۔ دودھ آنے میں دیر ہوگی تو ناشتہ دیر سے گا۔ جلدی کی وجہ سے شیو کا پروگرام ملتوی کرنا پڑے گا۔ پھر بھی گھر سے نکلتے نکلتے اسے دیر ہو جائے گی۔ اور جب تک وہ رنگ روڈ کے بس اسٹاپ پر آئے گا تو بس کی قطار طویل ہو چکی ہوگی ان سب باتوں کا بالآخر نتیجہ یہ ہو گا کہ اسے دفتر پہنچنے میں دیر ہو جائیگی۔ اور دفتر جا کر باس کی تیز نظروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ باس جو اپنے برے دنوں کی سب عادتیں بھلا بیٹھا ہے مگر وقت پر آفس آنے کی عادت نہیں بدل سکا۔ کھٹ کھٹ کی آواز نے اس کی سوچ کو تار تار کر دیا۔ ڈرائیور نے بونٹ اٹھا دیا تھا اور شاید تار لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگلے ہی منٹ گاڑی کا انجن بیدار ہو گیا۔ اس نے پھر گھڑی دیکھی دس بجکر اکیس منٹ ہوئے تھے گویا صرف چھ منٹ گزرے تھے لیکن یہ چھ منٹ کتنے طولانی تھے۔ یہ چھ منٹ اس کے پورے پروگرام کا شیرازہ منتشر کرنے کی بھرپور قوت رکھتے تھے۔

ڈرائیور نے بس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں۔ بس بھاگی جا رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ بسیں دہلی کی زندگی کی کتنی سچی علامت ہیں تیز رفتار ادھر اُدھر دیکھے بغیر سب کو پیچھے چھوڑنے کی کوشش میں دوڑتی بھاگتی۔ سارے بس اسٹاپ ایک شان بے نیازانہ کے ساتھ نظر انداز کرتے ہوئے ڈرائیور نے مول چند اسپتال کے سامنے بریک دبائے۔

وہ لپک کر اُترا۔ لیمپ پوسٹ کے نیچے آ کر گھڑی دیکھی، دس بجکر اکتیس منٹ ہوئے تھے یعنی وہ صرف ایک منٹ لیٹ ہوا تھا۔ ضائع ہو جانے والے چھ منٹ میں سے پانچ منٹ ڈرائیور نے اپنی تیز رفتاری کے ذریعہ بھاگتے ہوئے وقت سے واپس وصول کر لیے تھے۔ لیکن ان چھ لمحوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے خوف سے اس پر کتنے عالم گزر گئے تھے ....

اس نے تیز تیز قدم بڑھا دیے۔ ابھی ایک منٹ کا حساب برابر کرنا تھا۔

پیغام آفاقی (آئی۔بی۔ایس)
۴۳۔ اے نیو ہاسٹل ایم۔ایم ہال

بلندی

نرم دھوپ پہاڑ پر چمکی اور ریگستان پر کھڑے درختوں پر پھیل گئی۔
ریت کے ذرّے یہاں سے وہاں تک پانی کی طرح دمک اٹھے۔
ہوائیں موجوں میں بدل گئیں۔
یہ رات بھی کٹ گئی، رات کے تھکے ہارے مسافر جو شراب کی بوتلیں توڑ کر ناچ ناچ کر تھکے اور پھر سو گئے تھے بیدار ہو گئے، سرائے میں ادھر ادھر گھوڑے بندھے تھے ان کے کھٹ جگمگا اٹھے جیسے کارواں ٹھہرا نہیں ہو مسلسل چل رہا ہو۔
مسافر کم سے کم اتنے تھے کہ ان کے چہروں کی کھال اور ان پر پھیلے ہوئے نقوش بری طرح ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔
چوڑی سڑک کی چمکتی ہوئی دھول کہہ رہی تھی کہ اس سڑک پر کتنے کارواں جا چکے ہیں، یہ کارواں پھر بھی کہاں سے چلا تھا، کب چلا تھا کسی کو یاد نہیں تھا، ہر ایک کو صرف اتنا یاد تھا کہ وہ کارواں میں شامل ہوا تھا اس لیے کہ اسے بھی وہیں جانا تھا جہاں اور لوگ جا رہے تھے، اسے بھی اسی کی تلاش تھی جس کی تلاش اور لوگوں کو تھی۔
کتنے دن اس سفر میں گزر چکے تھے، جب وہ چلے تھے تو ان کی عمر کم تھی، اب وہ دھیرے دھیرے کتنی بڑھ گئی تھی، جب وہ چلے تھے تو ان کے ہاتھ پاؤں، ناک کان، چہرہ داڑھی سب کچھ اور تھے، لیکن اب ان پر جھریاں پڑ گئی تھیں، بال سفید ہو رہے تھے۔
انھوں نے ایک عجیب و غریب سفر کیا تھا، درختوں کے پھل توڑ توڑ کر کھاتے رہے،

جانوروں کا شکار کرتے رہے، دور دور جنگلوں میں چلے جاتے، ایک ساتھ جنگلی درندوں کا مقابلہ کرتے، پھر لوٹ کر آتے تو راستے میں گاتے بجاتے، ہنستے قہقہہ لگاتے، ڈوبتے سورج کی سرخ کرنیں ان کے چہروں کا بوسہ لیتیں، اور نرم ریت پر ان کے چھوٹے چھوٹے پاؤں چمکتے ہوئے معدوم نقوش چھوڑ جاتے تھے۔

ہر مرحلے پر وہ رکتے کیمپ ڈالتے، رات بھر گاتے بجاتے، ان کی بیویاں ان کے ساتھ سوتیں، بچے روتے، گھوڑے آنکھیں جھکائے آرام کرتے۔ رات دھیرے دھیرے گزرتی رہتی، تاریکی کے پاؤں بھاگتے رہتے...... اور پھر نئے دن کے ساتھ نیا سفر شروع ہو جاتا۔

ایک دن کسی نے پوچھا "ہم کہاں جا رہے ہیں، ابھی کہاں ہیں؟ منزل کہاں ہے؟ کتنی دور ہے...." لیکن کسی نے اس کے سوال کی طرف توجہ نہیں دی، "رہنما پر یقین کرو اور آرام سے پرلطف سفر کا مزا لیتے چلو جو منزل ملنے کی خوشی سے بھی زیادہ قیمتی ہے، میری تو یہ خواہش ہے کہ یہ سفر کبھی ختم ہی نہ ہو" ایک نے جواب دیا تھا۔

کتنی بار تاریک سرد راتوں میں الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے بوڑھوں میں، اور چمکتی چاندنی کے سائے میں محبت کرنے والوں کے درمیان یہ سوالات اٹھے لیکن سفر قائم رہا.... اور جواب ملتا رہا...... ہمارا سفر منزل سے کچھ کم نہیں ——!!

لیکن آخر کار ایک دن ایک بڑے پیڑ کے سائے میں جمع ہو کر سب نے پوچھا ہماری منزل کہاں ہے؟؟ اور درخت کی ایک موٹی سیاہ جڑ پر بیٹھے ہوئے بوڑھے رہنما نے آخر گمبھیر خاموشی کو توڑتے ہوئے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی

"منزل اُدھر ہے جدھر ہم جا رہے ہیں"

"اور ہم کو معلوم ہے کہ ہم کدھر جا رہے ہیں"

"یعنی ہم کس چیز کی تلاش میں جا رہے ہیں"

"اور اگر منزل کہیں اور ہے تو کوئی کہ وہ کدھر ہے"

اور پھر ایک بابرکت خوشی کی طویل سفید داڑھی کے سائے میں سب مطمئن ہو گئے، سب اپنے سوالات کو بھول گئے اور کارواں پھر کوچ کر گیا........

. . .

ایک طویل مدت گزر گئی اور کارواں چلتا رہا۔

بوڑھا رہنما روزانہ کتابیں کھول کر لوگوں کو منزل کی نشانیاں بتاتا رہا، اور یکے بعد دیگرے وہ تمام نشانیاں آتی گئیں؛ اب صرف چند نشانیاں باقی رہ گئی تھیں،

کیا اب ہمارا یہ خوبصورت سفر ختم ہو جائے گا؟؟

کیا اب ہم ایسی زندگی کی طرف دوبارہ کبھی نہیں لوٹ سکیں گے؟؟ پتھریلی چٹانوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے ایسی گفتگو کی، آسمان پر بادل جھومتے چلے جا رہے تھے، اور چاندنی رات جادو جگا رہی تھی، رات میں انجانی چڑیوں کی عجیب آواز بہت دور سے آ رہی تھی، اور آسمان دور دور تک خاموشی سے پھیلا ہوا تھا۔

اچانک ان میں سے کسی کو ڈر لگا "ہم کہاں آ گئے ہیں؟ دیکھو سناٹا بڑھنے لگا ہے، یہ حسین مناظر بہت پُر آسیب ہیں،..... یہاں قبرستانوں جیسا حسن اور سناٹا ہے، یہاں کوئی نہیں، کچھ بھی نہیں..... !!!"

"کیا منزل بہت قریب آ چکی ہے"——!!! کسی نے بوڑھے رہنما سے پوچھا

منزل بے حد قریب آ چکی، منزل کی نشانیاں اب ختم ہو رہی ہیں، ہمارا سفر اب ختم ہو رہا ہے، اور ہمارے خچروں کی پیٹھ پر لدا ہوا راشن بھی اب ختم ہو رہا ہے، ہمارے پاؤں کے ریشے بھی اب بہت تھک چکے ہیں،—— منزل بہت قریب ہے، سناٹا پھیل رہا ہے،..... فضائیں نیا روپ لے رہی ہیں، ہوائیں تغیر ہو رہی ہیں، ہر چیز بدلتی جا رہی ہے، آوازوں کو سنو!! کیسی ہوتی جا رہی ہیں، کتنی دور سے آ رہی ہیں، کیسی اجنبی ہیں یہ—— ہماری کتاب میں یہی لکھا ہے—— منزل قریب آ رہی ہے.......!!!

طویل ریگستان پر وہ چلتے رہے، چلتے رہے،

اور پھر صبح ہوئی،..... آخری صبح..... آخری دن..... اور چمکتی ریت اور دور دور کھڑے درختوں کے پار سے ایک پہاڑی نما بلندی ابھری..... اور پیچھے — اس طویل راستے میں دھند کے درمیان کتنے ہی کارواں لڑکھڑاتے چلے آ رہے تھے، دور

دور دور کی گھاٹیاں ان کے قدموں کے درد سے کراہ اٹھی تھیں۔
"ہماری منزل کیسی ہے؟" کسی نے سوال کیا۔
"اب تم خود دیکھ لوگے، منزل بہت قریب ہے" بوڑھا پجاری مسرت سے مسکرایا،
اور لوگ ہانپتے ہوئے اس بلندی پر چڑھ گئے،
پھر آگے چلنے والوں کے قدم یکایک رکنے لگے۔ جو اوپر چڑھے وہ دیکھتے رہ گئے، جو پیچھے سے چل رہے تھے وہ چڑھتے گئے ..... پیچھے ہزاروں میل دور تک، گھاٹیوں میں کتنے ہی کارواں کیڑوں کوڑوں کی طرح بڑھے آ رہے تھے، اور ان کے قدموں کے درد سے وادیاں کراہ رہی تھیں۔
اور اب ـــــ بلندی پر تھکے ہوئے لوگ مرد، عورتیں، خالی پیٹ نچر کھڑے تھے،
..... اور ان کے قدموں پر منوں دھول پڑ چکی تھی۔
اور ان کے ٹخنے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین میں دھنسے جا رہے تھے !!!
آگے ـــــ حدِ نگاہ سے آگے تک ـــــ آسمان کا کنارہ تھا، جہاں آخری چاند غروب ہو رہا تھا، اور ایک سمندر ـــــ بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا جس سے عجیب آوازیں آ رہی تھیں، ایسے جیسے سمندر قہقہے لگا رہا ہو، .....
لوگوں نے پھر بھی گھوم کر رہنما کی طرف دیکھا ـــــ
رہنما کا چہرہ کوئلے کی طرح سیاہ ہو گیا تھا !!!

فرحت احساس

قرض کی واپسی

روز کی طرح اس کی آنکھ کھلی تو ابھی چاروں طرف ہلکا ہلکا سفید ہوتا ہوا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پیروں کا درد کچھ کم تھا یا رات میں دیکھے ہوئے خواب کی سنسناہٹ میں دب گیا تھا۔ کچھ بھی ہو رات سوتے میں کچھ ایسا ہوا تھا، جس کی وجہ سے اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا ــــــ اُٹھنے کا من نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے چھو کر دیکھا اس کی تیس سال پرانی چارپائی بالکل ٹھیک، اپنی صحیح جگہ پر تھی۔ اتنی ہی ٹوٹی ہوئی۔ لیکن اسے لگ رہا تھا کہیں کچھ بدل گیا ہے، کہاں اور کیوں؟ اسے پتا نہیں تھا۔

اس کے چاروں لڑکے آس پاس سو رہے تھے سوچا انھیں جگائے، بھٹی جلانے کا وقت ہو گیا تھا، لیکن نہ جانے کیوں اس کی ہمت نہیں ہوئی ــــــ ان کی چارپائیاں نئی تھیں اسی لیے شاید وہ اتنا بے خبر، بغیر جاگے ہوئے سو رہے تھے۔ اس نے اپنے سامنے دیکھا ــــــ دور دور تک عمارتوں کا ایک لمبا سلسلہ۔ بڑی چھوٹی۔ لیکن ایک جیسی سر اٹھائے ہوئے۔ رعب ڈالنے والی۔ وہ ہمیشہ سے ان عمارتوں سے سہارتا تھا اس لیے کہ وہ ان کی طرف جتنا دیکھتا ــــ وہ اتنا ہی آگے بڑھتی جاتیں۔ اسی لیے اب وہ ادھر بہت کم دیکھتا تھا کیونکہ ان کو دیکھتے ہی اس کی نگاہوں کو آگے اور پیچھے اتنا دوڑنا پڑتا تھا کہ اس کے پیر بری طرح دکھنے لگتے تھے۔ ان آئے دن بڑھتی ہوئی عمارتوں کے پیچھے دوڑتے رہنے کی تھکن اور اس کے پیروں کے درد سے ایک ٹھوس رشتہ قائم ہو چکا تھا۔

آج وہ بڑی دیر تک گم سم۔ سحر زدہ، ادھر دیکھتا رہا اس کی نگاہوں کو لوٹنے میں تیس سال بیت گئے، بڑی عجیب بات تھی۔ تیس سال پہلے بھی وہ اسی کینٹین میں، اسی چارپائی پر

اسی طرح لیٹا تھا۔ اکیلا ـــــ اور آج ہی کی طرح اس کا من اٹھنے کا نہیں ہو رہا تھا لیکن تب اس کی وجہ آج سے الگ تھی، کیونکہ اس وقت اس کے پیروں میں درد اور سامنے پھیلی ہوئی عمارتوں کا سلسلہ نہیں تھا ـــــ اس کی آنکھوں کی دوڑ شروع نہیں ہوئی تھی۔

اب اس کے پیروں کا درد بڑھنے لگا ـــــ اس نے پھر چاہا کہ اپنے لڑکوں کو جگائے اور کینٹین کا کام شروع کرے لیکن پھر اس کی ہمت جواب دے گئی "ابھی انھیں سونے دو، کل ان کے پیروں میں بھی درد ہو جائے گا۔" اس کے اندر سے کسی نے کہا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ ڈر سا گیا تھا۔

تیس سال پہلے یہاں ایک چھوٹی سی بستی تھی، چند گنے چنے گھر، کچھ دوکانیں، ڈاک گھر اور ریلوے اسٹیشن۔ اس کی دوکان پھر بھی سب سے کنارے پر تھی وہ دن بھر دوڑ دوڑ کر دوکان، ڈاک خانے اور اسٹیشن پر چائے پہنچایا کرتا تھا ـــــ سارے لوگ پہچانے ہوئے تھے، ادھار بھی چلتا تھا، کچھ ملتا تھا، کچھ نہیں، لیکن سب ملا کر ایک پورا پن تھا ـــــ پھر دھیرے دھیرے نہ جانے کیسے بستی کے چاروں طرف سے دھواں سا اٹھنے لگا۔ اسٹیشن چوڑا ہونے لگا، انجنوں کی گھڑگھڑاہٹ بڑھ گئی اور لائن کے متوازی، اس کی دوکان کو چھوتی ہوئی ایک سڑک ابھرنے لگی اور پھر اسی سڑک کے دونوں کناروں پر۔ انجنوں کی سی تیز رفتاری کے ساتھ بڑی بڑی عمارتیں بننی شروع ہو گئیں۔ اسے ہلکا ہلکا یاد تھا چند ہی سالوں میں بستی اس کو تنہا پیچھے بہت پیچھے چھوڑتی چلی گئی۔ ساری پہچانیں مٹاتی، نوچتی ہوئی، ایک بڑا شہر بن گیا۔

اور تبھی کسی وقت اس کے پیروں میں درد شروع ہوا تھا۔ بہت دوڑنے اور پھر دوڑنا بند ہو جانے کی وجہ سے ان پھیلتی ہوئی عمارتوں کو پکڑنے کے لیے۔ ان میں کھوئی اپنی بستی اور خود اپنی پہچان تلاشنے کے لیے اسے اندر ہی اندر بہت ہی دوڑنا پڑا تھا اور پھر تھک کر کھڑا ہو گیا تھا وہ ـــــ اور اب تک کھڑا تھا ـــــ اس سب کے ساتھ ہی اس کی بکری بہت کم ہو گئی تھی۔ صرف اس سڑک سے گذرنے والی بسوں اور ٹرکوں سے اسی کی طرح دوڑتے رہنے والے لوگ اس کی چائے پی لیتے تھے۔ پھر بھی اس نے اپنی کینٹین بند

نہیں کی تھی — اس وجہ سے کہ ان عمارتوں سے اب اسے ایک طرح کی رقابت کا احساس ہونے لگا تھا۔ — اور اسے ہار منظور نہیں تھی۔ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ دوڑ نہیں سکے گا اسی لیے اس نے اپنی جگہ مضبوطی سے اپنی زمین کو پکڑے ہوئے کھڑے رہنا قبول کر لیا تھا۔ چاہے پیروں میں کتنا ہی درد ہو جس شہر میں اس کے کھوئے ہوئے قرض دار رہتے تھے۔ اس سے اب اس کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔

بڑی دیر کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ بڑی دیر سے سامنے ہی دیکھے جا رہا ہے — اب صبح پھوٹنے لگی تھی۔ آج سے پہلے بھٹی سلگانے میں اس کے یہاں اتنی دیر کبھی نہیں ہوئی تھی — اس کے لڑکے ابھی تک سوئے تھے، لیکن انھیں جگانے کی ہمت اس میں جیسے ختم ہو چکی تھی، یہ تو ان کا پیچھا کر سکتے تھے۔ انھیں میں نے کیوں ٹھہرا لیا؟ اب اسے کڑھن سی ہونے لگی تھی اور اسے لگ رہا تھا سامنے والی عمارتوں نے اس کے قرض داروں کو ہی نہیں اس کے بیٹوں کو بھی کھا لیا ہے — اس کے پیروں کا درد بڑھنے لگا تھا اور ساتھ ہی اس کا غصّہ بھی، اس شہر نے میرے پیسے تو کھائے ہی — میرے بیٹوں کے دوڑنے کی طاقت بھی چھین لی" اسے اپنے آپ پر غصّہ آ رہا تھا کہ آج تک اس نے اس بہت بڑی سازش کو کیوں نہیں سمجھا۔

اب کافی اجالا ہو چکا تھا، پانچ بجے کی بس آنے والی ہو گی سوچ کر اٹھا۔ بھٹی جلائی۔ آج بھٹی میں جلنے والی آگ اسے بہت سُرخ دکھائی دے رہی تھی اس کے بیٹے ابھی سوئے تھے۔ نہ جانے کتنی نیند انھیں آئی تھی — اس نے محسوس کیا جیسے اس کے بیٹے اِن عمارتوں کے پیروں میں لپٹے ہوئے ہیں اور وہ ان کو کچلنے کے لیے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اس احساس سے وہ پاگل سا ہو گیا یہ شہر اسی بستی سے بنا ہے نا! جس نے میری ادھار کی کھائی ہے وہ دوڑتا ہوا اپنے لڑکوں کے پاس گیا اور چیخ چیخ کر انھیں جگانے لگا اٹھو! جلدی بھاگو یہاں سے وہ لوگ کچلنے آ رہے ہیں — جاؤ بھاگو بدان میں گھس کر اپنے ایک ایک قرض دار کا گلا گھونٹ دو۔ جاؤ جلدی کرو! یہ سیدھی سڑک تمھیں بہت دور تک لے جائے گی اور چیختے چیختے اسے لگا اس کے پیروں کا درد ایک دم غائب ہو گیا ہے اور بھٹی میں سرخ سرخ لپٹیں اچھل رہی ہیں — اس نے دیکھا دور سے صبح والی بس بھاگی چلی آ رہی تھی۔

زبیدہ رحمٰن عباسی

"ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا"

"میرا خیال ہے میں صحیح آدمی تک پہونچی ہوں" ـــــ سفید نسل شارلٹ نے کہا۔
"میں کچھ نہیں سمجھا" ـــــ سیاہ فام وکٹر جوائس نے تحیّر میں جواب دیا۔
شارلٹ نے ایک تعارفی کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا ـــــ "یہ کارڈ آپ کبھی میرے والد کے پاس چھوڑ آئے تھے۔"

"میں وضاحت چاہوں گا بھولی لڑکی۔"

"آج سے سولہ سال پہلے ۲۰ نومبر کی وہ سرد شام کیا آپ بھول گئے ــ؟ میرے لیے تو وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے، سرکلر روڈ پر اُس بوڑھے شاہ بلوط کے پیچھے وہ کاٹج آپ کو ضرور یاد ہوگا جسے جلتا دیکھ کر آپ اپنی کار روک کر پڑوسیوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے شعلوں میں کود پڑے تھے۔ ڈیڈی باہر گئے تھے۔ میری ماں شعلوں کی لپیٹ میں آچکی تھی۔ وہ مجھے اپنی گود سے الگ کرنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہی تھی۔ اس کوشش میں آپ بھی کافی جل گئے تھے لیکن آپ نے مجھے بچا لیا۔ میری ماں نہ بچ سکی اور چند ہی دنوں میں اللہ کو پیاری ہو گئی، وہ آپ کی اس درجہ احسان مند تھی کہ آخری لمحات تک آپ کا ہی نام لیتی رہی۔ اس کی ٹیپ شدہ وصیت میرا مقدس ترکہ ہی نہیں بلکہ میرا مقصدِ حیات بھی ہے اور یہی مجھے آپ تک لائی ہے۔"

"مجھے صدمہ ہوا ـــــ تمھاری ماں نہ بچ سکی ــ ــ کاش میں کچھ اور پہلے پہونچا ہوتا! تو وہ ننھی بچی تمھیں ہو؟"

"جی ہاں وہ بدنصیب میں ہی ہوں ـــــ میں وہ ٹیپ لائی ہوں آپ سننا پسند کریں گے ـــــ ؟"

"ضرور سناؤ عزیز بچی"

مشین پر ٹیپ گھومنے لگا ـــــــــــ

"ننھی شارلٹ ہم لوگوں کی تنہا نشانی تھی جسے ظالم شعلے چھین رہے تھے لیکن سیاہ گہری آنکھوں والے ایک کالے شخص نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر اسے میری جلتی ہوئی گود سے کھینچ کر اپنے کشادہ سینے سے لگا لیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ شارلٹ بڑی ہو کر اس سیاہ فام سے ضرور ملتی رہے گی۔ اس سے میری روح کو سکون ملتا رہے گا۔ وہ دودھ جیسے سفید دل کا مالک ہے اور ہم سب کا محسن ہے ـــــ"

مرنے والی کی آواز فضاؤں میں گم ہو چکی تھی لیکن ٹیپ گھوم رہا تھا۔ یکایک شارلٹ اور وکٹر نے اپنے سروں کو اٹھایا۔ دونوں کی پلکیں بھیگی تھیں۔

"یہ رہا وہ مقدس ترکہ جسے میں اپنے کمزور کاندھوں پر لیے اپنے محسن کی تلاش میں گھوم رہی ہوں۔ شکر ہے آپ مل گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ جیسا خوبصورت دل مجھے اپنے ہم نسلوں میں نہیں ملا کیا میں آئندہ آپ سے مل سکتی ہوں ؟"

"کاش میں تمھارے اس سوال کا جواب اثبات میں دے سکتا !" اف یہ ظالم سماج ! اس وقت چند ضروری کام ہیں۔۔ اجازت چاہوں گا" وکٹر نے بات کا موضوع بدلنے کے لیے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ضرور ـــــ لیکن میں پھر آؤں گی"

.... اور کچھ دنوں بعد شارلٹ پھر آئی ....

"مجھے خوشی ہے تم پھر آئیں ـــــ شاید تم دوسروں سے مختلف ہو" وکٹر نے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا

"کاش آپ مجھے دوسروں میں نہ کرتے"

"مجھے معاف کرنا بھولی بچّی"

اس کے بعد شارلٹ اکثر و بیشتر وکٹر کے یہاں جاتی رہی، وکٹر بھی اس کے اصرار پر کبھی کبھی اس کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔

موسم خوشگوار تھا۔ شام ڈھلی ڈھلی سی اور فضا دامن پرور۔ آج شارلٹ بہت خوش اور خلاف معمول بے حد بشاش نظر آ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ آج اس نے وکٹر سے وہ سوال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جسے بار بار کوشش کے بعد بھی وہ زبان پر نہیں لا سکی تھی۔

"آپ برا نہ مانیں تو ایک سوال کروں"؟

"بصد خوشی"

"آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"مہلت نہیں ملی۔"

"ساتھی کا انتخاب تو کر ہی لیا ہوگا"؟

"ایسا بھی نہیں"

"میرے دل کی تمام وسعتوں میں صرف آپ ہی ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں نے آپ کا انتخاب کر لیا ہے تو کیا آپ مجھے اپنی رفاقت دے سکیں گے ____؟"

"میرا انتخاب ____؟ تم ____ اپنے لیے ____؟ کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"میں ہوش میں ہوں مسٹر وکٹر ____!"

"نہیں ____ یہ نہیں ہو سکتا ____ میرے اور تمھارے درمیان دو بڑے فرق رنگ اور عمر کے ہیں ____ میں سیاہ فام اور پچاس سالہ خزاں رسیدہ ____ تم ایک شگفتہ معصوم کلی ____ یہ ناممکن ہے۔"

"لیکن میں فیصلہ کر چکی ہوں۔"

"میری درد مندانہ اپیل ہے کہ اپنا فیصلہ بدل دو اور ہم دونوں کے درمیان فرق کو محسوس کرو۔ کیا تمھارے ڈیڈی کی تمنا نہ ہوگی کہ تمھارا شوہر بھی تم جیسا ہی ہو ____؟"

"آپ کی باتیں بہت مایوس کن ہیں لیکن آپ کے لیے میرے دل میں جو جذبات ہیں وہ میں

کیونکر دکھاؤں ؟"

"تمھارے انھیں جذبات کا ہی واسطہ تم اپنی رائے بدل دو !"

"یہ ممکن نہیں ـــــ میرے ساتھ بڑی مجبوری یہ ہے کہ بچپن سے میں صرف آپ کے بارے میں سوچتی رہی ہوں ـــــ ہم کسی دوسرے ملک میں جاکر شادی کر سکتے ہیں۔ شادی نہ بھی سہی تو ایک کرم فرما دوست کی حیثیت سے کیا مجھے آپ کی بانہوں کا سہارا نہیں مل سکتا ؟ میں صرف آپ کی رفاقت چاہتی ہوں۔ نسلی امتیاز کے سلسلے میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ انسان سفید فام و سیہ فام ہو سکتا ہے لیکن انسانیت یک رنگ ہے۔ میں بنیادی طور پر COLOUR BLIND ہوں۔"

"میں بزدل ہوں کہ سماج کی ڈر سے تمھاری طرح نہیں سوچ سکتا۔ مگر جان لو کہ تم جس گہری کھائی کو اپنی یا ہم دونوں کی لاشوں سے پاٹنا چاہتی ہو اس کے لیے لاکھوں شارلٹس اور وکرمس کی ضرورت ہوگی۔"

"خیر میں جارہی ہوں لیکن کیا آپ میرے گھر آتے رہیں گے ـــــ ؟"

"ضرور پیاری بچی"

ـــــــ کچھ دنوں بعد شارلٹ ایک مشہور ماہر جلد کی کلینک میں دیکھی گئی۔

ڈاکٹر مبہوت تھا۔ اب تک اس کی کلینک میں کوئی ایسی لڑکی نہیں آئی تھی جس نے اپنی گوری جلد کالی کروانا چاہا ہو۔ یہ پہلا کیس تھا۔ ڈاکٹر نے شارلٹ کو اس کی ضد سے باز رکھنا چاہا لیکن مجبور ہو کر اسے یہ کیس لینا ہی پڑا۔۔۔۔۔

"رفتہ رفتہ سفید جلد سیاہ ہونے لگی ـــــ اس درمیان شارلٹ تمام تر اذیتوں سے گذرتی رہی۔

ادھر وکرم بھی الجھنوں کا شکار رہا ـــــ اسے بار بار خیال آتا۔

"شارلٹ خفا ہو گئی ـــــ جبھی تو وہ عرصے سے نہیں آئی۔ اتنی اچھی لڑکی اور اتنی عجیب خواہش" ـــــ وہ کئی بار اس کے گھر بھی گیا لیکن وہ نہ مل سکی۔۔۔۔۔

ـــــ دن گذرتے گئے۔۔۔۔۔۔

عرصہ بعد شارلٹ تمناؤں کی ایک دنیا لیے وکٹر کے گھر آئی ــــ لیکن ــــ پھاٹک پر ہی اس کے قدم رک گئے ــــ ایک کالی عورت وکٹر کے ساتھ لان پر ٹہل رہی تھی ــــ شارلٹ رکی لیکن کچھ سوچ کر پھر آگے بڑھ گئی ــــ

"شاید میں مخل ہوئی ننھے معاف کیجیے گا مسٹر جوائس"

"اچھا ! آپ مجھے جانتی ہیں ؟"

"جی ہاں آپ مسٹر وکٹر جوائس ہیں اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"آپ نے صحیح سمجھا یہ مسز جوائس ہیں لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ آپ ؟"

"اچھا ہوا مسٹر وکٹر ! آپ نے مجھے نہیں پہچانا میں خوش ہوں میرا یہ روپ ہی مجھے زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے" اتنا کہکر شارلٹ انھیں سنسان راہوں پر واپس چل پڑی۔

وکٹر چونکا جیسے کوئی اندھیروں سے روشنی میں آگیا ہو ۔ اس نے شارلٹ کے پیچھے بڑھنا چاہا لیکن جذبات کی گراں باری نے ساتھ نہ دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ زیرلب بڑبڑاتا رہ گیا ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ "ایسا نہیں ہو سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب کیا ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ معصوم بچی ــــ !"

شارلٹ نے اپنے باپ کا گھر، شہر اور سماج سبھی چھوڑ دیا اور ایک انجانے شہر میں کے دفتر میں بحیثیت کام کرنے لگی۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی زندگی مسلسل طوفانوں کے تھپیڑے کھا رہی تھی لیکن اس نے جینا سیکھ لیا تھا ۔ اس نے جسمانی طور پر وکٹر کو ضرور کھو دیا تھا لیکن روحانی طور پر اسے اور قریب کھینچ لائی تھی۔ اور یہی اس کی طویل تنہائیوں کا سہارا تھا ۔ ویسے کبھی کبھی دل بہلانے کے لیے کالی آنکھوں والی وہ گڑیا بھی تھی جسے وکٹر نے کبھی "ننھی" شارلٹ کو دی تھی ــــ

دن مہینوں اور مہینے برسوں میں ڈھلتے رہے دیکھتے دیکھتے شارلٹ بڑھاپے کی سرحدوں میں داخل ہونے لگی ۔ شاید اسے یاد بھی نہ ہو کہ اس کی زندگی کبھی شباب کی راہوں سے بھی گذری تھی ــــ مگر وہ اپنے "آج" اور ٹھہراؤ کی زندگی سے مطمئن تھی ــــ اسے کسی کل ــــ کی تمنا نہ تھی ــــ ــــ ــــ ــــ ــــ ــــ لیکن ایک دن

جب وہ   پر کھڑی کوئی کاغذ دیکھ رہی تھی کہ ایک سیاہ فام نوجوان
اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"اگر میں غلط نہیں ہوں تو آپ مادام شارلٹ ہیں"

"تم صحیح ہو"

"آپ کی تلاش میں مجھے بہت دشواری ہوئی حالانکہ آپ کی پرانی تصویر میں اور آپ میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے"

"میری تصویر ____؟ کہاں ملی ____؟ مگر تم ہو کون ؟"

"آپ کی یہ تصویر میرے والد نے آپ کے ڈیڈی سے لی تھی"

"پہیلیاں نہ بجھاؤ اجنبی نوجوان"

"میں یہاں کچھ نہ کہہ سکوں گا۔ کیا آپ میرے ساتھ کچھ دور چلنا پسند کریں گی؟"

"ضرور چلوں گی"

کچھ دور جا کر ایک چرچ کے پاس نوجوان رک گیا اور شارلٹ سے مخاطب ہوا۔

"میں وکٹر جوائس کا بیٹا ایڈورڈ جوائس ہوں۔ عمر کی کئی منزلیں طے کر چکا ہوں اپنے والد کی زبانی کسی شارلٹ کا تذکرہ ہمیشہ سنتا رہا۔ گو اب ڈیڈی اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کی آواز اب بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے"

"میرے بیٹے تم سفید نسل سیاہ فام شارلٹ سے ضرور ملنا۔ ہوسکتا ہے اسے کسی نے نہ اپنایا ہو تو بڑھ کر تم خود کو اس کے قدموں میں ڈال دینا۔ وہ انسانیت کی مقدس دیوی ہے۔ ممکن ہے تمھاری یہ پرستش مجھے میرے بارے کچھ سبکدوش کر دے۔ میں اس کے خلوص و قربانی کا مقروض ہوں"

____ شارلٹ کسی اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی .... کافی دیر بعد وہ سطح پر ابھری ____

"ایڈورڈ ____! میں تم کو ننھا ایڈورڈ تو نہ کہوں گی لیکن یہ ضرور بتاؤں گی کہ میری عمر پچاس سال ہے"

"مجھے آپ کی عمر جاننے کی ضرورت نہیں ہے ـــــ میرے سامنے اس وقت صرف اپنے والد کی خواہش کا احترام اور آپ کی عظمتوں کا اعتراف ہے ـــــ سامنے قدیم مقدس چرچ ہمارا محافظ ہے خدارا دیر نہ کیجیے! میرے والد کی روح کو سکون بخش دیجیے!"

"عظیم باپ کے فرمانبردار بیٹے ـــ! تم خوش نصیب ٹھہرے۔ اپنی ماں کے لیے ایسی ہی آرزو میں مجھ بدنصیب کی، تو نصف صدی بیت گئی۔"

اتنا کہہ کر ایک پروقار سکوت کے ساتھ شارلٹ نے اپنا ہاتھ ایڈورڈ کے ہاتھ میں دیدیا اور دونوں آہستہ آہستہ چرچ میں داخل ہو گئے۔

ـــــ شارلٹ کے چہرے پر مریم کی معصومیت جھلک رہی تھی اور بڑے محراب کے نیچے مریم کا مقدس بیٹا صلیب پر چڑھا انسانیت کی فلاح کے لیے مصروف دعا تھا۔

ستمبر ۱۹۶۰ء

سید محمد امین

آخری امیدوار

اب آخری امیدوار کا نمبر تھا۔ سیٹھ نصیر جھروکے میں آنکھ لگائے تھک چکے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ آخری امیدوار سادہ لباس میں ملبوس اپنے گرد و پیش سے بے پروا کمرہ میں داخل ہو رہا تھا۔

سیٹھ نصیر کا شمار شہر کے مالدار اور مشہور تاجروں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی خود بنائی تھی۔ سیٹھ ایک کامیاب تاجر تو تھے ہی ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ ادبی ذوق کے مالک بھی تھے۔ شہر کے بہت سے تعلیمی، ادبی اور ثقافتی ادارے ان کے مرہون احسان تھے، ادبی نشستوں سے ان کو خاص دلچسپی تھی، اپنی تجارتی مصروفیات سے ان کو جب کبھی چھٹی ملتی تو ادبی سرگرمیوں میں ضرور حصہ لیتے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کو نئے سکریٹری کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے مندرجہ ذیل اشتہار شائع کرایا ــــ "ضرورت ہے ــــ ایک پرائیویٹ سکریٹری کی، امیدوار کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے ادبی ذوق کا مالک ہونا ضروری ہے۔ خواہش مند حضرات انٹرویو کے لیے ۲۲ر اکتوبر ۶۶ء کو صبح ۱۱ بجے مندرجہ ذیل پتے پر تشریف لائیں ــــ نصیر الدین احمد ۲/۵۶ پالی ہل بمبئی۔

دراصل سیٹھ نصیر کی خواہش تھی کہ سکریٹری کے ساتھ ساتھ انھیں ایک اچھا ساتھی بھی مل جائے جو ان کے ساتھ ادبی محفلوں میں جا سکے اور جس سے وہ وقتاً فوقتاً ادبی گفتگو بھی کر سکیں۔

آج ۲۲ر اکتوبر تھی ــــ سیٹھ نصیر کا انٹرویو بھی نئے طرز کا تھا۔ انھوں نے اپنے پرائیوٹ کمرے کو انٹرویو کے لیے منتخب کیا تھا۔ کمرہ میں چاروں طرف خوبصورت الماریاں تھیں جن میں لاتعداد کتابیں سجی ہوئی تھیں جو علم و ادب کے مختلف موضوعات سے متعلق تھیں ــــ

چند رکوں میں ملکی اور غیر ملکی رسائل چنے ہوئے تھے کونے کی میز پر جنسی اور فلمی رسائل کا انبار لگا تھا۔ دوسرے گوشہ میں ایک میز پر خوبصورت ریک میں سیٹھ نصیر کے محبوب مصنف نجمی کی بیس کتابوں کا سیٹ تھا۔ یہ کتابیں ادب کا بہترین نمونہ تھیں۔ کمرہ کی دیواریں اعلیٰ قسم کی پینٹگز ( ) سے مزین تھیں ایک کونے میں قدآدم آئینہ نصب تھا۔ کمرہ نفیس قالین اور عمدہ فرنیچر سے آراستہ تھا ـــــ یہ سب سیٹھ صاحب کے اعلیٰ مذاق کے آئینہ دار تھے۔

سیٹھ صاحب نے یہ اہتمام کیا تھا کہ باہر انتظار کرتے ہوئے امیدواروں میں سے باری باری ایک امیدوار کو چپراسی سے کمرہ میں بلاتے تھے۔ چپراسی یہ کہکر سیٹھ صاحب ابھی تشریف لاتے ہیں ـــــ" دس منٹ تنہا بیٹھنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ برابر والے کمرہ میں سیٹھ نصیر خود موجود تھے اور ایک مخصوص جھروکے سے امیدواروں کی حرکات کا جائزہ لے رہے تھے۔ دس منٹ بعد امیدوار کو دوسرے دروازہ سے رخصت کر دیا جاتا تھا۔ بس یہی انٹرویو تھا۔

اب تک گیارہ امیدوار آچکے تھے جن میں اکثریت نوجوانوں کی تھی جو عمدہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ کمرہ میں داخل ہونے کے بعد ان کی حرکتیں بڑی عجیب ہوتی تھیں کوئی تو آتے ہی خوبصورت پینٹگز ( ) دیکھنے میں محو ہو جاتا کوئی مختلف ڈیکوریشن پیسز ـــــ ( ) میں الجھ جاتا۔ کئی نوجوانوں نے آئینے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا کوئی کتابوں کی طرف رجوع کرتا بھی تھا تو ایک نظر ڈالنے کے بعد اپنی پسند کی کتاب یا رسالہ نکال کر ایک طرف صوفہ پر دراز ہو جاتا۔ زیادہ تر امیدواروں کا رجحان فلمی رسالوں کی طرف تھا۔ سیٹھ نصیر یہ سب دیکھ دیکھ کر جھنجھلا رہے تھے اُن میں سے کوئی بھی ان کے معیار پر پورا نہ اتر رہا تھا۔ غصہ کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ اب تک کسی نے ان کے پسندیدہ ادیب کی تخلیقات کی طرف توجہ بھی نہ کی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ایک نگاہ غلط انداز پر اکتفا کیا گیا تھا۔

اور اب بارھواں امیدوار کمرہ کے اندر داخل ہوا تھا۔ سیٹھ نصیر بے چینی سے اس کی حرکات کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ امیدوار معمولی پتلون اور ریشی شرٹ پہنے پیروں میں معمولی چپل پہنتا تھا بال بکھرے ہوئے تھے چہرے سے بے نیازی مترشح تھی۔ کمرہ میں داخل ہوتے

ہوئے اس نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ دوڑ کر پینٹنگز کے پاس آگیا اور قریب سے دیکھ کر واپس آگیا۔ الماری میں رکھی کتابوں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ ریکوں میں لگے رسائل کو الٹا پلٹا اور کونے والی میز کی طرف آگیا۔ ریک میں لگی بیس کتابوں کے سیٹ کو دیکھا اس کی آنکھوں سے استعجاب کی لہریں نظر آئیں اس نے ایک کتاب کو کھول کر دیکھا اور واپس رکھ دیا۔

سیٹھ نصیر دیکھنے میں اتنے محو تھے کہ ان کو دس منٹ گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا انھوں نے دیکھا کہ سیٹ کی کتابوں کو جوں کا توں چھوڑ کر وہ شخص اب دوسری میز کی طرف جارہا تھا اس نے تمام رسائل کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بالآخر ایک جنسی رسالہ لیکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور عریاں تصاویر کو بڑے اشتیاق سے دیکھنے لگا۔

سیٹھ نصیر کے ضبط کا بندھ ٹوٹ گیا ——— وہ دھڑ دھڑاتے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئے اور آتے ہی اس شخص پر برس پڑے ——— "آپ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے، اس کمرہ میں علم و ادب کے چیدہ موضوعات پر کتابیں موجود ہیں ملکی اور غیر ملکی رسائل کے ڈھیر ہیں کونے والی میز پر اس دور کے عظیم مصنف نجمی کے بیس شاہکار سجے ہوئے ہیں، دیواروں پر اعلیٰ قسم کی تصویریں آویزاں ہیں لیکن آپ کو پسند آیا تو یہ جنسی رسالہ جس میں فضول تصاویر اور بے معنی بکواس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آپ کی تعلیم کہاں تک ہے؟ میں نے تو اشتہار میں صاف الفاظ میں تحریر کردیا تھا کہ امیدواروں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔"

غصہ کی شدت سے سیٹھ نصیر کی سانس پھول گئی اور وہ ایک کرسی پر گر گئے۔

امیدواران کی باتوں پر بالکل حیران نہیں ہوا بلکہ نہایت پرسکون اور سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ جب سیٹھ صاحب خاموش ہوئے تو اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا ———

"میری تعلیم صرف ایم۔ اے تک ہے، دیواروں پر لگی تصاویر بچپن سے دیکھتا آرہا ہوں یہاں موجود کتابوں میں سے زیادہ تر کتابیں میرے پاس ہیں اور تقریباً تمام میری پڑھی ہوئی ہیں ——— ریکوں میں لگے ملکی اور غیر ملکی رسائل میرے پاس بھی آتے ہیں۔ فلموں سے مجھے خاص دلچسپی نہیں ہے البتہ یہ جنسی رسائل میرے لیے غیر مانوس تھے اس لیے دیکھنے بیٹھ گیا، میز پر رکھی بیس کتابیں آپ کے خیال میں دورِ حاضر کا شاہکار ادب

ہیں۔ ممکن ہے آپ کا خیال درست ہو لیکن ان کتابوں کا مطالعہ میرے لیے بے سود ہے کیونکہ ان کا مصنف میں خود ہوں"!

اتنا کہہ کر وہ کمرہ سے باہر چلا گیا اور سیٹھ نصیر خالی نظروں سے اس دروازے کو گھورتے رہے جس سے ان کا محبوب مصنف نکل کر گیا تھا ـــــ سورج کو گھورے بادلوں نے چھپا لیا تھا۔

(غیر مطبوعہ)

نعیمہ جعفری
شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"روح کا کرب"

جیسے ہی پردہ اٹھا تاریک اسٹیج تیز قسم کی روشنیوں میں نہاتا چلا گیا لیکن جب اسٹیج کے وسط میں بیٹھے ہوئے فن کار کی آنکھیں کھلیں اور مجھ سے چار ہوئیں تو میرے ذہن میں روشنی کے ایسے تیز جھماکے ہوئے کہ ان کے سامنے اسٹیج کی روشنیاں ماند پڑ گئیں۔ میں اپنی کرسی سے بے اختیار اٹھتا چلا گیا۔ شاید اس لمحے میں نے اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کیا تھا لیکن فوراً ہی مجھے یاد آگیا کہ میں یہاں تنہا نہیں ہوں، یہ اسٹیڈیم کا ہال ہے اور میں یہاں ملک کے ہر دل عزیز ابھرتے ہوئے ستار نواز پرکاش پنڈت کا پروگرام سننے آیا ہوں۔ سینکڑوں انسانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا شاندار اسٹیڈیم جس میں روایتی پن ڈراپ خاموشی تھی جو فنکار کی عظمت اور مقبولیت کی شاہد تھی۔ پرکاش پنڈت کئی منٹ تک مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ملکوتی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ سکون اور طمانیت سے بھرپور۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے وہ پرکاش نہ ہو مہاتما بدھ کا مجسمہ ہو۔ یکایک اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ستار کے تاروں کو مضراب سے چھیڑ دیا۔ فضا میں ایک دل کش دھن جاگ اٹھی اور میرے ذہن میں تہہ در تہہ ماضی کے پردے سرکتے چلے گئے۔

آج سے پانچ سال پہلے۔

میں اس شہر میں بالکل نیا تھا، چہرے اجنبی تھے، راہیں انجانی تھیں اور فضائیں ناآشنا تھیں۔ اونچی اونچی عمارتوں کا بوجھ اپنے سینے پر محسوس کرتا اور سسک اٹھتا۔ ترس جاتا اپنے گاؤں کی کھلی فضاؤں کے لیے، دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے لیے، کھلی فضاؤں میں کانپتی ہوئی

آزاد اور سرکش ندیوں کے لیے، پنگھٹ پہ پانی بھرتی الھڑ دوشیزاؤں کی کھنکتی ہنسی کے لیے، شام کے دھندلکے میں گھر لوٹتے ہوئے مویشیوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کے ترنم کے لیے اور ہوا میں اڑتی ہوئی مکا کی روٹی سینکنے کی سوندھی سوندھی خوشبو کے لیے۔ لیکن یہ پیٹ کی آگ کہاں کہاں لیے پھرتی ہے۔ سنا ہے آگ میں جل کر ہی سونا کندن بنتا ہے۔ اس لیے یہ آگ میرے وجود کو جلاتی ہوئی جب حلق تک پہنچ گئی تو میں بھی سب اپنوں سے ناطہ توڑ کے اس اجنبی شہر میں آ گیا۔ کوئی دوست نہ تھا۔ کوئی آشنا نہ تھا۔ کوئی ڈھنگ کا ٹھکانا نہ تھا۔ بمشکل تمام ایک کمرہ سر چھپانے کو مل سکا تھا۔ دونوں وقت ایک قریبی ہوٹل میں جا کر وہ آگ بجھاتا تھا جو در بدر لیے پھر رہی تھی۔ حالانکہ میں جان گیا تھا کہ وہ کوئی اچھا ہوٹل نہیں تھا، بدمعاشوں اور ٹھگوں کا اڈا تھا لیکن بہرحال پاس تھا اور یہ بات میرے بس سے باہر تھی کہ دن میں دو مرتبہ بس کی قطار میں کھڑا ہو کر یا ٹیکسی والے کو اپنی آدھی کمائی کا حصہ دار بنا کر کسی "شریف" ہوٹل کا رخ کروں۔ اور پھر مجھے لینا بھی کیا تھا وہاں کی آوارگی سے۔ دونوں وقت جانا اور کونے میں اپنی مخصوص میز پر خاموشی سے بیٹھ کر اس ازلی اور ابدی آگ کو ٹھنڈا کرنا۔ اسی ہوٹل میں میں نے پہلی مرتبہ پرکاش کو دیکھا تھا۔ زرد یا نیلی یا ہری بیل باٹم، شوخ رنگوں والی بڑے بڑے پھولوں والی شرٹ، بڑھے ہوئے بال رخساروں تک پہنچی ہوئی قلمیں، لمبی لمبی ہونٹوں پہ لٹکی ہوئی ا بیل جیسی مونچھیں، غرض وہ بیسویں صدی کے کسی بھی اوباش نوجوان کی پوری طرح نمائندگی کرتا تھا۔ اس کی میز پر روز ایک نئی قسم کی شراب کی بوتل ہوتی اور بانہوں میں روز ایک نئی لڑکی۔ انگلیوں میں سلگتی ہوئی سگریٹ اور ہونٹوں پر یا تو کوئی فلمی دھن یا ویٹر کے لیے گالیاں۔ اس کے متعلق میرے ذہن پر جو اثر پڑا تھا وہ بہت بُرے سے بھی بُرا تھا۔ رفتہ رفتہ ہم دونوں میں ایک خاموش شناسائی ہو گئی۔ کیونکہ ہم دونوں ہی روز کے گاہک تھے۔ میں اس کو دیکھ کر نفرت سے ہونٹ سکیڑ لیتا اور وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیتا۔ پتہ نہیں کتنے دن ہونٹوں کے اس پھیلاؤ اور سکڑاؤ کا تبادلہ چلتا رہا۔ پھر اچانک ایک دن وہ ہوٹل سے غائب ہو گیا اور کتنے ہی دنوں نظر نہیں آیا۔ پھر میں نے وہ کمرہ چھوڑ کر ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا اور دفتر کے

ساتھ ہی وہ بوتل بھی چھوٹ گیا۔ لیکن اس سے متعلق تلخ یادیں ذہن کے کینوس سے پھر بھی نہ مٹیں۔

ان ہی دنوں شہر میں ایک آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ جہاں میں نے بھی غزل پڑھی اور بے پناہ خراج تحسین وصول کیا۔ مشاعرے کے بعد بہت سے لوگوں نے مجھ سے آٹوگراف لیے۔ سب سے آخر میں جو نوجوان میرے پاس آیا اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ سیاہ شیروانی اور ٹوپی میں وہ پرکاش تھا۔ سر کے بال چھٹ گئے تھے، قلمیں گھوٹ گئی تھیں اور مونچھیں غائب ہو گئی تھیں۔ اس کا تفصیلی جائزہ لے کر مسکرایا تو وہ بھی ہنس دیا اور بولا:

"جامی صاحب! میں سکون کی تلاش میں ہوں۔"

"کیا شیروانی پہن کر سکون مل جاتا ہے؟" میں نے دھیرے سے کہا تو وہ جھینپ گیا اور اپنی آٹوگراف بک آگے بڑھا دی۔ میں نے اس پر ایک جملہ لکھا:۔

"سکون کی تلاش میں باہر بھٹکنے سے بہتر ہے کہ اسے خود اپنے اندر تلاش کیا جائے۔"

اس نے اپنی ڈائری لی، ایک سرسری نظر ڈالی، اور شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔

پرکاش سے تیسری ملاقات متھرا میں ہوئی۔ میں متھرا ریڈیو اسٹیشن پر اپنی چند غزلیں ریکارڈ کرانے گیا تھا۔ واپسی پر ایک بڑے سے مندر کی سیڑھیوں کے پاس ٹھٹھک کے رہ گیا، گیروے رنگ کا لباس پہنے ماتھے پر بڑے بڑے تلک لگائے اور گلے میں مالائیں ڈالے وہ گانجے کے دم لگا رہا تھا، آنکھیں انگارے کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ میں بڑی دیر تک بے خیالی میں کھڑا اسے دیکھتا اور سوچتا رہا کہ کیا واقعی یہ لڑکا سکون کی تلاش میں ہے یا محض ایک عام سا فکر زدہ نوجوان ہے۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا اور میں چلا آیا۔ لیکن اس کے چہرے کی بے چینی اور آنکھوں میں تڑپتا ہوا کرب مجھے یہ سوچنے پر مجبور کرتا رہا کہ وہ ایک عام سا معمولی ذہنیت کا لڑکا نہیں ہے۔ لیکن اس کا المیہ یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو سمجھ نہیں پایا ہے۔ جب جب مجھے متھرا اور ورندابن کے عظیم الشان مندروں کے کلس اور جمنا کا سکون اور ٹھہراؤ یاد آتا پرکاش کی سرخ آنکھیں ذہن میں چبھنے لگتیں۔

پرکاش سے چوتھی اور آخری ملاقات عجیب تر حالات میں ہوئی تھی۔ ایک دن یکایک شہر میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ وجہ یقیناً کوئی معمولی رہی ہو گی۔ لیکن اس وقت تو مجھے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں کسی کام سے بازار جارہا تھا کہ فسادیوں کے ہجوم میں گھر گیا۔ میں اس فکر میں تھا کہ کسی طرح بھیڑ سے نکل کر واپس لوٹ جاؤں کہ میرے سر پر ایک لاٹھی آکر لگی۔ اور گرتے گرتے میں نے دیکھا کہ وہ لاٹھی پرکاش کے ہاتھ میں تھی۔ کتنا خون میرے سر سے بہا تھا اور کتنے قدموں تلے میں کچلا گیا مجھے کچھ یاد نہیں۔ ہاں جب اسپتال میں مجھے ہوش آیا تو تو میں نے سنا کہ وہ آگ دراصل پرکاش ہی کی بھڑکائی ہوئی تھی اور اب وہ اور اس کے ساتھی گرفتار کیے جا چکے ہیں ——— اس واقعے کو تین سال ہونے جارہے تھے اور آج پرکاش میرے سامنے جس روپ میں تھا وہ بھی کچھ کم چونکا دینے والا نہ تھا۔

میری انگلیاں اپنے سر کے زخم کے نشان پر آکر رک گئیں۔ پورا ہال تالیوں کی زبردست گڑگڑاہٹ سے گونج رہا تھا۔ ایک گھنٹے کا پروگرام پورا ہو چکا تھا۔ اسٹیج کا پردہ آہستہ آہستہ نیچے آرہا تھا اور عوام کی زبان ہر دل عزیز اور ابھرتے ہوئے نوجوان فنکار پرکاش پنڈت کے فن کا اعتراف کرتے نہیں تھک رہی تھی ——— جب میں ہال سے نکلا تو ایسا مضمحل تھا جیسے کئی سال کی مسافت ابھی ابھی پیدل طے کی ہو۔ میں باہر لان میں لگے اشوک کے پیڑ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اسٹیڈیم جو ذرا دیر پہلے رنگ، نور اور خوشبوؤں کا گہوارہ بنا ہوا تھا سنسان ہو گیا تھا۔ ایسے میں ایک سائے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ سڑک کی لائٹ کی روشنی میں میں نے دیکھا وہ پرکاش تھا۔ اس نے جھک کر میرے پاؤں چھو لیے۔ وہ کہتا رہا ———

"آپ بہت عظیم ہیں جامی صاحب! بہت مہان ہیں۔ آپ کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے ایک جملے نے میری زندگی بدل ڈالی۔ میں سکون کی تلاش میں بھٹکتا رہا، نت نئے روپ بدلتا رہا لیکن سکون مجھ سے دور رہا۔ میں اپنی روح کے کرب کو، اپنے اندر کی تڑپ کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ لیکن جب میں نے اپنے آپ میں ڈوب کر دیکھا تو مجھے محسوس

ہوا کہ وہ ایک فنکار کی پیاسی روح کی تڑپ تھی جو اپنی منزل تک
پہنچنے کو بیتاب تھی۔ اور اب جبکہ میں نے اپنے آپ کو سمجھ لیا ہے تو
سکون بھی مجھ سے دور نہیں رہا۔ مجھے آشیرواد دیجیے۔ آپ کی دعائیں
ہی میرے لیے سب کچھ ہیں!"
اور میں سوچتا رہا کہ اسے آشیرواد دوں یا اس سے آشیرواد مانگوں؟ کاش مجھے بھی
اس سکون کا کم سے کم ایک حصہ ہی مل سکے جو اس نے میری وجہ سے پا لیا ہے۔

ابن کنول

افسانہ

بے کفن

پندرہ برس کی طویل مدت کے بعد جیل کے آہنی پھاٹک کی کھڑکی سے ایک بوڑھے
نے نکل کر باہر کی فضا کو اس طرح اجنبی نگاہوں سے دیکھا جیسے کسی دیہات کے بچے کو لال قلعہ کے
وسیع میدان میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ بوڑھے کی ضعیف آنکھوں کے گرد سیاہی نمودار تھی، چہرے پر
سفید اور سیاہ بالوں کی داڑھی جھنڈ میں لگے اُلجھے ہوئے بیتوں کی طرح لگ رہی تھی
اس کے لاغر جسم پر جھولتے ہوئے کپڑے ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے کسان نے بانسوں کے
بنے آدمی کو کپڑے پہنا کر کھیت میں کھڑا کر دیا ہو اس کے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قدموں سے
دنیا کی نہیں بلکہ چاند کی زمین کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے خوش آمدید کہنے کے لیے دور دور تک
کوئی جانور بھی نہیں تھا۔ اور وطن سے اتنی دور ہوتا بھی کون؟ اس کے خاندان والوں کو
تو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ وہ کس جیل میں ہے۔ کئی دن تک وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ اپنے بھوکے
پیٹ کو لیے اسی شہر میں ادھر اُدھر مورِطاس کی طرح چکر کاٹتا رہا۔ بالآخر اس کی ضعیف لڑکھڑاتی
ٹانگوں نے اپنے گاؤں کے راستے پر چلنا شروع کر دیا۔ اس کی نظروں میں اپنے گاؤں کی پندرہ
بیس برس پرانی تصویر اب بھی موجود تھی لیکن گاؤں ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکا تھا۔ اپنے ہی
گاؤں میں وہ اجنبی کی طرح ٹاؤن ایریا کے بنوائے ہوئے کھڑنجے پر چلنے لگا۔ راستے کے دونوں
جانب اچھی خاصی پختہ دکانیں اور مکانات تعمیر ہو چکے تھے۔ سڑک کے ایک طرف ایک گودام
کی بنی ہوئی پختہ عمارت گاؤں کی اُبھرتی ہوئی عظمت کی نشاندہی کر رہی تھی۔ گودام کے
اندر بہت سارے مزدور کام میں لگے ہوئے تھے ایک اونچے چبوترے پر گاؤ تکیہ کا سہارا لیے
ایک بھاری جسم کا آدمی بیٹھا ہوا ادھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ چبوترے کے نیچے کھڑا ہوا

ایک مزدور لالہ سے گڑگڑا کر کہہ رہا تھا "مالک بس دوا کے لیے پیسے دے دو ــــ میری بچی تڑپ رہی ہے ــــ زندگی بھر آپ کی غلامی کروں گا۔"

"چل چل کام کر بیلے ــــ غلامی نہ کرے گا تو کھائے گا کیا" لالہ نے جھڑک دیا۔ بوڑھے کو اس نوجوان مزدور کی یہ حالت دیکھ کر ترس آ گیا جس کے گورے لیکن میلے چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی اور کپڑوں میں لگے ہوئے پیوند اس کی کہانی بیان کر رہے تھے۔ بوڑھا ترس کھانے کے سوائے کر بھی کیا سکتا تھا اگر خود اس کے پاس کچھ پیسے ہوتے تو اپنے ریڑھ کی ہڈی سے لگے ہوئے پیٹ میں کچھ ڈال لیتا۔ بوڑھا قریب ہی ایک ہوٹل کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور پاس بیٹھے ہوئے ایک سن رسیدہ آدمی سے پوچھنے لگا ــــ "یہ لالہ جی کون ہیں"

اس آدمی نے حیرت سے بوڑھے کو دیکھا ــــ "ارے بھیا لالہ رام دین کو نہیں جانتے۔"

"بابا میں یہاں کا رہنے والا نہیں ــــ کیا یہ لالہ اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں" بوڑھے نے اپنے ہی وطن میں خود کو اجنبی ظاہر کیا۔

"ان کے تو باپ دادا بھی اسی گاؤں کی مٹی میں پیدا ہوئے شاید تم نے سنا ہو چودھری ریاست علی کا نام "

"ہاں! ہاں! پھر" بوڑھا کچھ بے چین سا ہو گیا

"ان کے یہاں دین دیال نام کا ایک آدمی مختار عام تھا۔ مختار عام تو ایک طرح سے مالک ہوتا تھا زمینداری کا زمانہ تھا چودھری بڑے دل والے آدمی تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر ہزاروں لٹا دیتے تھے۔ کبھی روپے پیسے کی پرواہ نہ کی۔ اسی لاپرواہی سے فائدہ اٹھا کر دین دیال نے چودھری کی آدھی سے قریب جائداد اپنے نام کرالی۔ چودھری کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو غصہ میں آ کر اس کے گولی ماردی۔ بھیا زمینداری تو ختم ہو چکی تھی ــــ گرفتار ہو گئے لمبی سزا ہو گئی۔ خدا بہتر جانے کیا ہوا ان کا ــــ یہ لالہ جو ہے، اسی دین دیال کا بیٹا ہے۔"

"کیوں بابا ریاست علی کے بچوں کا کیا ہوا" بوڑھے کے چہرے پر کچھ کرب کے اثرات نمایاں ہوئے۔

"بڑی بری حالت ہوئی بھیا زمینداری کیا ختم ہوئی زمینداروں کی تو مٹی پلید ہو گئی

خدا کسی کی ایسی حالت نہ کرے۔ بیگم صاحب تو ان کے جیل جانے کے کچھ ہی دن بعد اللہ کو پیاری ہوگئیں، چھوٹے چھوٹے دو بچے تھے جنھیں چودھری کے ایک خدمت گار پھول چند نے پالا۔ اور پالتا بھی کون؟ جو کچھ بھائی بند تھے وہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد اپنی زمینیں اونے پونے داموں میں بیچ کر پاکستان چلے گئے تھے ــــ پھول چند کے مرنے کے بعد بیچارے بے سہارا ہوگئے نوکروں میں جس کے ہاتھ جو لگا لیکر بھاگ گیا۔ زمینیں موروثی ہوگئیں مکان بھی سب آہستہ آہستہ نکل گئے۔"

"ریاست علی کے بچے اب کہاں رہتے ہیں" بوڑھے کے لہجے میں کچھ بے قراری تھی۔

"ادھر ہی پیپل والی گلی میں آخری نکڑ پہ ایک ٹوٹا سا مکان ہے اسی میں ہیں۔" اتنا کہکر وہ شخص اٹھکر جانے لگا۔ بوڑھے نے ایک بار پھر لالہ رام دین کو دیکھا، مزہ رجا چکا تھا، لالہ ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے۔ بوڑھا بھی تیز تیز قدموں سے پیپل والی گلی کی طرف بڑھنے لگا ــــ

بیچ بازار میں جب چودھری ریاست علی کا گھوڑا روک کر ان کے ہاتھوں میں ایک نئے آئے ہوئے تھانیدار نے ہتھکڑیاں پہنائیں تو انھیں ایسا لگا جیسے مہترانی نے اپنا بھرا ہوا جھبڑا ان کے اوپر لوٹ دیا ہو۔ ان کی نگاہیں اس طرح نیچے کو جھک گئیں جیسے کسی پاکباز مولوی کے سامنے اچانک کوئی جوان ننگی عورت آگئی ہو۔ ان کے اردگرد ایک سہما ہوا مجمع اکٹھا تھا کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ان سے نگاہیں ملا سکتا تھا، یہ وہی چودھری ریاست علی تھے جن کے حکم کے بغیر علاقے کا کوئی جانور پانی بھی نہیں پیتا تھا لیکن انھیں کے یہاں سینکڑوں بھوکے اپنے خالی پیٹ کو بھرتے تھے۔ نہ جانے کتنی یتیم لڑکیوں کی ڈولیاں ان کی حویلی سے اٹھکر سسرال چلی گئی تھیں۔ ان کے یہاں سے کبھی کوئی ضرورت مند خالی ہاتھ واپس نہ گیا۔ ریاست علی کی فراخ دلی کے چرچے دور دور تھے ــــ تھانیدار چلنے لگا اس کے پیچھے پیچھے چودھری ریاست علی اس طرح جارہے تھے جیسے کوئی باپ اپنے جوان بیٹے کی میت کو قبرستان لے جا رہا ہو۔ پورے گاؤں پر موت کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گاؤں کی عورتیں جو پیڑوں سے نکل کر ریاست علی کو دیکھتیں اور ان کی مہربانیوں کو دہرا کر آنچل سے آنکھیں صاف کرتی تھیں۔ ریاست علی کی زندہ لاش کا جنازہ تھانیدار کے کندھوں پر رکھا ہوا جب حویلی پر پہنچا تو کسی نے اندر کہدیا کہ میاں

گرفتار ہو کر تھانے جا رہے ہیں۔ حویلی کی چوڑی چوڑی دیواروں کے اندر رہنے والی بیگم سن کر ننگے سر، پا برہنہ، باہر بھاگیں۔ میاں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھیں ہمیشہ اونچے رہنے والے سر کو جھکا دیکھا، نظریں چار ہوئیں بے ہوش ہو کر ایسی گریں کہ پھر خدا ہی نے اٹھایا۔ چھ سال کا چھمن ابوا بو چلا رہا تھا، ریاست علی کے اشارے پر پھول چند اسے گود میں اٹھا کر قریب لے آیا۔ انھوں نے چھمن کے رخسار پر آخری بوسہ دیا۔ ان کی نم آنکھوں نے ہتھکڑی سے نازک رخسار پر شبنم کی بوندیں گرا دیں، جانے کیوں انھیں احساس ہو گیا تھا کہ اس بار ان کی دولت بھی انھیں رہا نہ کرا سکے گی۔ ریاست علی نے پھول چند سے صرف اتنا کہا۔ "پھول چند ان کا خیال رکھنا۔"

تھانیدار نے چلنے کا اشارہ کیا چودھری ریاست علی نے تھانیدار کے اوپر ایسے انداز سے نگاہیں ڈالیں کہ تھوڑی دیر کے لیے وہ بوکھلا گیا، آج سے پہلے کتنے ہی تھانیدار ان کی حویلی میں پڑے ٹکڑے توڑتے رہتے تھے۔ ہر نیا داروغہ سب سے پہلے انھیں سلام کرنے آیا کرتا تھا۔ بڑے بڑے افسر شکار کا بہانہ کر کے کئی کئی مہینے رہ جاتے تھے —— ریاست علی خود ہی پاس کھڑی ہوئی جیپ میں بیٹھ گئے، جیپ میں بیٹھنے سے قبل انھوں نے ایک حسرت بھری نگاہ حویلی پر ڈالی حویلی کسی بیوہ کی طرح بال بکھیرے ہوئے اپنے دیوتا کی زندہ میت کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ریاست علی نے حویلی کی طرف سے ایسے نگاہیں ہٹائیں جیسے وہ حویلی کو جوئے میں ہار کر کسی اور کے حوالے کر رہے ہوں۔ جیپ گرد اڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور حویلی اس اڑتی ہوئی گرد میں پانی میں ڈوبتے ہوئے پتھر کی طرح گم ہو گئی ——

—— پیپل والی گلی پر پہونچ کر بڈھے نے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر اس میں گھستا چلا گیا ——

چودھری ریاست علی رحیم پور جانے کی تیاری کر رہے تھے پھول چند بندوق کی نال صاف کرنے میں لگا ہوا تھا۔

"پھول چند گھوڑا تیار ہو گیا" ریاست علی نے پستول جیب میں ڈالتے ہوئے پوچھا

"جی سرکار"

"ٹھیک ہے ـــــ جلدی کرو ـــــ ہم ابھی آتے ہیں" ریاست علی اندر چلے گئے لیکن جلد ہی واپس آ گئے۔ پھول چند نے پیٹی میں کارتوس لگاتے ہوئے ریاست علی سے معلوم کیا۔
"سرکار ہم کا یہ بتائے دیو کہ اب کی بڑے باگ کی فصل کا کتنا روپیہ آیو ہے؟"
"کیوں؟ ـــــ یہی کوئی چار سو روپے" ریاست علی نے بڑی لاپرواہی سے کہا لیکن پھول چند چونک پڑا
"صرف چار سو روپیہ ـــــ سرکار فصل تو ایک ہجار میں بکی ہے۔"
"نہیں بھئی! دین دیال نے مجھے خود آ کر دیئے ہیں اور بتایا کہ چار سو میں بکی ہے۔"
"ناہیں سرکار ہمرے سامنے بات بھئی تھی رسید کہاں سے پورے ایک ہجار میں"
"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"
"ہم نے تو بتائے دیا سرکار ہم کا ہے کو جھوٹ بولن لاگے"
"اچھا" ریاست علی کو پہلی بار دین دیال کی دیانت داری پر شک ہوا۔ انھوں نے اسی وقت مجید خاں سے دین دیال کو بلوایا۔ آن کی آن میں مجید خاں دین دیال کو بلا لایا۔
"اس بار بڑے باغ کی فصل کتنے میں فروخت ہوئی تھی" ریاست علی کا پہلا سوال یہی تھا۔ دین دیال نے ایک بار چاروں طرف اپنی بوڑھی اور تجربہ کار نگاہیں دوڑائیں وہ سمجھ گیا کہ کسی نے بھر دیا ہے۔
"اس کا حساب تو آپ تک پہونچ گیا لیکن کیا بات ہے سرکار آج تک آپ نے اس طرح نہیں پوچھا"
"یہی تو مجھے افسوس ہے کہ میں نے آج تک اس کی پرواہ نہیں کی ـــــ میری بات کا جواب دو"
"ایک ہزار میں" دین دیال کی صاف گوئی پر ریاست علی برہم ہو گئے۔
"لیکن ہمیں چار سو کیوں بتایا"
"اس لیے کہ وہ باغ میرے نام ہے" دین دیال کو یہ بھی معلوم تھا کہ زمینداری ختم ہو گئی ہے۔ ریاست علی کے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا وہ چیخ پڑے " دین دیال"

"جی سرکار"

دین دیال کے اس طنزیہ انداز پر ریاست علی تلملا گئے لیکن دین دیال پر اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اس نے اپنی جیب سے کچھ کاغذات نکالے

"میں تو خود آپ کے پاس حاضر ہونے والا تھا میں اب آپ کی نوکری سے استعفیٰ دینا چاہتا ہوں اور اپنی پرانا قبضہ ـــــ یہ دیکھیے ـــــ بڑا باغ اور شیر پور والا چک میرے نام ہے دیکھ لیجیے ـــــ آپ ہی کے دستخط ہیں"

ریاست علی اس بھوکے شیر کی طرح بپھر گئے جس کے منہ سے شکار کیا ہوا ہرن چھین لیا گیا ہو۔

"ہماری لاپرواہی سے تم نے یہ فائدہ اٹھایا" زمیندار کا خون جوش کھا گیا۔ جیب میں رکھا ہوا پستول ریاست علی کے ہاتھ میں آگیا اور دوسرے ہی لمحے اس کے اندر کی گولیاں دین دیال کے سینے میں اتر گئیں۔

پیپل والی گلی کے آخری مکان تک پہنچتے پہنچتے بوڑھے کی سانس پھول گئی۔ کمزور ہاتھ سے زنجیر کھٹکھٹائی دروازہ کھلا ان کے سامنے وہی مزدور کھڑا تھا جو لالہ رام دین کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔

"کیا اس مکان میں چھمن میاں رہتے ہیں"

"چھمن ـــــ میاں" مزدور نے ایک بار دہرایا "جی ـــــ جی ہاں" مزدور کا اتنا جواب سنتے ہی بوڑھا اندر گھستا چلا گیا۔ مزدور حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا وہ اسے روک بھی نہ سکا اس نے قریب آکر معلوم کیا "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

بوڑھے نے پہلے تو اسے غور سے دیکھا اور پھر دھیرے سے بولا "جیل سے"

جیل کا نام سنتے ہی مزدور دوڑ کر بوڑھے سے لپٹ گیا "ابو"

"بیٹے میرے ـــــ بیٹے یہ کیا ہو گیا تجھے" بوڑھا اس مزدور کو آغوش میں لیکر بیٹھتا چلا گیا ـــــ

"بیٹے! کسی سے یہ ـــــ یہ مت کہنا ـــــ کہ یہ چودھری ریاست علی کا جنازہ ہے" اتنا کہہ کر اس بوڑھے کی گردن ایک طرف کو لڑھک گئی ـــــ

اور پھر رات کے اندھیرے میں فراخدل چودھری ریاست علی آف رحمت گڑھ کا بیٹا چھمن پیسے اکٹھے کرتا پھر رہا تھا تاکہ اپنے باپ کی بے گفن میت کو کفن پہنا کر آخری منزل تک پہنچا سکے ـــــ

غیاث الرحمٰن
57/ے ڈاکس مسعود ہال
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

آنچل

دھوپ بہت تیز تھی، باڑے کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے تھوڑے سے سائے میں کچھ مرغیاں دھول میں سمٹی دبک رہی تھیں۔ جس بیل گاڑی میں امی گئی تھیں وہ بہت دیر ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ لیکن میری آنکھوں کے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے۔ گالوں پر دو باریک دھاریں اب بھی بہہ رہی تھیں۔ جیسے بارش بند ہو جانے کے بعد بھی پرنالے سے پانی بہت دیر تک بہتا رہتا ہے۔ میرے سر میں بہت درد ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا ابھی پھٹ پڑے گا۔ جیسے ایک روز رشید بھائی کی فٹ بال میں ہوا بھرتے رہے، بھرتے رہے اور وہ بہت زور کے دھماکے سے پھٹ گئی ـــــ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا کہ پھٹنے سے رک جائے۔ اور اسی دیوار کا سہارا لیکر کھڑا رہا۔ مجھے آہستہ آہستہ ہچکیاں اب بھی آ رہی تھیں ـــــ میں اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ ایک ہتھیلی پر امی نے گاڑی میں بیٹھ کر جاتے ہوئے تھو تھو کر کے تھوڑا سا تھوک دیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں ـــــ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امی مجھے اتنا پیار کرتی تھیں، پھر بھی یہاں چھوڑ کر وہ اکیلی ہی ماموں کے ساتھ کیوں چلی گئیں۔ لیکن وہ بھی تو رو رہی تھیں۔ امی کا روتا ہوا چہرہ اور ممتا سے بھری آنکھیں یاد کر کے پھر سے میرا جی امڈ آیا۔ اور میں چیخ چیخ کر رونے لگا، پھر مجھے کسی نے گود میں اٹھا لیا۔ شاید امی واپس آ گئیں اور مجھے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ میری ہچکیاں کم ہو گئیں۔ وہ سمجھا رہی تھیں۔ "ارے روتے نہیں پگلے چل کھانا کھا لے، تجھے گڑ ہی اچھی لگتی ہے نا۔ اور بیسن کے پکوڑے بھی تلے ہوئے ہیں۔ چل پھر میں تجھے کہانی سناؤں گی" ـــــ یہ تو زینت آپا تھیں۔ میں نے ان کے ہاتھوں سے چھوٹنا چاہا۔ لیکن آپا نے مجھے ایک ہاتھ سے کس کے دبائے

رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا گرتا ہوا دوپٹہ سنبھالتی ہوئی گھر کے اندر گھس گئیں۔

زینب آپا نے میرا منھ دھلایا۔ اب میرا رونا بند ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں، کھانا کھانے کو بالکل طبیعت نہیں چاہتی تھی۔ لیکن ممانی جان کی ڈانٹ اور آپا کی محبت بھری باتوں سے تھوڑا کھا ہی لیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا لوگ اتنے پتھر کلیجے کے کیسے ہوتے ہیں۔ اب اتنا سا بچہ بھلا کیسے بغیر ماں کے رہے گا۔ نصیب ہوتے تھے تو پیدا کرنے کی ہی کیا جلدی تھی —— میری جان پر کیا پہلے ہی کم مصیبت تھی" اوپر سے ایک اور بلا نازل ہو گئی۔ میں نے لاکھ کہا کہ پہلی شرط یہی رکھنا لیکن کون سنتا ہے ......" ممانی جان بڑبڑا رہی تھیں۔ زینب آپا نے ان کی طرف سختی سے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں اور جھٹکے سے مجھے گود میں اٹھا کر پچھواڑے نکل گئیں۔ پچھواڑے بہت سے پیڑ تھے، ایک بیری کا پیڑ تین چار پپیتے کے جن پر توری کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ دو بڑے بڑے گوندنی کے پیڑ تھے، جن میں بے شمار چھوٹی چھوٹی لال لال گوندنیوں کے گچھے ہرے ہرے پتوں سے جھانک رہے تھے۔ ان پر روزانہ بہت سے طوطے اور طرح طرح کے پرندے آتے، خوب خوب شور مچاتے، گوندنیاں کھاتے بھی اور گراتے بھی تھے۔ محلّے کے سارے بچے تو پیڑوں پر چڑھ کر گوندنیاں کھاتے لیکن مجھ سے چڑھا نہیں جاتا۔ بلکہ میں نے کبھی چڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ بس نیچے گری ہوئی گوندنیاں ہی چن لیا کرتا —— سامنے ہی بالکل ہمارے احاطے سے لگ کر ارنی کے گھنے اور بڑے بڑے پودوں سے گھرا ہوا ایک سبزی کا باغ تھا، جو ہمیشہ ہی ہرا رہتا تھا۔ اور اس میں روزانہ ہی "موٹھ" (رہٹ) چلنے کی آواز آتی اور موٹھ چلانے والا بہت اونچی آواز میں کوئی گیت الاپتا۔ اس کی آواز مجھے بہت اچھی لگتی۔ جی چاہتا کہ اس کے پاس چلا جاؤں اور میں بھی اس کی آواز میں آواز ملا کر گاتا رہوں۔ میں نے کئی بار جھاڑیوں کے پیچھے سے اس کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کبھی نظر نہیں آیا —— زینب آپا نے مجھ سے پوچھا "تو گوندنی پر چڑھے گا —— ؟" میں نے سر ہلا کر "ناں" کہہ دیا۔

"اچھا تو چل اوپر چھت پر کھیلیں گے" اور ڈوٹے ہوئے زینے سے "دھابے" (کچے مکان کی چھت) پر چڑھ گئیں۔ چھت کی منڈیریں کافی اونچی تھیں اور ان پر اگی ہوئی گھاس بالکل

سو کر چکی تھی۔ مجھے منڈیر کی چھاؤں میں کھڑا کر کے کہا "ٹھہر جا ——— میں ابھی آئی۔"

اور وہ نیچے چلی گئیں ——— دھوپ بہت تیز تھی۔ ہوا میں گرم گرم لپٹیں اٹھتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ پیڑوں پر پرندے شور مچا رہے تھے۔ منڈیر کے برابر کھڑے ہو کر تو میں گوندنی کے اوپری حصے کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ بلکہ پیڑ کی ایک ڈال منڈیر پر آ گئی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر آسانی سے گوندنیاں توڑیں۔ میں پہلی بار چھت پر چڑھا تھا۔ اور پہلی بار ہی گوندنی کا گچھا اپنے ہاتھ سے توڑا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اور اسی خوشی میں اس ڈال کی تمام کچی پکی گوندنیاں پتوں سمیت توڑ کر منڈیر کے سہارے ڈھیر کر دیا۔ ان کے گاڑھے گاڑھے پانی سے میرے ہاتھ چپکنے لگے ——— پھر زینب آپا چارپائی لیکر اوپر آ گئیں۔

"ارے یہ ہری گوندنیاں کیوں توڑیں ——— ؟" پھر میری طرف دیکھ کر مسکرا دیں۔ اس گھر کے سارے لوگوں میں مجھے امی کے علاوہ صرف زینب آپا ہی اچھی لگتی تھیں۔ آپا نے منڈیر کے اوپر چارپائی کے دو پائے ٹکا کر ترچھی بچھا دی۔ اور اس کے اوپر دری ڈال کر ایک چھوٹی سی کٹیا کی شکل بن گئی۔ پھر اندر سوکھی ہوئی گھاس بچھا کر دوسری دری بچھا دی ——— اس جھونپڑی کے اندر بیٹھ کر مجھے بہت اچھا لگا۔

"آپا!" کچھ دیر کے بعد میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ "میری امی کہاں چلی گئیں؟" یہ سوال میرے ذہن پر بہت دیر سے چھایا ہوا تھا۔ زینب آپا نے منڈیر سے ٹیک لگا کر پاؤں پھیلا دیے اور میرا سر کھینچ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

"رجو!" آپا نے آہستہ سے کہا "اگر تو رویا کرے گا تو میں تجھ سے کبھی بات نہیں کروں گی۔ اور تیرے ساتھ کھیلوں گی بھی نہیں۔"

"میں کبھی نہیں روؤں گا ———" میں نے بڑے ہی بڑے وعدہ کر لیا "لیکن یہ تو بتاؤ میری امی کہاں گئی ہیں ان مہمانوں کے ساتھ؟"

"رجو ——— ! تیری امی کی دوسری شادی ہو گئی ہے۔"

"کیوں" میں نے بغیر سمجھے ہی حیرت ظاہر کی

"تو ابھی بہت چھوٹا ہے رے۔ تیری سمجھ میں نہیں آئے گا ——— تیرے ابا مر گئے

ہیں" زینب آپا میرے گالوں کو سہلاتی رہیں۔

"وہ کیوں مر گئے ہیں ؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"تیرے ابا فوجی تھے۔ وہ بہت دور رہتے تھے اور ادھر ہی دشمنوں سے لڑتے لڑتے مارے گئے۔"

"وہ کیوں لڑ رہے تھے آپا ؟" میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ دیکھ ہر آدمی کو اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی دوسرے لوگ زبردستی ان کے گھر میں گھس آنا چاہیں تو کیا وہ لڑیں گے نہیں ——— بس اسی طرح دوسرے دیس کے لوگ ہمارے دیس میں زبردستی گھس آنا چاہتے تھے تو تیرے ابا اور ان کے بہت سے ساتھیوں نے لڑ کر دشمنوں کو مار بھگایا۔"

اور میری آنکھوں میں چند دن پہلا منظر آ گیا۔ گلی کے موڑ پہ آگے کچھ لوگ لڑ رہے تھے۔ گالیاں دے رہے تھے۔ چیخ رہے تھے۔ عورتیں ایک دوسرے کے بال پکڑ کر گتھم گتھا تھیں۔ اور مردوں کی لاٹھیاں آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔ گاؤں کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اور میں دور کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا ——— شاید وہ بھی ایک دوسرے کا گھر چھین لینا چاہتے ہوں گے۔

"میرے ابا نے بھی لاٹھی سے لڑائی کی ہوگی، ہے نا آپا ؟ اور گالیاں بھی دی ہوں گی، لیکن گالیاں تو برے لوگ دیتے ہیں۔ امی نے کہا تھا۔"

"ارے نہیں ——— وہ کوئی چھوٹی موٹی لڑائی تھوڑی ہوتی ہے۔ وہاں بندوق کی گولیاں اور توپ کے گولوں سے لڑائی ہوتی ہے۔ ہوائی جہاز سے، بڑی بڑی موٹروں اور شعلوں سے لڑائی ہوتی ہے۔ کوئی کسی کو گالی نہیں دیتا اور وہ چیختے چلاتے بھی نہیں۔ سب خاموشی سے لڑتے رہتے ہیں۔ بس گولیوں کی آوازیں ہوتی ہیں ......" اور وہ لڑائی دیکھنے کو میرا جی چاہنے لگا۔

"آپا" میں نے مچل کر کہا۔ "میں بھی فوجی بنوں گا۔"

"ہشت پدا" آپا نے مسکرا کر منہ بنایا۔ "تو کیا فوجی بنے گا۔ فوجی تو بہت بہادر ہوتے ہیں وہ کبھی نہیں روتے اور امی کو بھی یاد نہیں کرتے۔ وہ تو اپنے ماں باپ سب کو چھوڑ کر

بہت دور لڑائی کے لیے چلے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔"
"میں کبھی نہیں روؤں گا اور امی کو بھی یاد نہیں کروں گا۔ میں بندوق چلانا سیکھوں گا۔ اور ان ہاتھوں سے۔۔۔۔۔" میں نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تو مجھے ایک دم یاد آ گیا "آپا! امی نے جاتے وقت میرے اس ہاتھ پر تھوک کیوں دیا تھا ـــــ؟"
"ارے یہ ٹوٹکا ہوتا ہے۔ الٹے ہاتھ پر تھوک دینے سے جانے والے کی یاد کبھی نہیں آتی۔ سمجھا؟"
"کیا امی کو بھی میری یاد کبھی نہیں آئے گی؟"
زینب آپا تھوڑی دیر خاموش رہیں پھر آہستگی سے کہنے لگیں
"ماں کو تو اپنے بچے کی یاد ہمیشہ ستاتی ہے۔ امی تجھے کبھی نہیں بھول سکتیں۔"
"پھر وہ مجھے چھوڑ کے کیوں چلی گئیں؟" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔
"وہ مجبور تھیں رجّو!۔۔۔۔ تیرے نئے ابا کا گھر بہت چھوٹا ہے، تیرے لیے وہاں جگہ نہیں تھی۔"
"اپنا گھر تو بہت بڑا ہے" میں نے اس انداز سے کہا گویا امی کو یہیں رہنا چاہیے تھا۔
"تیری امی جب یہاں رہتی تھیں تو میری امی ان سے روز لڑتی تھیں۔ اور انہیں پریشان کرتی تھیں، اور پھر تیری امی ابھی جوان ہیں۔ تو نہیں سمجھے گا، ابھی تو بہت چھوٹا ہے رے ـــــ ہر جوان عورت کو ایک مرد کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے ان کی شادی کر دی گئی۔"
"یہاں بھی مرد تھے، ماموں جان، رشید بھائی اور۔۔۔۔۔؟"
"ہٹ پگلے ـــــ میرے ابا تو تیری امی کے سگے بھائی ہیں، اور رشید بھائی اور ۔۔۔ بھائی تو تیری امی کے بھانجے ہیں۔"
میری سمجھ میں نہیں آیا بھائی ہو یا بھانجہ آخر مرد تو ہیں۔ لیکن میں خاموش ہو گیا۔
پھر روزانہ دن کا زیادہ تر وقت "دھابہ" کی چھت پر ہی گذرتا۔ زینب آپا مجھے شہزادیوں اور پریوں کی کہانیاں سنایا کرتیں، چین کی شہزادی بہت خوبصورت تھی، جب وہ ہنستی تھی

تو اس کے منہ سے ریشمی پھول جھڑتے تھے۔ اور روتی تو موتی گرتے اور چلتی تھی تو پاؤں کے نشان سونے کی اینٹ بن جاتے تھے...... اس کو حاصل کرنے کے لیے روم سے ایک شہزادہ بھولا پیا سا پیدل ہی آیا تھا اور ستر پہلوانوں کو کشتی لڑکر ہرا دینے کے بعد شہزادی کو حاصل کر لیا تھا..... اور ترکستان کی شہزادی بہت تیز دوڑتی تھی۔ خرگوش سے بھی زیادہ تیز..... اور نیلم پری سمندر میں رہتی تھی...... اور روس کی شہزادی نے دنیا کے سارے شہزادوں کو تیر اندازی کے مقابلے میں ہرا دیا تھا...... اور......"

اور جب کوئی کہانی یاد نہ آتی تو دلہا دلہن کی شادی رچائی جاتی۔ میرے سر پر اپنے نئے دوپٹہ کی پگڑی باندھ کر اس میں گوندنی کے ہرے ہرے پتے اور توری کے پیلے پیلے پھول لگا کر سہرا بنائی تھی۔ اور ایک کرسی کا ڈنڈا میری دونوں ٹانگوں میں پھنسا کر ایک سرا میرے ہاتھ میں تھما دیتیں۔ اور کہتیں "یہ تیرا گھوڑا ہے" اور پھر میں گھوڑا دوڑاتا ہوا چھت کا پورا چکر کاٹ کر اس کٹیا کے پاس آتا تو زینب آپا اندر بیٹھی ہوئی، اپنے منہ پر لال دوپٹہ کا گھونگھٹ ڈال کر شرماتی۔ لیکن میں وہ سب کچھ بھول جاتا جو جلے آپا نے مجھے دلہا بنانے کے بعد رٹائے تھے۔ اور طریقہ بھی سکھایا تھا کہ گھوڑا ڈیرے کھڑا کر کے اندر آنا اور میرے بالکل قریب بیٹھ جانا پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے آہستہ آہستہ میرا گھونگھٹ اٹھانا۔ پھر میں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالوں گی تو کہنا "شرماؤ نہیں بیگم" اور میری کلائیاں پکڑ کر چہرے سے ہٹانا۔ پھر اپنی پگڑی اتار کر ایک طرف رکھ دینا اور میرے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیوں سے کنگھی کرنا۔ پھر میرے ہونٹوں پر انگلیاں پھیرنا..... پھر میرے گالوں پر پھر میرے گلے میں دونوں باہیں ڈال کر لپٹ جانا اور..... اور..... " لیکن میں وہاں پہنچنے پر سب کچھ بھول جاتا۔ وہ تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد گھونگھٹ کے نیچے سے اشارے کرتیں اور ایک آدھ بار کہہ بھی دیتیں۔ "ارے گھونگھٹ اٹھاؤ....." لیکن وہ گھونگھٹ کے اندر ہی بہت اچھی لگتیں اس لیے میں گھونگھٹ نہیں اٹھاتا اور وہ پھر بیزار ہو کر ڈانٹنے لگتیں اور ایک چانٹا میرے گال پر مار دیتیں اور میں رو پڑتا —— پھر خود ہی مجھے مناتیں" ارے..... ارے میرا اچھا راجو۔ مجھے سینے سے لگا کر بھینچ لیتیں۔ ارے تو تو پگلا ہی ہے۔ فوجی کہیں روتے ہیں بھلا؟

اور لفظ "فوجی" سنتے ہی میری نظروں کے سامنے ماموں جان کی بیٹھک میں لگی تصویر کا وردی پہنا ہوا مونچھوں والا خوبصورت نوجوان، کندھے پر بندوق رکھے ہوئے آجاتا اور میں رونا بالکل بند کر دیتا جیسے میں رونا جانتا ہی نہیں۔

مومانی جان سے میں بہت ڈرتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ان کی موٹی موٹی بھیانک آنکھوں سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اور ان کی یہ عادت ہو گئی تھی کہ جب میں ان کے سامنے جاتا تو وہ خواہ مخواہ ہی بڑبڑانے لگتیں۔ اور پتہ نہیں کس کو گالیاں دینے لگتیں ——— جب وہ کسی بات پر مجھے ڈانٹتیں تو میں زینب آپا کے پیچھے چھپ جاتا اور ان کا لٹکتا ہوا دوپٹہ اپنے سر پر سے ڈال کر جہاں تک ممکن ہو سکتا اپنے آپ کو چھپا لیتا ———

اب گرمیاں ختم ہو چکی تھیں۔ ہر وقت آسمان پر گھٹا چھائی رہتی اس لیے دھابے پر چڑھنا بند ہو گیا۔ پہلی ہی بارش میں دھابے کی منڈیر کی سوکھی گھاس کی جگہ ہری ہری گھاس نکلنا شروع ہو گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی کچھ سفید کچھ بھورے بھورے سے چھتری کی دار پودے بھی جگہ جگہ نظر آنے لگے تھے۔ ایک روز میرے پوچھنے پر زینب آپا نے بتایا تھا کہ ان پودوں کو کتے کا موت کہتے ہیں ——— گھٹائیں ہمیشہ ہی کالی یا بہت زیادہ بھوری رہتیں، لیکن جو پانی زمین پر آتا وہ ہمیشہ ہی کانچ کے جیسا صاف ہوتا میں یہی سوچتا رہتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے اور بجلی تو بڑی حیرت انگیز چیز ہوتی ہے۔ میرا جی بار بار چاہتا کہ اس کو کسی طرح پکڑ سکوں لیکن وہ تو ذرا سی دکھنے کے بعد آنکھوں کو چندھیا کر اوجھل ہو جاتی۔ اس کی کڑک سے میں بہت گھبراتا۔ دن میں تو خیر لیکن رات میں بہت زیادہ ڈر لگتا تھا۔ میں روزانہ زینب آپا کے ساتھ ہی سوتا اور جب بادل گرجتا تو جلدی سے آپا کے لپٹ جاتا۔ اور وہ بھی مجھے کس کے چپٹا لیتیں شاید وہ بھی اس گرج سے ڈرتی تھیں۔ جب بھی میں ان کے سینے سے لگتا تو مجھے بہت اچھا محسوس ہوتا۔ جیسے وہ نرم نرم روئی کا تکیہ جو ماموں جان کے پلنگ پر ہی رہتا۔ ان کے پلنگ پر چڑھنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ میں نے بس ایک ہی بار تو اس تکیے کو چھوا تھا۔ میرا جی چاہتا کہ زینب آپا سے کبھی الگ نہ ہوں۔

کئی دن گذر گئے اب امی کی یاد بھی نہیں آتی تھی۔ پھر بہت سے مہمان آنا شروع ہو گئے

اور ایک دو روز ہی میں سارا گھر بھر گیا، بلکہ پچھواڑے کی کوٹھری جس میں بھوسا بھرا رہتا تھا جو بیلوں کے کوٹھے سے بالکل لگی ہوئی تھی، اس کو بھی صاف کر کے لوگوں کے ٹھہرنے کے لیے جگہ کر دی گئی، ان مہمانوں میں بہت سے میرے ہم عمر بچے بھی تھے۔ اور میں پہلی بار دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا میری بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنے مہمان کیوں آ رہے ہیں۔ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکا۔ رشید بھائی بھی بہت مصروف تھے، انور بھائی اور ماموں جان بھی اپنا حقہ چھوڑ کر ادھر سے اُدھر دوڑتے رہتے۔ اور زینب آپا کے پاس ہمیشہ ہی مہمان عورتوں کا جمگھٹا رہنے لگا۔ لیکن میں بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ مجھے دوسرے نئے نئے اچھے دوست مل گئے تھے رفیق، اسلم اور مریم جیسے دوست ―― رفیق کاغذ کے ہوائی جہاز، ناؤ، موٹر، بندر سے اور بہت سے کھلونے بنا بنا کر مجھے دیتا۔ اور اسلم بہت بہادر تھا۔ اس نے کہا تھا "رجو اگر تیرے کو کوئی مارتا ہے تو میرے کو بول، میں سالے کی منڈی توڑ دوں گا۔" میں اس سے بہت متاثر ہوا تھا، میں نے اس سے پوچھا تھا

"اسلم! کیا تو کبھی روتا نہیں؟"

"اپن کیا چھوکری ہے ―― چھوکریاں اچ روتے ہے۔"

"تو پھر تو بھی فوجی بن جائے گا" میں نے اس کو دلاسہ دیا۔ وہ بولا

"ہو۔ اپن کے پاس تو بندوق بھی ہے ―― تو میرے گھر چلے گا تو تیرے کو بھی بندوق چلانا سکھا دوں گا۔" اور فخر سے ہاتھ اٹھا کے کہتا "اپن تو بمبئی کا رہنے والا ہے ۔۔۔۔۔" اور میں خوش ہو کر کہتا

"ہاں! ضرور چلوں گا ―― میں نے تو بندوق دیکھی بھی نہیں۔"

اور مریم ―― وہ بہت اچھی تھی، چھوٹی سی خوبصورت، جیسے پکی ہوئی لال لال گوندنی، میں اس کو چن چن کر گوندنیاں دیتا۔ اور وہ توتلی زبان میں میٹھی میٹھی باتیں کرتی اس کی باتیں سن کر بڑا مزا آتا۔ جیسے پکی ہوئی گوندنی کھانے کے بعد مزا آتا ہے۔ اور مریم کو میں اپنا گھروندا بھی دکھاتا جو زینب آپا نے بیلوں کے کوٹھے میں بنایا تھا۔ بارش میں زینب آپا اور میں، اس گھروندے میں کھیلتے تھے، میں مریم سے کہتا۔ وہ کوٹھا بالکل خالی

پڑا رہتا تھا۔ اس میں بس چاروں طرف دیوار کے سہارے لکڑی کے کھونٹے گڑے ہوئے تھے۔ جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں اس کوٹھے میں بہت سی گائیں، بھینسیں اور بیل باندھے جاتے ہوں گے۔ اب تو صرف ان کے گوبر کی دھیمی دھیمی سی بدبو کوٹھے کی فضا میں بسی ہوئی تھی، وہ گھروندا بہت اچھا بنا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ زینب آپا نے کہا تھا۔ "رجّو! جب میں چلی جاؤں گی تو تو اسی گھروندے میں کھیلا کرنا۔" میں نے حیرت سے پوچھا تھا "آپا تم کہاں چلی جاؤ گی؟" لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ گھروندا میں نے صرف مریم کو ہی دکھایا تھا۔ رفیق اور اسلم کو اس لیے نہیں کہ کہیں وہ جل کر توڑ نہ ڈالیں۔

اب میں ان ہی بچوں کے ساتھ سونے لگا۔ مہمان روزانہ بڑھتے ہی رہے ایک دفعہ زینب آپا نے مجھے بلا کر اپنے پاس بٹھایا تھا۔ اور بہت پیار کیا تھا۔ اتنا کبھی نہیں کیا تھا۔ جیسے ان کو پھر پیار کرنے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ وہ نئے نئے کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ اور ان کے جسم سے بڑی پیاری خوشبو آرہی تھی۔ میں نے دیکھا تھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو کے قطرے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"آپا تم کیوں رو رہی ہو؟"

"تو نہیں سمجھے گا ——" انھوں نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر کہا تھا "تو ابھی بہت چھوٹا ہے ——، دیکھ تیری امّی آنے والی ہیں۔ شاید کل آجائیں گی" اور میں خوش ہو گیا تھا۔ زینب آپا کو نہ جانے کیا ہو گیا کہ وہ روتی ہی رہی تھیں۔ میں نے چاہا بھی کہ ان کو سمجھاؤں لیکن کس طرح میری خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پوچھے اور باہر بھاگ گیا —— پھر میں اس کل کا بہت بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ میں نے اپنے سارے دوستوں سے کہہ دیا کہ "کل میری امّی آنے والی ہیں" اس روز مومانی جان نے خود اپنے ہاتھوں سے مجھے نہلایا۔ اور نئے کپڑے پہنائے اور تھوڑا پیار بھی کیا۔ شاید پہلی بار —— پھر کل آگیا۔ صبح ہوئی۔ دوپہر ہوئی۔ میں گلی کے موڑ تک اپنے دوستوں کے ساتھ جا جا کر دیکھتا رہا —— پھر شام بھی ہو گئی لیکن امّی نہیں آئیں۔ دوسرے ہی مہمان آتے رہے۔ میں نے پھر رات میں زینب آپا سے جا کر پوچھا "امّی تو نہیں آئیں"؟

"نہیں" انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تیری امّی نہیں آئیں گی، انھوں نے خط میں لکھ دیا ہے کہ وہ کسی وجہ سے نہیں آسکتیں، مجھے بلایا ہے ——— تیرے نئے ابّا تجھے اپنے پاس رکھنے کے لیے راضی ہو گئے، وہ کچھ دنوں بعد آ کے تجھے لے جائیں گے" شاید اب بھی آپا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ لیکن چراغ کی دھیمی روشنی میں میں دیکھ نہ سکا۔

"نہیں میں نہیں جاؤں گا ——— میں تو تمھارے ہی پاس رہوں گا۔ ہے نا آپا؟"

لیکن جواب میں آپا کی گھٹی گھٹی سی ہچکیاں ہی نکلتی رہیں ——— "لڑکیاں تو روتی ہی ہیں" یہ سوچ کر میں وہاں سے چلا گیا۔

دوسرے روز باجے بجنے شروع ہوئے، بچے خوب شور مچاتے رہے۔ میں بھی ان کے ساتھ اچھل کود میں شریک تھا۔ پھر میں نے سنا کہ بہت سے لوگ کہہ رہے ہیں "برات آگئی ——— برات آگئی" دن بھر باجے بجتے رہے۔ سہ پہر کے وقت ایک آدمی پھولوں سے منھ چھپائے، سجے ہوئے گھوڑے پر بیٹھ کر بہت سے لوگوں کے ساتھ آیا۔ آگے صحن میں جہاں دو تین روز پہلے ہی بلیاں گاڑ کر آم کے ہرے ہرے پتوں سے "منڈوا" بنایا گیا تھا۔ اور ایک بلّی کے سہارے تین مٹی کے نئے گھڑے پانی سے بھر کر ایک کے اوپر ایک رکھ دیے تھے، اور ان میں لال پیلے دھاگے باندھ دیے گئے تھے۔ وہاں دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ اور ایک جگہ گدّے پر سفید ریشمی چادر بچھی تھی اس پر وہ پھولوں میں چھپا ہوا آدمی بیٹھ گیا۔ اس کی کمر سے لال کپڑے میں بندھی ہوئی کوئی چیز لٹک رہی تھی۔ اسلم نے بتایا تھا کہ اس کو "کٹار" کہتے ہیں۔ پھر ایک لمبی سی ڈاڑھی والے مولانا جانے کیا کیا پڑھتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد تالیاں ایک دم بجنی شروع ہوئیں اور چھوہارے اچھالے گئے۔ اسلم نے تو جھپٹ کر ایک لے لیا۔ لیکن میرے ہاتھ ایک بھی نہ آیا۔

شام کو سارے لوگوں نے اسی منڈپ میں بیٹھ کر ایک ساتھ کھانا کھایا۔ ان میں گاؤں کے بھی بہت سے لوگ تھے۔ بہت سی گیس کی بتیاں جل رہی تھیں، جن سے اندھیرے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا، شاید رات بہت ہو گئی تھی، لیکن مجھے آج نیند نہیں آ رہی تھی۔ اتنے اچھے اچھے کھانے پکے لیکن میں نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ شاید خوشی کی وجہ سے ——— کچھ دیر کے بعد

گھر سے عورتوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کیوں رو رہی ہیں۔ پھر اسلم کا وہ جملہ یاد آگیا۔ "لڑکیاں تو روتی ہی ہیں" اور عورتیں بھی تو بڑی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ اور زینب آپا کو لال چادر اڑھا کر باہر لایا جا رہا تھا۔ باہر بیل گاڑی جس پر پردے پڑے ہوئے تھے، تیار کھڑی تھی، میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ ایک روز امی بھی تو ایسی ہی گاڑی میں گئی تھیں —— زینب آپا کو گاڑی میں چڑھا دیا گیا۔ اور ایک دم میری سمجھ میں آگیا۔ بے اختیار میری چیخیں نکلنے لگیں اور میری آنکھوں سے آنسو کی دھاریں پھوٹ پڑیں جیسے کبھی کبھی دھوپ میں اچانک بارش برسنے لگتی ہے۔ میں بھاگ کر زینب آپا کے قریب پہنچ گیا۔ زینب آپا کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں تھیں، انھوں نے مجھے گلے سے لگا کر میرے آنسو پونچھتے ہوئے بڑی مشکل سے آہستہ سے کہا

"رو مت ربو! —— میرے —— راجہ!" لیکن میں مستقل رو رہا تھا کہ امی کی طرح آج آپا بھی مجھ سے جدا ہو رہی تھیں۔ "تو —— تو فوجی —— بنے گا —— نا، فوجی کہیں روتے —— ہیں بھلا" لیکن مجھ پر اب اس جملے کا کوئی اثر نہیں ہوا، زینب آپا نے مجھے گلے سے لگا رکھا تھا، پھر رشید بھائی نے آکر مجھے پیار سے اتارنا چاہا۔ لیکن میں زینب آپا سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ آپا نے پھر آہستہ سے کہا

"مت رو ربو! جا —— تجھے تیرے ابا لینے کے لیے آجائیں گے۔ تو بہت جلد اپنی امی کے پاس چلا جائے گا۔" اور رشید بھائی نے زبردستی مجھے گاڑی سے کھینچ لیا۔ اور میرے ہاتھ میں زینب آپا کا آنچل کھنچتا چلا آ رہا تھا۔ اترتے اترتے زینب آپا نے میرے ہاتھ سے اپنا آنچل چھڑا لیا اور میرے الٹے ہاتھ پر تھوڑا تھوڑا کر کے تھوڑا سا تھوک دیا —— اور یہ گاڑی بھی آگے جا کر اندھیروں میں کہیں گم ہو گئی ——

محمد طارق

۱۵- ممتاز ہاؤس
آفتاب ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"کوئی اور"

دیوار پر لگے گھنٹے نے جب آدھی رات گذر جانے کا اعلان کیا تو سُدھا نے پلکوں کو اس طرح پھڑ پھڑا کر آنکھیں کھولیں جیسے اُن پر رکھے بھاری پتھروں کو ڈھکیلا ہو۔ پھر وہ ٹکٹکی باندھے سامنے نما دیوار کو گھورنے لگی، روزانہ کی طرح آج بھی اس کی کپکپاتی ہوئی نظریں دیوار میں لرزش محسوس کر رہی تھیں۔ "دیوار کمزور کیوں ہے؟" یہ روزانہ کیوں ہلتی ہے؟ کیا یہ مضبوط نہیں ہو سکتی؟" یہی سوالات ہر روز اس کے ذہن سے سانپ کی طرح سرسراتے ہوئے نکل جاتے اور اس کے وجود میں خشک لہر سی دوڑ جاتی باہر کسی کے قدموں کی آہٹ کو پہچان کر وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی، ٹیبل لیمپ کا سوئچ آن کر کے دروازہ کھولا۔ سنجے دروازے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ "ابھی تک جاگ رہی ہو سدھا؟" سنجے نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے رسمی سوال کیا! "بس یونہی، آپ کا انتظار کر رہی تھی" اور وہ کچن میں جا کر کھانا اتارنے لگی۔ سُدھا نے کھانا میز پر لگا دیا۔ سنجے نے پوچھا "تم نے کھانا کھا لیا!" سنجے جانتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہی کھانا کھاتی ہے پھر بھی کھانے سے پہلے اس کا اکثر یہی سوال کرنا سُدھا کو اچھا نہیں لگتا تھا ـــــ سدھا نے نوالہ بنا کر مسکراتے ہوئے سنجے کے منہ میں رکھ دیا اور پھر کچھ اس انداز سے اُسے تکنے لگی مانو اس کے ہاتھ سے کھانے کا انتظار کر رہی ہو۔ مگر سنجے نے جلدی جلدی تین چار نوالے کھائے اور "مجھے بھوک نہیں ہے" کہکر بستر پر جا لیٹا ـــــ سدھا بھی ٹیبل لیمپ بجھا کر اس کے برابر لیٹ گئی اور اس دیوار کو گھورنے لگی جو ہمیشہ اُسے

لرزتی ہوئی نظر آتی ہے اور آج تو دیوار کچھ زیادہ ہی ہل رہی تھی پھر سدھا کو اس میں ایک دراڑ سی پڑتی ہوئی نظر آئی تو وہ کانپ گئی اور سنجے سے چپٹ کر رونے لگی "سنجے تم اتنا کیوں بدلتے جا رہے ہو" شادی سے پہلے ہی تو تمھیں سب کچھ.......نہیں سدھا یہ بات نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے، تم خواہ مخواہ غلط سمجھ رہی ہو" سنجے نے سدھا کی بات کاٹتے ہوئے کہا !

"اگر میں تمھارے قابل نہیں تھی تو......"

"سدھا —— ایسا مت کہو، سب ٹھیک ہو جائے گا" سنجے کی ایسی ہی تسلیوں کے سہارے تو وہ اب تک جی رہی تھی۔ سدھا کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں مگر سنجے کی آنکھیں جیسے پتھرا گئی تھیں اس نے کئی بار اٹھ کر سدھا کی آنکھوں کو چومنا چاہا مگر اسے کوئی طاقت پیچھے کی طرف کھینچتی اور وہ پھر بستر پر ڈھیر ہو جاتا۔

آج دفتر کے کسی کام میں سنجے کا دل نہیں لگ رہا تھا اس کا دل چاہتا کہ جلدی سے چار بجیں اور وہ ایک خوبصورت سی ساڑی لیکر گھر پہونچے، آج پھر کتنے پیار سے سدھا نے ساڑی کی فرمائش کی تھی —— کتنی معصوم لگ رہی تھی جب اس نے پوچھا تھا آپ آفس سے کس وقت لوٹیں گے !"

"کیوں —— کوئی کام ہے کیا ؟"

"کیا مجھے یہ پوچھنے کا بھی حق نہیں" —— آخر میں تمھاری بیوی ہوں !" سدھا کے لہجے میں معصوم سی سختی تھی۔

"ارے آپ تو ناراض ہو گئیں، میں نے تو یونہی پوچھ لیا، کوئی چار بجے تک لوٹ آوں گا" سنجے نے بات کو سلجھاتے ہوئے کہا تھا، سدھا نے التجا بھری نظروں سے سنجے کو دیکھا "دیکھیے میں کب سے ایک ساڑی کی فرمائش کر رہی ہوں، مگر آپ روزانہ بھول جاتے ہیں......"

پھر اس کی ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتے ہوئے بولی "آج ضرور لیتے آیئے گا —— لائیں گے نا ؟ اس کے لہجے میں ایک سمجھدار بچے کی سی ضد گھلی ہوئی تھی۔

"مگر تمہارے پاس تو بہت سی ساڑیاں ہیں . . . ."
سُدھا کہنا چاہتی تھی ــــ "سنجے تم نہیں جانتے' بیوی شوہر کی لائی ہوئی چیز کو دیکھ کر کتنا خوش ہوتی ہے' میرے پاس ہزار ساڑیاں سہی مگر شادی کے بعد تمہارے ہاتھ سے خریدی ہوئی ایک بھی تو نہیں ہے" ہر عورت کی طرح میرا بھی دل چاہتا ہے کہ تم میرے لیے کوئی چیز خرید کر لاؤ اور میں چار دوستوں میں بیٹھ کر کہوں کہ یہ تم نے مجھے لا کر دی ہے"
ــــ مگر وہ یہ سب کہہ نہ سکی اور چائے کی پیالی میں شکر گھولنے لگی اس کے اندر کا سب کچھ بھی اس کے ساتھ ہی گھل گیا۔

سنجے آفس کی کرسی پر بیٹھا خود پر ملامت کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ سُدھا جیسی معصوم اور پیار کرنے والی بیوی قسمت سے ہی ملتی ہے۔ آج ضرور وہ ایک خوبصورت سی ساڑی لیکر گھر پہونچے گا۔ سُدھا روزانہ کی طرح دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہوگی تب وہ ساڑی دیکھے گی تو خوشی سے ناچ اُٹھے گی اور آج سے شاید ہماری تلخ زندگی خوشحال زندگی میں بدل جائے گی !!

چار بجے دفتر سے نکل کر ایک ساڑی کی دوکان پر جا کر ' ہرے رنگ کی ایک ساڑی پسند کی اور اسے لیکر تیز تیز قدموں سے بس اسٹاپ کی جانب چلنے لگا۔ بس کا انتظار کرنے والوں کی لائن آج اسے بہت لمبی لگ رہی تھی بس دیر تک نہیں آئی مگر ہر آدمی مطمئن تھا شاید کسی کو گھر جانے کی جلدی نہیں تھی۔ سنجے اکتاہٹ کے لہجے میں بار بار بڑبڑانے لگتا۔ "بس والے بھی اپنی مرضی کے ہوتے ہیں کم بخت وقت سے چلتے ہی نہیں۔ لائن میں کھڑے لوگ اس کی اس بے چینی کو دیکھ کر مسکرا دیئے ــــ اب اسے دور سے ایک بس آتی ہوئی نظر آئی وہ بڑھ کر سب سے آگے پہنچ جانا چاہتا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک آواز نے اسے چونکا دیا ــــ "تم ہری ساڑی میں بہت اچھی لگتی ہو" اس نے مڑ کر دیکھا ہری ساڑی ملبوس ایک عورت اور ایک آدمی جو غالباً اس کا شوہر تھا کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے ــــ ہری ساڑی' خوبصورت عورت' اور اس کا شوہر جو ہری ساڑی میں ملبوس عورت کی تعریف کر رہا تھا ــــ سنجے کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے

لگیں، اس کا دم گھٹنے لگا۔ جیسے اس کے دل کی دھڑکنیں تھک کر رک جانا چاہتی ہیں ــــ
اس کے پیر کپکپائے اور پھر اسے محسوس ہوا کہ اس کے پیر پتھر ہو گئے ہیں۔ اب اس کا پورا جسم پتھر ہو گیا تھا ــــ دل و دماغ آخر پتھر کیوں نہیں ہو جاتے، وہ اس حالت میں اکثر یہی سوچتا ــــ اب اس کا ذہن سُدھا کے ماضی کے ارد گرد گھوم رہا تھا اسے یاد آیا ایک بار اس نے سُدھا سے پوچھا تھا ــــ "اچھا یہ بتاؤ سُدھا تمھارے پہلے شوہر راکیش کو تمھاری کون سی چیز پسند تھی ــــ؟" سُدھا اس سوال سے پریشان ہو گئی تھی ــــ
"آپ راکیش کے بارے میں آخر کیوں پوچھتے رہتے ہیں، وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے میں اسے بھول چکی ہوں اب تو آپ ہی میرے سب کچھ ہیں، میرے دیوتا... میرے بھگوان ......" اِندر بنسے ہنسنے لگا ــــ "میں نے تو تم پر اپنا حق سمجھ کر یونہی پوچھ لیا اگر تم نہیں بتانا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے ــــ"

"نہیں سچ تمھیں پورا حق ہے پوچھنے کا ــــ"

"پھر تم کچھ بتانے سے کیوں کتراتی ہو ــــ"

سُدھا نے ہلکی سی مسکراہٹ گھلے ہوئے لہجے میں کہا ــــ "میں کہاں کتراتی ہوں جب بھی کچھ بتاتی ہوں تم ہی کچھ عجیب سے ہو جاتے ہو ــــ"

"نہیں سُدھا..... یہ تمھارا وہم ہے ــــ"

بات کو ختم کرنے کے لیے سُدھا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا ــــ "اکثر راکیش کہا کرتا تھا کہ مجھ پر ہری ساڑی بہت اچھی لگتی ہے ــــ"

وہ سُدھا جو حاصل کرنے سے پہلے اس کے لیے سب کچھ تھی آج اس کا وجود راکیش کی چتا کے ساتھ جلے ہوئے راکھ کے ڈھیر کی طرح تھا ــــ پہلے جب وہ سدھا کے منہ سے پیار بھرے جملے سنتا تو اسے اپنے کچھ ہونے کا احساس ہونے لگتا تھا۔ مگر آج اسی پیار کو جیسے کوئی اور بیچ میں ہی لپک لیتا ہے۔ جب بھی وہ اسے پیار کرتی ہے اسی کے انتظار میں دروازے پر کھڑی رہتی ہے تو جانے کیوں اسے اپنے ہونے کا احساس ختم ہو جاتا ہے ــــ
وہ خود کو راکیش کے روپ میں پاتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ "یہ پیار اُسے نہیں راکیش کو

کیا جا رہا ہے!" یہ خیال اس کے وجود کو جھلسا دیتا اس کے سینے میں کرب کی لہریں اُٹھنے لگتیں، دل پسلیوں سے باہر نکل جانے کی کوشش میں زور زور سے دھڑکنے لگتا، اس کا رویّہ بھی بدل جاتا، دماغ چڑچڑا ہو جاتا، بات بات پر سُدھا کو عجیب عجیب طعنے دینے لگتا سُدھا کی ہر بات اسے زہر لگتی اس کی محبت بھی باسی اور گھناؤنی محسوس ہوتی اور وہ اپنے کاندھوں پر راکیش کی ارتھی کا بوجھ محسوس کرتا ــــــ

کئی بسیں گذر گئیں مگر وہ خیالات میں گم ہری ساڑی کا پیکیٹ ہاتھ میں لیے یوں ہی پتھر بنا کھڑا رہا ــــ اس نے محسوس کیا کہ راکیش ایک خوبصورت اور بہت قیمتی ہری ساڑی لیے بس اسٹاپ پر کھڑا سوچ رہا ہے کہ سُدھا اتنی قیمتی ساڑی دیکھ کر بہت خوش ہو گی اور پھر وہ ہری ساڑی بہت پسند کرتی ہے، کیوں نہ کرے گی، اُسے بھی تو وہ ہری ساڑی میں بہت اچھی لگتی ہے ــــ جب وہ اسے ہری ساڑی دے گا تو وہ خوشی میں بلکے سے اچھلتے ہوئے کہے گی ــــ "مائی گاڈ ــــ اتنی اچھی ــــ ارے واہ کتنی قیمتی ہے۔ اوہ مائی سوئیٹ راکیش جیسے ہی سنجے کو راکیش کے سامنے کھڑی سُدھا اچھلتے ہوئے نظر آئی اس کا دل بھی ایک جھٹکے کے ساتھ اچھل کر رہ گیا اور وہ سوچنے لگا کہ اس کی ساڑی راکیش کی ساڑی کے مقابلے میں سُدھا کو گھٹیا، معمولی اور بیکار ہی نظر آئے گی اور نہ ہی وہ خوشی کا احساس ہوگا جو پہلی بار راکیش کی لائی ہوئی ساڑی کو پاکر ہوا ہوگا ــــ اُس کے ہاتھ کانپنے لگے ماتھے پر شکنیں اُبھر آئیں اور اس نے پیکیٹ کو توڑ مروڑ کر سڑک کے کنارے والی جھاڑی میں پھینک دیا ــــ

روزانہ کی طرح آج بھی سُدھا اس کے انتظار میں دیوار پر نظریں جمائے بستر پر دراز تھی شادی سے پہلے کے خیالات اس کو جکڑے ہوئے تھے ــــ سُدھا کہہ رہی ہے "لیکن سنجے تم مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو؟" سنجے نے سُدھا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ــــ "سُدھا اگر تمھیں پتہ چل جائے کہ تم کیا ہو تو پھر کبھی ایسے سوال نہ کرو گی ــــ!!

مگر سنجے ...... میرا ماضی ....

اس پر سنجے تقریباً چیخ اُٹھا تھا ــــ ماضی ــــ ماضی .... ماضی سے مجھے کیا لینا

میرے سامنے تو اس وقت میری سدھا اور صرف میری سُدھا ہے ـــــ" اور وہ سمجھی تھی کہ سچ مچ سنجے کو اس کے ماضی سے کیا لینا ہے۔

سنجے کے دستک دی تو سُدھا نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا، سنجے حسبِ معمول دروازے پر کھڑا مسکرا رہا تھا، اس کے ہاتھ خالی دیکھ کر سُدھا نے نہ جانے کیا سمجھتے ہوئے اس سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی، سنجے نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور دیر تک اس کی زلفوں کی مہک سانسوں کے ذریعے اپنے وجود میں اُتارتا رہا، سُدھا کی سسکیاں رکنے لگیں تو سنجے نے کہا ـــــ "مجھے معاف کر دو ـــــ آج بھی میں تمھارے لیے ساڑی نہ لا سکا ـــــ"

سدھا کی آنکھوں سے پھر ایک بار آنسو بہنے لگے اور سنجے اپنی انگلیوں کے پوروں میں اس کے رخساروں پر بہتے ہوئے سمندر کو جذب کرنے کی کوشش کرتا رہا ـــــ سُدھا آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی اٹھی اور کچن میں جا کر کوئی چیز تلنے لگی ـــــ تلنے پر سنجے کو یاد آیا کہ اس دن جب سُدھا کچن میں اس کے لیے پوریاں تل رہی تھی تو وہ بہت خوش تھا اس نے سُدھا کا پسندیدہ سوٹ پہن رکھا تھا ـــــ ٹائی باندھتے وقت پانچ ٹائیوں کو باندھ کر اتارا اور پھر آخر میں قمیص سے میچ کرتی ہوئی چیک کی ٹائی باندھی جوتے پر پالش بھی کچھ زیادہ ہی چمک رہی تھی، ناشتے کے انتظار میں کرسی پر بیٹھا بے سُر تال میں کھانے کی میز کو طبلا سمجھ کر پیٹے جا رہا تھا، سدھا مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آئی اور اس کی پلیٹ میں پوریاں اتارنے لگی، اس نے سُدھا کے پیٹ میں کس کر چٹکی لی ـــــ سُدھا کے منہ سے ایک میٹھی چیخ نکل پڑی اور وہ کھِل کھِلا کر ہنسنے لگی، اس نے سُدھا کو چھیڑنے کے لیے کہا ـــــ "سُدھا تم جب ہنستی ہو تو بالکل چڑیل لگتی ہو ـــــ"

"اچھا ـــــ آپ کیا لگتے ہیں" ـــــ سدھا فوراً بول پڑی

"میں ـــــ؟" وہ اپنی ٹائی سنبھالتا ہوا کھنکھارنے لگا ـــــ

سُدھا جسے مذاق کرنے کے بہت کم مواقع فراہم ہوتے تھے اس کا منہ چڑاتے ہوئے بولی "کبھی آئینہ دیکھا ہے آپ نے؟ اگر نہ دیکھا ہو تو ڈریسنگ ٹیبل میں فل سائز آئینہ لگا ہے جا کر دیکھ لیجیے اور ذرا اپنا قد بھی ملاحظہ فرمائیے گا ـــــ"

اس نے اپنے پانچ فٹ پانچ انچ کے قد پر نظر ڈالی اور قہقہہ لگاتے ہوئے بولا ـــــــ
"اچھا تو یہ بتاؤ اس کا قد کتنا تھا"
سدھا نے پوچھا "کس کا راکیش کا ـــــــ؟"
سدھا کا یہ سمجھ جانا کہ "اس کا" راکیش کے لیے کہا گیا ہے اسے کچھ اچھا نہیں لگا اور جانے کدھر سے اس کے دل میں یہ بات آگئی کہ آج بھی سدھا کے خیالوں میں راکیش بسا ہوا ہے ـــــــ مگر سدھا مزاق کی رو میں بے ساختہ بول پڑی ـــــــ "بس فٹ تھا راکیش ـــــــ پورا چھ فٹ" ـــــــ
وہ کچھ دیر تک کھسیانی ہنسی ہنستا رہا ـــــــ مگر پھر آہستہ آہستہ اس کی ہنسی کھلی ہوئی شیشی میں رکھے اسپرٹ کی طرح اڑ گئی ـــــــ وہ اٹھا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جاکر کھڑا ہو گیا ہنسی کے گول گپوں والے آئینوں کی طرح اس آئینے میں بھی اسے اپنا قد ایک فٹ کے بونے کا قد نظر آرہا تھا کچھ دیر تک آئینہ کو دیکھتے دیکھتے وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا "اگر لمبا قد اتنا ہی پسند تھا تو پھر کسی لمبے آدمی سے شادی کر لی ہوتی!" وہ دانتوں کو کچکچاتے ہوئے لمبی لمبی سانسیں لینے لگا اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اس نے اپنی مٹھیوں کو بھینچ لیا بار بار اس کے دل میں ایک لہر سی دوڑ جاتی پھر اس کی ٹانگوں میں جنبش ہوئی اور اس نے ایک بھرپور لات آئینے پر جما دی، آئینہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فرش پر بکھر گیا ـــــــ سدھا بھی آواز سن کر وہاں پہونچ گئی اور آئینے کے ٹکڑوں کو دیکھ کر بس اتنا کہا ـــــــ سنجے یہ تمھیں کیا ہو جاتا ہے ـــــــ؟"
یہ سنکر وہ بھی بکھرے ہوئے آئینے کے ٹکڑوں کی طرح بکھر پڑا تھا، اس دن اس نے جانے کیا کیا الٹ سیدھا سدھا سے کہا تھا وہ بیچاری تین دن تک گم سم پتھر کی مورتی بنی رہی تھی ـــــــ اس دن جس رویہ سے وہ سدھا کے ساتھ پیش آیا تھا آج اس کی ملامت کر رہا تھا ـــــــ سدھا نے تلے ہوئے آلو اور پھلکے کھانے کی میز پر لگا دیے اور کھانے کے بعد دونوں بستر پر آ لیٹے ـــــــ آج کوشش کرنے کے باوجود دونوں سو نہیں پا رہے تھے، سنجے کا دل چاہتا کہ اسے اٹھا کر خوب پیار کرے، اس سے محبت بھری میٹھی میٹھی باتیں کرے کتنا خوش ہو گی سدھا ـــــــ سنجے نے اس کی دونوں باہیں پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا مگر دھم سے

بیچ میں راکیش آ کودا!! اور جو کچھ سنجے کرنا چاہتا تھا وہ سب راکیش کرنے لگا ـــــ سنجے نے اپنے ذہن کو جھنجھوڑا!! اور پھر ایک بار چاہا کہ وہ سدھا کو اٹھا کر بٹھا دے اور اس سے معافی مانگے، اسے اپنی محبت کا یقین دلائے، اسے اتنا پیار دے کہ اس کے تمام زخم پھول بن جائیں۔ مگر تب اسے خیال آیا کہ یہ سب تو راکیش برسوں پہلے ہی کر چکا ہوگا تو وہ یہ سوچ کر رک گیا کہ اس کی ان حرکتوں سے سدھا اتنا ہی اکتائے گی جتنا کہ قاری پڑھے ہوئے ناول کو دوبارہ پڑھنے میں اکتاہٹ محسوس کرتا ہے۔

سدھا کی نظریں دراڑ پڑی ہوئی دیوار پر جمی ہوئی تھیں، دیوار بہت زور سے ہلنے لگی اور پھر ایک دم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھرنے لگی ـــــ صبح ہوئی تو سدھا نے خود کو اس کمرے سے، اس گھر سے اور سنجے سے بہت دور پایا۔ وہ اپنی آنکھوں سے امنڈتے ہوئے سمندر میں بہہ کر کہیں دور جا چکی تھی۔ ناشتے کے بعد دونوں صوفے پر آ بیٹھے۔ سدھا کچھ کہنا چاہتی ہے ـــــ سنجے کو بھی اندازہ ہو رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دو سنجے......" اس سے زیادہ کوشش کرنے کے باوجود سدھا کچھ نہ کہہ پائی اور انگلیوں سے اپنی آنکھوں کے کوروں کو خشک کرنے لگی ـــــ سنجے نے اپنا ہاتھ سدھا کی گردن میں ڈال دیا اور سوالیہ نظروں سے گھورنے لگا ـــــ سدھا نے اپنا سر سنجے کے سینے سے ٹکا دیا اور اپنی گردن میں اس کے جھولتے ہوئے ہاتھ کو پکڑ کر بولی ـــــ "میں جا رہی ہوں سنجے......... ہمیشہ کے لیے......"

"مگر کہاں......؟"

"کہیں بھی...... تمھاری زندگی سے بہت دور......"

"مجھے اکیلا چھوڑ کر......" سنجے نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے وہ اس سے کہلوانا چاہتا ہے ـــــ "نہیں سنجے.... میں تمھیں اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔ میں تمھاری ہوں اور ہمیشہ رہوں گی" ـــــ مگر سدھا نے ایسا کچھ نہیں کہا اور وہ روندھی ہوئی آواز میں بولی ـــــ

"ہاں.... مگر تمھارے ہی بھلے کے لیے ـــــ میری وجہ سے تمھیں بہت دکھ پہنچا ہے نا ـــــ"

"سدھا تم یہ کیسی باتیں کر رہی ہو ـــــ"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں سنجے ـــ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم میرے ساتھ رہ کر کبھی سکھی نہیں رہ پاؤ گے ـــ دیکھو اپنا پورا خیال رکھنا ـــ اور ہاں صبح تجھے والی بوا جی آئیں تھیں میں نے کہہ دیا ہے کہ کل سے وہ کھانا بنانے آجائیں گی، کل بجلی کا بل آیا تھا میں نے آپ کی دراز میں رکھ دیا ہے جلدی ہی جمع کر دینا، کہیں کنکشن نہ کٹ جائے"، ایک لمحے کے لیے سُدھا رُکی تو سنجے کو محسوس ہوا کہ بل جمع کرنے میں دیر ہو گئی ہے اور کنکشن کٹ چکا ہے ـــ سُدھا اپنے اندر کی تمام قوت کھو چکی تھی مگر کوئی ایک طاقت تھی جو یہ سب کہنے میں اس کی مدد کر رہی تھی۔ وہ پھر کہنے لگی ـــ "دودھ والے کے بائیس روپیہ ہو گئے ہیں مانگ رہا تھا مگر میرے پاس کچھ کم تھے اس لیے میں نے تین چار روز میں دینے کو کہہ دیا ہے، کل دھوبی بھی آیا تھا، کہہ رہا تھا کہ بارش کی وجہ سے کپڑے تیار نہیں ہو پائے ہیں بدھ کو لیکر آئے گا اس بار بارہ کپڑے ہیں گن لیجیے گا ـــ اور آپ کی نیلی قمیص جو مجھ سے پریس کرتے میں جل گئی تھی وہ کونے والے رفوگر کے یہاں ہے پرسوں دینے کا وعدہ ہے ـــ" اب سُدھا کی آنکھیں بالکل خشک تھیں ان میں آنسوؤں کا ایک بھی قطرہ نہیں تھا شاید وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہی اس کے آنسو تھے ـــ سنجے نے اسے اپنے آغوش میں کچھ اس طرح چھپایا جیسے کوئی اُس کی سُدھا کو چھین کر لیجانا چاہتا ہے اور وہ کسی بھی قیمت پر اسے چھوڑنے کو تیار نہیں۔ لیکن ایک ہی لمحے بعد اس نے محسوس کیا کہ اسکے آغوش میں سُدھا نہیں ایک راکھ کا ڈھیر ہے۔ سُدھا کی کراہتی ہوئی نظریں کمرے میں بکھر گئیں، وہ اُٹھی اور الماری سے اپنے کپڑے نکال کر سوٹ کیس میں رکھنے لگی، سنجے اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا ـــ سُدھا نے اپنے تمام کپڑے سوٹ کیس میں رکھ کر الماری کی چابی کپکپاتے ہاتھوں سے سنجے کو تھما دی اور خود نہانے کے لیے باتھ روم چلی گئی۔

نہانے کے بعد آج سُدھا نے ہری ساڑی پہنی تھی، ہری ساڑی میں ملبوس سُدھا سوٹ کیس لیے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی ـــ سنجے بھی اسٹیشن تک آیا تھا۔ جب وہ سوچتا کہ سُدھا جا رہی ہے، اکیلی، بالکل اکیلی، اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر تو اس کا جی چاہتا کہ وہ سب کچھ بھول جائے اور اسے روک لے مگر پھر جانے کیوں اسے محسوس ہوتا کہ سُدھا اکیلی نہیں اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے ـــ چلتے وقت سنجے نے اسے نوٹوں سے بھرا پرس دیتے ہوئے بس اتنا کہا ـــ "سُدھا انکار مت کرنا" ـــ اب

مسلم سلیم

کپڑے کی ٹانگیں

دوکان کے اوپر ٹیوب لائٹس میں لکھا تھا: "وسنتر لوک" یہ شہر میں کپڑوں کی ایک مشہور دوکان تھی جو سرمایہ داروں کی دل پسندی اور مہنگے اور خراب ملبوسات کے لیے مشہور تھی۔ وہ کافی دیر سے تذبذب کے عالم میں دوکان کے سامنے والی سڑک کے کنارے کھڑا ہوا دوکان پر سجے ہوئے ریڈی میڈ ملبوسات کو دیکھ رہا تھا۔ حالاں کہ آج اس کی جیب میں وہ خوبصورت کاغذ کے ٹکڑے بھی تھے جن سے دل کے سوا دنیا کی ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ مگر آج بھی وہ اتنی مشہور دوکان میں داخل ہونے سے جھجک رہا تھا۔

اچانک دوکان کے اندر سے قہقہوں کی بدبو کا ایک ریلہ آیا اور اسے کہیں سے کہیں بہا لے گیا۔

وہ اپنے کالج کے کمپاؤنڈ میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کے سارے کلاس فیلوز اس کا محاصرہ کیے ہوئے اس کی ڈھیلی ڈھالی اور بوسیدہ قمیص پر حملے کر رہے تھے۔

"کیوں بھئی؟ کس سے مانگ لائے یہ قمیص؟" ایک آواز

"ابا کی ہوگی" ______ دوسری آواز

"ارے بھئی! کیوں "بے چارے غریب" کا مذاق اڑاتے ہو" تیسری آواز ______

وقفہ ___ جیسے وہ ساری آوازیں اس کے چہرے پر اس گولہ باری کا ردِّ عمل دیکھ رہی ہوں۔

"ابے تو روتا کیوں ہے؟ ___ چل ___ جا ___ مان لیا ___ تیری اپنی ہی ہے۔ ایک چوتھی آواز ___ پھر ایک زوردار قہقہہ ___ ایسے نہ جانے کتنے قہقہوں کی بدبو نتھنوں میں سے ہوکر اس کے دماغ میں بس گئی تھی۔

پھر وہ دو خوبصورت لڑکیاں جو اس کی گلی میں سے گذر کر کسی کالج کو جایا کرتی تھیں اور جنہیں سے ایک کی طرف اس کا دل کھنچا چلا جاتا تھا۔ وہ جب موڑ سے نکل کر سامنے آتی تو وہ ایک گھر کے سامنے لگے ہوئے پتھر پہ بیٹھ کر اس کو تکنے لگتا تھا۔ مگر جب وہ دونوں لڑکیاں اس کے پاس سے گذرتی تھیں تو ایک نظر اس کے چہرے اور ایک نظر کپڑوں پر ڈال کر اس طرح مسکراتی تھیں جیسے اس کو اس کے صحیح مقام کا احساس دلاتی ہوں اور اس دیدار کا کلائمکس ہمیشہ ایک ٹھنڈی آہ ثابت ہوتا۔

اس کے وہ عزیز جن کے یہاں وہ پناہ گزیں تھا کبھی کبھی کوئی خاص چیز لینے CIVILLINES بھیجتے تھے۔ جب وہ کسی دوکان میں داخل ہوتا تو دوکاندار اس کو اس طرح دیکھتا جیسے وہ کچھ چرا کر دوکان سے بھاگ جائے گا۔

دوکان کے اندر سے ایک اور قہقہے کی آواز نے اس کو بیدار کر دیا۔ اس نے گھبرا کر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ اس وقت بھی وہ سر سے پیر تک اترن کے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ پینٹ اپنے ایک دوست سے مانگ کر لایا تھا۔ قمیص اس کے ایک خالہ زاد بھائی کے رحم و کرم کا نتیجہ تھی اور جوتے اس کے دور کے ایک عزیز کے انتقال کے بعد ورثہ میں پہنچے تھے۔

آج وہ اترن کے اس جال کو توڑنے جا رہا تھا۔ اسے خوب معلوم ہو گیا تھا کہ کپڑے کی اہمیت کیا ہوتی ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دنیا میں کوئی شخص دوسرے شخص کی بات نہیں سنتا اور نہ اس کو دیکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے لباس کو دیکھ کر اس کی شخصیت کو پہچانتا ہے۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر ارسطو اور افلاطون بھی آج کے دور میں ہوتے تو ہر شخص ان کی ہئیت کو دیکھ کر ان کو پاگل قرار دے دیتا۔ اسی لیے اس نے بڑی مشکل سے پیسہ پیسہ بچا کر ۴۰-۵۰ روپے جمع کیے تھے۔ ضرورتیں اور بھی تھیں مگر ان پر قہقہے نہیں لگتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ریڈی میڈ کپڑوں کا ایک جوڑا لیے ہوئے دوکان سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ ساری دنیا کو دکھا دینا چاہتا تھا کہ آج سے وہ

انسانیت کی حدود میں داخل ہو گیا ہے۔ اس کو بولنے کا حق مل گیا ہے۔ اس کو کالج میں بے خوف ہو کر تعلیم حاصل کرنے کا حق مل گیا ہے۔ اور یہ کہ اس کو ایک خوبصورت دلربا کے التفات کا حق مل گیا ہے۔

گھر پہنچکر اس نے بڑی شفقت سے کپڑوں پر ہاتھ پھیرا۔ سینے اور آنکھوں سے لگایا اور بسم اللہ وغیرہ پڑھ کر زندگی میں پہلی مرتبہ انسان بننے کے خوبصورت سانحے سے دوچار ہوا۔ پہلے محلے کا ایک گشت لگایا۔ پتہ نہیں سب کہاں مر گئے تھے۔ چنانچہ وہ سائیکل نکال کر بڑا سب سڑکوں پر گھومنے لگا۔ وہ بہت اکڑ کر سائیکل چلا رہا تھا۔ ہر شخص اس کو رشک کی نگاہوں سے گھورتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک فقیر لڑکا سڑک کی دوسری سمت چلا جا رہا تھا۔ وہ اس کے جسم کی گندگی اور لباس کی بے ترتیبی کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھ ہی رہا تھا کہ قریب سے ایک کار تیزی کے ساتھ گذر گئی اس کے اسٹیرنگ کی جانب والی کھڑکی کا تکونہ حصہ باہر کی طرف کھلا ہوا تھا۔ وہ اس کے قریب سے گذری تو اس کے مثلث نما حصے سے اس کی قمیص رگڑ کھاتے کھاتے بچی اور اس کی کئی مہینے کی محنت اکارت ہوتے ہوتے رہ گئی۔

اس نے سوچا کہ اگر اس نے بے احتیاطی سے کپڑوں کا استعمال کیا تو اس کے تمام تر بنیادی حقوق بہت جلد چھن جائیں گے۔ اس نے گھبرا کر واپس ہونے کا ارادہ کر لیا۔

وہ ہواؤں سے باتیں کر رہا تھا۔ سڑک پر بھیڑ تھی۔ یکایک دوسری سمت سے آتا ہوا ایک رکشہ اس کے بہت قریب سے گذرا۔ رکشے کی چھڑ کی کمانی باہر کو لٹکی ہوئی تھی۔ رکشہ اس کے اتنے قریب سے گذرا تھا کہ اس کے کپڑے پھٹ سکتے تھے۔ کپڑوں کو بچانے کے لیے اس نے ایک دم سائیکل موڑ دی۔ عقب سے آتے ہوئے ایک ٹرک کے بریک بہت زور سے چرچرائے مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔

ہوسپٹل میں جب اسے ہوش آیا تو اس کے دونوں پیروں پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ قریب کھڑی ہوئی نرس نے اس کو بہت حیرانی کے ساتھ دیکھا کیونکہ وہ اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگوں کو یکسر نظر انداز کر کے چاروں طرف متلاشی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ڈھونڈھ رہے ہو" آخر نرس صبر نہ کر سکی۔

"میرے کپڑے کہاں ہیں ــــــ میرے کپڑے ــــــ" وہ ہسٹریائی انداز میں چیخا ــــــ "میرے کپڑے لاؤ" وہ رونے لگا۔

نرس بڑے ناز سے اپنے کو لیے ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بنڈل تھا۔

اس نے بڑی تیزی سے وہ نرس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ پہلے قمیص اس کے ہاتھ لگی۔ اس نے جلدی جلدی اس کو چاروں طرف سے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ ثابت تھی۔ اس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لے کر تہہ کی ہوئی پتلون کو کھولا۔ ایک روح فرسا منظر سامنے تھا۔ پتلون کے دونوں پائنچے دھجیوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اس کی محبوبہ اس کو پھر بڑی حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے کلاس فیلوز پھر اس کی تضحیک کر رہے تھے۔ دوکاندار پھر اس کو چور سمجھ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کو آنسوؤں کے سیلاب نے دھندلا دیا تھا۔ وہ اب کچھ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اس کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ کر دھجیوں میں تبدیل ہو گئی ہیں اور وہ انھیں ایک بنڈل سے نکال کر اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔

شاعری

دو منظوم خطوط

راہی معصوم رضا کا خط ——————— علی گڑھ کے نام
زیدی جعفر رضا کا خط ——————— راہی کے نام

چاند تو اب بھی نکلتا ہوگا

——— راہی معصوم رضا

رات،
جو درد کی ہمراز ہے،
اور درد سے ناواقف ہے۔
آئینہ خانے سجالیتی ہے،
آئینہ خانوں پہ منڈلاتی ہوئی گرد سے ناواقف ہے۔
گرمیِ لمس سے بیگانہ ہے،
نفسِ سرد سے ناواقف ہے۔
رات،
جو درد کی ہمراز ہے اور درد سے ناواقف ہے۔
اپنے سناٹے کے تیزاب میں 'تحلیل' ہوئی۔
رات پگھلی،
تو رہائی ملی اُن یادوں کو،

ایک مدت سے گرفتار تھیں جو رات کے سناٹے میں۔
مین بڑھا ان کی طرف۔ جب، تو بُرا مان گئیں
پہلے تو جھجھکیں،
مگر بعد میں پہچان گئیں۔
خیریت پوچھ کے پل بھر کو رُکیں
جیسے یہ پوچھ کے پچھتائی ہوں،
اور پھر بات بدلنے کے لیے،
پیار سے چھونے لگیں وہ میرے اُن زخموں کے پیراہن کو۔
ان کے ہاتھوں پہ چڑھا رنگِ حنا بن کے مرے خون کا رنگ
تب کہا میں نے:
کچھ اُس شہرِ تمنا کی کہو۔
اُوس کی بوندوں سے کیا کرتی ہے اب صبح سلوک
وہ مرے ساتھ کے سب تشنہ وہاں کیسے ہیں۔
اُڑتی پڑتی یہ سُنی تھی کہ ہراسان و پریشان ہیں لوگ۔
اپنے خوابوں سے پشیمان ہیں لوگ۔
'شہریاروں' کے وہ انداز نہیں۔
چُپ ہیں 'خلیل'
جیسے کہنے کو کوئی بات نہ ہو۔
یا یہ ڈر ہے کہ کہیں مات نہ ہو۔
کینٹینوں میں کہیں کھو گیا جاوید کمال
ہائے یہ وقتِ زوال
کچھ تو بتلاؤ کہ وہ 'کج کلہاں' کیسے ہیں۔
جن سے ہمیں چھوٹ گیا اب وہ جہاں کیسے ہیں

شاخِ گُل کیسی ہے،
پھولوں کے مکاں کیسے ہیں۔
میں نے سو بار پیالۂ زہرِ وفا جن کے لیے
وہ مسیحا نفساں کیسے ہیں۔
جس گلی نے مجھے سکھلائے تھے آدابِ جُنوں
اُس گلی میں مرے پیروں کے نشاں کیسے ہیں۔
شہرِ رُسوائی میں چلتی ہیں ہوائیں کیسی
ان دنوں مشغلۂ زلفِ پریشاں کیا ہے۔
ساکھ کیسی ہے جُنوں والوں کی
قیمتِ چاکِ گریباں کیا ہے۔
بات کرتی ہے صبا کس رُخ سے
دھوپ سائے کی تمنا میں کہاں جاتی ہے
چاند ویسے ہی نکلتا ہے کہ کچھ بدلا ہے؟
چاند تو اب بھی نکلتا ہوگا
رات آنگن میں اُترتی ہوگی
صبح تک ٹوٹ کے برچھائیں برستی ہوگی
بُت پرستوں کے وہ آذر کا نگر
اب بھی سولی پہ چڑھاتا ہوگا
سربلندی کی سزا مانگنے اب بھی کوئی
سر ہتھیلی پہ لیے
اپنے کندھوں پہ اُٹھائے ہوئے خود اپنی صلیب
اپنے مقتل کا پتہ پوچھتا بازار میں آتا ہوگا۔
اپنے اللہ کو بازاروں میں

لوگ سکّے کی طرح اب بھی چلاتے ہوں گے
اپنی میراث کی مانند اُڑاتے ہوں گے
چہروں پر ڈالے ہوئے اپنی نمازوں کا نقاب
اپنی ہر جیب میں دُشنام کے پتّھر بھر کر
لوگ مسجد سے نکلتے ہوں گے
سنگساری کے لیے ڈھونڈنے دیوانہ کوئی

کون دیوانہ ہوا میرے بعد؟
یا اب آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد؟
چاند تو اب بھی نکلتا ہو گا
چاندنی اپنی حکایاتِ وفا
اب وہاں کس کو سُناتی ہو گی
چاند کو نیند نہ آتی ہو گی۔

آؤ،
کچھ دیر اُسی شہرِ تمنّا کی کہیں اور سُنیں
جس کا دیوانہ ہوں میں آج تلک
جو مری تشنہ لبی کی جنّت
میرے شعروں کا پری خانہ بھی ہے
جو مرا کعبہ بھی ہے
مرا صنم خانہ بھی ہے
'گیٹ وے' کی پڑیوں' میں ہنستے ہوئے لمحوں کے گروہ
کیا اُسی طرح ابھی آتے ہیں
جس طرح آتے تھے
رُکتے تھے

چلے جاتے تھے
دل سلگتے تھے
مگر
عود و عنبر کے دھوئیں کی مانند
چائے کی گرم پیالی سے نکلتے تھے تو ہر چیز مہک اٹھتی تھی
شام کچھ اور بہک اٹھتی تھی۔
ایک ہی بُت کے پرستار تھے سب
اپنے خوابوں کا سمندر رکھ کر
زہر پی جانے کو تیار تھے سب
ہائے،
کیا دھاک تھی امرت کے پرستاروں میں
آنکھ اُگا لیتے تھے دیواروں میں
پھول شبنم کے کھلا لیتے تھے انگاروں میں
رنگ بھر دیتے تھے ہم ریشمی رخساروں میں
اہلِ دل سب تھے،
وفادار تھے سب
ایک ہی درد تھا،
بیمار تھے سب
ایک ہی بُت کے پرستار تھے سب
میں تو پتھر تھا
مجھے پھینک دیا
ٹھیک کیا
آج اُس شہر میں شیشے کے مکاں کیسے ہیں؟

دردِ دل کیسا ہے،
آشفتہ سراں، کیسے ہیں؟
اِن دنوں زاویۂ خوابِ پریشاں کیا ہے؟
اب زبانِ لب و رخسار ہے کیا
لہجۂ گیسوئے پیچاں کیا ہے
ان دنوں کون ہے معتوب وہاں
کس کے افسانے ہیں مشہور وہاں
کوئی زندہ ہے،
کہ دل دینے سے سب اوب گئے
کوئی خورشید نکلتا ہے کہ سب ڈوب گئے
کیسی ہوتی ہے اب اس شہر کی رات
کس کی زلفوں کی کہانی سے معطر ہیں در و بامِ حیات
گنگناتے ہیں کسے میر کے نشتر کی طرح
آج کل کون ہے گلزارِ نسیم
کون دیوانِ تمنا کی طرح
دل کے مکتب میں پڑھا جاتا ہے
کس کے ہاتھوں میں ہے اس شوخ کا ہاتھ
اُن دنوں جس کے لیے ہم نے زندانوں کے در توڑے تھے
اور مرنے کی قسم کھائی تھی
کیا اسی شوخ کی خاطر اب بھی
لوگ مرنے کی قسم کھاتے ہیں
غیر کی بزم میں دیوانے چلے جاتے ہیں
کون ہے ایک عنایت کی نظر ہونے تک

شمع کس رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
میرے پروانہ صفت شعلہ رخاں کیسے ہیں
ان دنوں مشغلۂ زلفِ پریشاں کیا ہے
شعبۂ اردو میں اب کس کی غزل چلتی ہے
میں سروروں کی طرف سے تو پریشاں نہیں
کون آیا ہے 'میاں خاں' کی جگہ
چائے میں کون ملاتا ہے محبت کا رنگ
شیخ کے بال میں کنگھی کرنے
کون آتا ہے وہاں
صبح ہوتی ہے کہاں
شام کہاں ڈھلتی ہے
شعبۂ اردو میں اب کس کی غزل چلتی ہے
کیا وہی شوقِ جنوں
کیا وہی جستجوئے دار و رسن آج بھی ہے
شہرِ قاتل میں کوئی سر بکفن ہے کہ نہیں
جان دینے کا چلن ہے کہ نہیں
دشتِ آئینہ میں صاحب نظراں کیسے ہیں
اب بھی اربابِ وفا زہر تو پیتے ہوں گے
آج کل پیالوں میں وہ زہرِ وفا ملتا ہے؟
کیا ہے اس زہر کا رنگ؟
ان دنوں لال ہوا کرتا تھا
پینے والوں کا عجب حال ہوا کرتا تھا
تحفۂ چاکِ گریباں لیکر

دل میں مر جانے کا ارماں لیکر
درِ ساقی پہ صدا دیتے تھے
آ،
ہمیں زہر پلا دے ساقی
نجد کی راہ دکھا دے ساقی
نجد میں اب مرے آہو صفتاں کیسے ہیں
قیمتِ یک رمِ آہو کیا ہے
نکہتیں کیسی ہیں
غنچہ دہناں کیسے ہیں
موسمِ گل میں وہاں پھول تو کھلتے ہوں گے
چاند تو اب بھی نکلتا ہو گا
چاندنی آج بھی برستی ہو گی
نیند آنکھوں کو ترستی ہو گی
میرے نوری کو پلاؤ
میرے کے۔ پی۔ سے کہو
آؤ انہیں نیند کی کچھ بات کرو

سرد ہے رات
جلا لیتے ہیں بیتے ہوئے لمحوں کے الاؤ
تجھ سے کچھ شعر سنو
اپنے کچھ افسانے سناؤ
خیر ہے کون اب افسانوں میں
وہ جو سلطان تھا تاریخ کے ایوانوں میں
سارے امروز پرستوں کا امام

دُور سے اُس کو سلام
نام کا نُور، پہ ظلمت کا غلام
سُن رہا ہوں کہ بڑا شہ کا مصاحب وہ شخص
پھرتا ہے دلّی میں اِترایا ہوا
اب علی گڑھ میں مگر
کھیلتا کون ہے ہمعصروں کے مستقبل سے
بھائی خاں کیسے ہیں
عرفانوں کی حالت کیا ہے
شعلہ رُخ خیر سے ہوں
شعلہ بیاں کیسے ہیں
یا ان دونوں مصلحت کو پڑ رہا پالا، کیا ہے
بتّی بجھتی ہے تو سب کس کو صدا دیتے ہیں
لوگ تو اب بھی اندھیرے کو بتانے کے لیے
آسماں سر پہ اٹھاتے ہوں گے
چاند تو اب بھی نکلتا ہو گا
مارچ کی چاندنی اب لیتی ہے کن لوگوں کا نام
راستے لاتے ہیں کن راہرووں کا پیغام
کن کے سر لگتا ہے اب عشق کا رنگین الزام
صبح ہے کن کی بغل کی زینت
کن کے پہلو میں ہے شام
..... کن پہ جینا ہے حرام
جو بھی ہوں، ہیں تو وہ میرے قبیلے والے
اُس طرف ہو جو گزر

اُن سے کہہ دینا کہ میں نے انھیں بھیجا ہے سلام
صُبحِ تہذیب کی پُشت
بچے جو زلیخاؤں میں
رات تقسیم ہوا اُس شہر کی لیلاؤں میں
سب کی یہ تشنہ لبی یاد رہے
نئے رند آئیں
میرا میکدہ آباد رہے
نئی آنکھوں کی زمینوں پہ اُگائے نئے باب
یونین ہال میں کھلتے رہیں چہروں کے گلاب
تشنگی دیکھ کے خود پیالوں سے چھلکے مئے ناب
میری تقدیر میں لکھ دے کوئی ان لوگوں کے حصول کے سراب
چاند تو اب بھی نکلتا ہوگا
چاند ہر رات نکلتا ہی رہے

چاند تو اب بھی نکلتا ہے مگر

زیدی جعفر رضا

چاند تو اب بھی نکلتا ہے مگر،
رات کے پاس وہ سرمایۂ احساس نہیں
قہقہے، نو دولتوں کے، نغموں کے سراب،
چند بے جان سی آوازوں کے نشتر کا عذاب
گود پھیلائے ہوئے حرص و ادب کے گرداب
آجکل رات کا سرمایہ ہیں۔
شہر سناٹوں کے پیکر کا ہے نام
جسم میں سر کو چھپائے ہوئے پھرتے ہیں سبھی
شمعیں آشفتہ سروں کی گل ہیں
رقص کرتا ہے گھٹا ٹوپ اندھیرا سرِ شام
لذتِ گرمیِ انفاس نہیں
کوئی امید نہیں یاس نہیں
چاند تو اب بھی نکلتا ہے مگر
رات کے پاس وہ سرمایۂ احساس نہیں

آج میں تذکرۂ ہم نفساں کس سے کروں
لوگ پھرتے ہیں لیے زخموں کے پیراہن کو
داغ سینے کے دکھاؤں بھی تو کیا حاصل ہے؟
میرے کندھوں پہ ہے خود میری صلیب
میرا سایہ بھی مرے درد سے ناواقف ہے۔

"شہریاروں" نے ہے لی تابش کے بتوں میں پناہ
گرم ہے "آتشِ خورشید" غلیلوں کے لیے
"قاضیِ شہر" کی بن آئی ہے۔
کل اِسی جرم میں دیوانہ سمجھ کر اُس کو
اپنے وقتوں کے "سروروں" نے کیا شہر بدر
آج مجرم کو یہاں ملتے ہیں انعام و اکرام
بیٹھنا چاہتا ہے جشنِ سرورؔ وں کی جگہ
ذکرِ نیرنگیِ صاحب نظراں کس سے کروں
آج میں تذکرۂ ہم نفساں کس سے کروں
لوگ پھرتے ہیں لیے زخموں کے پیراہن کو
چاند تو اب بھی نکلتا ہے مگر
رات کے پاس وہ سرمایۂ احساس نہیں

آج اس شہر کو تم شہر تمنا سے نہ تعبیر کرو
کس کو پروا ہے یہاں شہر کے دیوانوں کی
آج اصنام پھرا کرتے ہیں کوچہ کوچہ
کرسیاں کعبے کی مانند 'مقدس' ہیں یہاں
تشنہ لب جو بھی ہیں بے بس ہیں یہاں
پیاس بجھتی ہے دہکتے ہوئے انگاروں سے۔
چائے خانوں سے جو پوچھو کسی "جذبی" کا پتہ
چائے کی پیالیاں ہنس دیتی ہیں سر
کتنے ناآشنا ہیں شعر و ادب سے کتنے
ایک اُردو کا گزٹ مد کھتا ہے "جاوید کمالوں" کا بھرم
لوگ اس شہر کے ہیں بند کتابوں کی طرح

جن میں کیا لکھا ہے معلوم نہیں
کون سنتا ہے یہاں بات پری خانوں کی
تم کو اس شہر میں رہنا ہے تو حق کو تہِ شمشیر کرو۔
آج اِس شہر کو تم، شہرِ تمنا سے نہ تعبیر کرو
چاند تو اب بھی نکلتا ہے مگر
رات کے پاس وہ سرمایۂ احساس نہیں

آج اِس شہر میں آئے ہوئے راہی سے کہو
چاند کو دیکھ کے حیران نہ ہو
دھوپ نکلے تو پریشان نہ ہو
اب نہیں آتی یہاں پائلیں باندھے ہوئے رات
اب نہیں "تی اماں دھوپ کو سایوں میں کہیں
اب ہے آزادی "غزالوں" سے "کنور پالوں" کو
رات اب ہوتی ہے پہلے سے کہیں زیادہ طویل
دن کی دہلیز پہ جلتی ہے جفا کی قندیل
دل کے افسانے نہیں سنتا سناتا کوئی
چند لوگوں کے سوا
کوئی رکھتا نہیں عرفانِ حبیب
اے ہوا آئے ہو تو اس شہرِ تمنا کی حقیقت سمجھو
آج اِس شہر میں آئے ہوئے راہی سے کہو۔
چاند کو دیکھ کے حیران نہ ہو
چاند تو اب بھی نکلتا ہے مگر
رات کے پاس وہ سرمایۂ احساس نہیں

جناب اختر انصاری

رباعیات

(١)

آیا یہ غم و یاس کا بھبکا کیسا!
شعلہ یہ کسی ٹیس کا لپکا کیسا!
او نغمۂ انبساط گانے والے!
آنسو یہ تری آنکھ سے ٹپکا کیسا!

(٢)

کس درجہ رہے بے خود و بے راہ نہ پوچھ
کس قہر کی غفلت رہی اللہ نہ پوچھ
اب جاگ کے ہوا شعورِ ہستی پیدا
بالغ ہوئے کس عمر میں ہم، آہ نہ پوچھ

(٣)

احساس کے تاروں کو جھنجھوڑا میں نے
غفلت کی کلائی کو مروڑا میں نے
ٹپکے مہ و خورشید درخشاں کیا کیا
جب اپنی شبِ غم کو نچوڑا میں نے

(٤)

واعظ! مرے اوراد کی لذت مت پوچھ
مخمور وظائف کی حلاوت مت پوچھ
کل پچھلے پہر عالمِ مدہوشی میں
جو مجھ کو ملا لطفِ عبادت مت پوچھ

(٥)

ہنس ہنس کے زمانے کو ہنسانے والے!
گفتار کو عنبر میں بسانے والے!
کیوں تو نے نظر بچا کے آنسو پونچھا
محفل کو طرب زار بنانے والے!

(٦)

یہ عمر کہ دل کھاتی ہوئی چڑھتی ندی
ہو جائے گی کل لقمۂ سیلِ ابدی
تو جشنِ حیات آپ منا لے اپنا
دنیا نہ منائے گی تری جنم صدی

(۷)

اک روز مرا وقت بھی آ جائے گا
ہر بزم میں ماتم بھی کیا جائے گا
کچھ کام بھی آئے گا مرے حشر کے دن؟
اخبار میں شذرہ جو لکھا جائے گا!

(۸)

گر گر کے سنبھلتے ہیں سنبھلنے والے
ہر سانچے میں ڈھل جاتے ہیں ڈھلنے والے
گلشن بھی کہیں گل کدہ ہے، اور کہیں
جلتے ہیں بغیر آگ کے جلنے والے

(۹)

بالیدگی جسم کی خاطر نہ جیے
چاکِ جگرِ زیست ہی دن رات سیے
یہ جسمِ گزار و بدنِ کاہ نما
پھر بھی ہے بہت قبر کے کیڑوں کے لیے

(۱۰)

تقدیر سے فرصت نہ ملی پر نہ ملی
تنشیط کی دولت نہ ملی پر نہ ملی
دیتے ہی رہے نفس کو اپنے مہلت
جب ہے ہمیں مہلت نہ ملی پر نہ ملی

(۱۱)

تا طرۂ نیکی و بدی کی چھل بل
گندم کے خمارِ سرمدی کی چھل بل
آزردہ و دل تنگ ہیں پچھلی صدیاں
اللہ رے بیسویں صدی کی چھل بل

(۱۲)

افکار کی گرمی سے پگھلے جاتے ہیں!
دم سیلِ حقائق سے رُکے جاتے ہیں!
اللہ رے افزونیِ سرمایۂ ذہن!
اس بوجھ سے تو شانے جھکے جاتے ہیں!

(۱۳)

گلشن مرے خوابوں کے دہکتے ہی رہے
تخئیل کے طائر بھی چہکتے ہی رہے
اس دل نے بہت خاک اُڑائی، لیکن
سینے میں جو تھے زخم مہکتے ہی رہے

(۱۴)

جیسے شبِ غم بیت رہی ہو کوئی!
یا وقت نے خود چوٹ سہی ہو کوئی!
یہ کرب، یہ لذت، یہ تفکر، یہ نشاط
فطرت نے غزل جیسے کہی ہو کوئی!

(۱۵)

توفیقِ ازل ہے اک فسانہ اے دل!
تقصیر کے وعدے پہ نہ جانا اے دل!
اب وقت سے مرہم کی توقع بھی نہیں
زخموں سے ہے چُور خود زمانہ اے دل!

قطعات

(۱)

زہرہ وش، ماہ جبیں رقاصہ!
دہر کی بہترین رقاصہ!
سحر ہے، برق ہے، قیامت ہے
یہ زمیں، یہ حسین رقاصہ!

(۲)

سازِ غم کے تار ہلتے ہی رہے
روز تازہ زخم سلتے ہی رہے
لہلہاتا ہی رہا اپنا چمن
زندگی بھر پھول کھلتے ہی رہے

(۳)

پھر کہاں خوئے جنوں کرنے کے دن!
پھر کہاں یہ آہیں بھرنے کے دن!
کام لے عجلت سے مرگِ ناگہاں
نکلے جاتے ہیں مرے مرنے کے دن!

(۴)

دردِ حسرت کی دل نشینی دیکھ
سوزِ حرماں کی جاں گزینی دیکھ
اے فلک! میری بے حسی پہ نہ جا
اپنی اندوہ آفرینی دیکھ

(۵)

فغانِ غم سرود انگیں معلوم ہوتی ہے
تپش دل کی بہارِ یاسمیں معلوم ہوتی ہے
مرا کافر مذاقِ حسن اب تم پوچھتے کیا ہو
مجھے اپنی تباہی بھی حسیں معلوم ہوتی ہے

(۶)

یہ بوسیدہ پھٹی گدڑی، یہ سوراخوں بھری کملی!
جسے سب آسماں کے نام سے موسوم کرتے ہیں
تری رحمت کے قرباں! اس کو نیچے پھینک دے یارب
زمیں والے بہت راتوں کی سردی میں ٹھٹھرتے ہیں!

(۷)

اِک شورِ بے اماں کہ ترانہ کہیں جسے
اِک تشنگی کہ پینا پلانا کہیں جسے
کیا کہیے کس فریب کے مارے ہوئے ہیں ہم
اِک ابتری کہ نظمِ زمانہ کہیں جسے

(۸)

کچھ اس طرح ہے جوششِ تغیر تھما ہوا
سچ مچ ہو جیسے وقت کا پہیہ رکا ہوا
قائم ہے ایک حال پہ بدحالیِ جہاں
اے گردشِ فلک! تری غیرت کو کیا ہوا

(۹)

دردآگیں ناکسی کی بات ہی کچھ اور ہے
پُرالم بے مائگی کی بات ہی کچھ اور ہے
ایک بے پایاں خلا ہے تو بھی گو اے آسماں!
میرے دامانِ تہی کی بات ہی کچھ اور ہے

(۱۰)

جگمگاتا ہی رہا جذب و جنوں کا سر پہ تاج
سنگِ ہستی سے گراں تر ہی رہا اپنا زجاج
ہم نے اخترؔ عشرتِ ایام کا تو ذکر کیا!
زندگی کی تلخیوں کو بھی نہ چھوڑا بے خراج!

(۱۱)

گردشِ گردونِ گرداں آ چکی ہو جس کو راس
خونِ دل کے ساغروں سے بجھ چکی ہو جس کی پیاس
اُس کے احساسِ حزیں کی شہد آگینی نہ پوچھ
جس نے غم کے سمِ قاتل سے نچوڑی ہو مٹھاس

(۱۲)

بربطِ ضبطِ فغاں کی زمزمہ باری تو دیکھ!
اشکِ پنہاں کی نظر افروز گلکاری تو دیکھ!
پیار آجائے تجھے بھی اے مشیت تو سہی
میرے اندوہ و تمنا کی طرحداری تو دیکھ

(۱۳)

تغیّراتِ جہاں کا سروں پہ سایہ ہے
فسونِ ردّ و بدل زندگی پہ چھایا ہے
نہیں کہ ہم کو ملا انقلاب ورثے میں
خود انقلاب نے ورثے میں ہم کو پایا ہے

(۱۴)

یہ سچ ہے اے فلکِ کور چشم و تیرہ ضمیر!
کہ تیرے وار سے کوئی نہ زینہار بچا
مگر وہ کنگرۂ بام انجمیں پہ ترے
زمین والوں نے ڈالی کمند، وار بچا!

(۱۵)

خیال نبضِ جنوں کی طرح پھڑکتا ہے
شعورِ سوزِ دروں کی طرح بھڑکتا ہے
میں زندگی کو بھی اک فن خیال کرتا ہوں
مرا دماغ بھی دل کی طرح دھڑکتا ہے!

(۱۶)

خرد کے مصلحت آفریں سانچے میں نہ ڈھلے
صلاحِ کار کے سانچے میں جیتے جی نہ ڈھلے
نثار اس تری ٹیڑھی زمین کے یارب!
تمام عمر یونہی ہم بھی ٹیڑھی چال چلے

(۱۷)

تمام عمر رہے جو رہینِ حسرت تھے!
نہ چکھی اور اسی حسرت میں مر گئے پیاسے
زمیں مطالبہ کرتی ہے اُن کے حصّے کا
ہمارے جام سے اکثر چھلک ہی جاتی ہے

(۱۸)

خدا کو پیارے ہوئے جن کو مدتیں گزریں
وہ پیاری راتیں نہ لوٹیں وہ پیارے دن نہ پھرے
فسوں ہے گردشِ دوراں فسانہ گردشِ چرخ
ہمارے بخت نہ پلٹے ہمارے دن نہ پھرے

(۱۹)

فلک پہ جیسے ستاروں کی گوہریں جنبش
زمیں پہ چاند کی کرنوں کی مرمریں جنبش
مجھے ہے یاد ابھی تک وہ اپنے بازو پر
تمہاری پلکوں کی نازک سی نشتریں جنبش

(۲۰)

وہ روحِ ناز جو خوابیدۂ خیال رہی
وہ جانِ دل جو دل دیدۂ خیال رہی
خیالِ باطل و بے اصل جو بے اساس ہے آج
وہ کافرہ جو پرستیدۂ خیال رہی!

غزل

بطونِ زیست سے کٹ کر اُٹھا جو فسردہ تو کیا!
ہوا خلاؤں کے میدان کا بھی مرد تو کیا!
یہ کائنات ہے خود گردِ کاروانِ ازل
جمی ہوئی ہے ترے آئینے پہ گرد تو کیا!
پیمبروں کا لہو پی گئی ہے یہ دُنیا
تجھے ملا دلِ بیمار و روئے زرد تو کیا!
ہزارہا کرۂ چرخ خشک و سرد ہوا
متاعِ جاں ہے لبِ خشک و آہِ سرد تو کیا!
ٹپک رہا ہے زمانے کی کہنیوں سے لہو
سجے ہیں تجھ پہ رمان و لاجورد تو کیا!
زمانہ خود بھی حریفِ نبردِ عشق نہیں
نہ ہو سکا میں اگر درخورِ نبرد تو کیا!
خلا میں گم ہیں ستاروں کے قافلے لاکھوں
بھٹک گیا کوئی مجھ سا بھی شب نورد تو کیا!
نبردِ زیست کی رودادِ خوں تو ہم نے لکھی
اگر ہوا کوئی شاہنشہِ نبرد تو کیا!

محبت وہ درد جو محصورِ ذات ہو اختر
نہاں ہے دل میں ترے اِک جہانِ درد تو کیا!

ڈاکٹر معین احسن جذبی

غزل

دل سرد ہو تو دا لبِ گفتار کیا کریں
منصور کیا بنیں ہوس دار کیا کریں

اب کیا سنائیں یوسف و زنداں کی داستاں
پھر گرم جنسِ درد کا بازار کیا کریں

وہ ساغرِ کرم ہو کہ ہو جامِ زہرِ غم
ساقی نے جب دیا ہو تو انکار کیا کریں

دیکھے نہ اپنے ساتھ جو کوئی تو کیا دکھائیں
سمجھے نہ کوئی بات تو اصرار کیا کریں

جذبی نگاہ میں ہے برہنہ سری کی شان
ہم احترامِ طرہ و دستار کیا کریں   سنہ ۶۹ء

○

غمِ عاشقی سے گریز کیوں غمِ زندگی سے فرار کیا
جو چمن میں رہنا ہے ہمدمو تو خزاں کے نشترِ خار کیا

جو فلک پہ تارے نہیں تو کیا جو نہ چاند نکلے تو کیا گلہ
کہ مسافرِ شبِ ہجر کو شبِ ماہ کیا شبِ تار کیا   سنہ ۶۷ء

ڈاکٹر معین احسن جذبی

غزل

سرو و سمن بھی سوزِ نسیمِ سحر بھی ہے
اے گُل ترے چمن میں کوئی چشمِ تر بھی ہے
سایہ ہے زندگی پہ وہ یاس و اُمید کا
ہر شب شبِ دراز بھی ہے مختصر بھی ہے
فردوسِ گوش خندۂ گُل کی صدا سہی
میری نظر میں لالۂ خونیں جگر بھی ہے
کچھ دیر پی لیں کاکل و عارض کی چھاؤں میں
جادوئے شام بھی ہے فسونِ سحر بھی ہے
دنیا سنے تو قصۂ غم ہے بہت طویل
ہاں تم سنو تو قصۂ غم مختصر بھی ہے
اب شاعرانِ ہند میں جذبی جگر کے بعد
یہ سوچتا ہوں میں کوئی صاحب نظر بھی ہے

غزل

اک مضمحل سی شام ہے پر شامِ غم نہیں
عہدِ کرم ہے یادِ امیدِ کرم نہیں
آنکھوں میں وہ نمی ہے جسے کہہ سکیں نہ اشک
دل پر ہے وہ ستم کہ بظاہر ستم نہیں
یہ تشنہ لب نہ غرقِ ہوس خود ہی تو اور بات
یوں تو شراب ان کے پیالوں میں کم نہیں
اک یادِ خوشگوار ہے اور آہِ سرد سرد
اک بزمِ جم کا ذکر ہے اور بزمِ جم نہیں
ایسا سکون ہے دلِ شوریدہ سر کو آج
ان گیسوؤں میں جیسے کوئی پیچ و خم نہیں
دل کو ملی نگاہ، نگاہوں کو وسعتیں
جذبی ہیں تو اپنی تباہی کا غم نہیں

غزل

چمن میں تھے تو چمن ہی کی داستاں سنتے
کوئی نوا کوئی نغمہ کوئی فغاں سنتے

قدم نہ چھوڑتے راہوں کو تا بہ منزلِ شوق
ہماری بات جو یہ اہلِ کارواں سنتے

ہمارے درد کا طوفاں کہاں کہاں نہ اٹھا
یہ شور آپ جہاں چاہتے وہاں سنتے

اک عمر اپنی بھی گذری ہے اے چمن والو
گلوں کے کنج میں اندیشۂ خزاں سنتے

کسی کا رنج، کسی کا الم، کسی کا ملال
اب اور کیا تھا جو ہم زیرِ آسماں سنتے

گلوں سے بچ کے چلے بلبلوں سے کترائے
وہ میرا قصۂ خونیں کہاں کہاں سنتے

کچھ اس میں اپنا بھی سوزِ بیاں تھا اے جذبیؔ
وگرنہ لوگ کب افسانۂ جہاں سنتے

غزل

کیا جانے ذوق و شوق کے بازار کیا ہوئے
یوسف پکارتا ہے خریدار کیا ہوئے

گستاخیِ نگاہ و تمنا کدھر گئی
تعزیرِ درد کے وہ سزاوار کیا ہوئے

صبر آزما وہ شوقِ نظارہ کہاں گیا
منت کشانِ سایۂ دیوار کیا ہوئے

ہر سانس بوے بادہ نہ ہر گام لغزشیں
جانے وہ محتسب کے گنہگار کیا ہوئے

تھا جن کے پاس زخم کا مرہم کہاں گئے
جو دل کو جوڑتے تھے وہ معمار کیا ہوئے

ڈھونڈو تو کچھ ستارے ابھی ہوں گے عرش پر
دیکھو تو وہ حریفِ شبِ تار کیا ہوئے

دھوکا نہ تھا نظر کا تو پھر اے شبِ دراز
وہ ہلکے ہلکے صبح کے آثار کیا ہوئے

جذبیؔ کہاں گئیں وہ تری دل فروزیاں
ڈوبے ہوئے وہ سوز میں اشعار کیا ہوئے

خواجہ مسعود علی ذوقی

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں میری زندگی میں شریک
نظر سے دور مگر دل سے ہیں بہت نزدیک

فقط تمہیں ہو چمن کے اجارہ دار نہیں؟
لہو ہمارا بھی رنگِ بہار میں ہے شریک

یہ سب کسی نئے طوفاں کا پیش خیمہ ہیں
فضا میں حبس، ہوا بند، آسماں تاریک

خدا کی شان! ہے اس گُل کا آسماں پہ دماغ
جو مانگتا تھا کبھی آسماں سے اوس کی بھیک

کھُلا ہے عقدہ یہ اک عمر کے ریاض کے بعد
یقینِ خام سے بہتر ہے لذتِ تشکیک

ذرا بھی چوکے تو سارا نظام برہم ہے
غزل کا جادہ ہے خنجر کی دھار سے باریک

کھا رہا ہے پے بہ پے زخمِ شکست آدمی
دیکھتا ہے پھر بھی اب تک خوابِ فردا آدمی

اوّل اوّل اس نے کھولی تھی کھلونوں کی دکان
بن گیا آخر میں خود اپنا کھلونا آدمی

کوئی آدھا، کوئی چوتھائی ہے، کوئی ہے صفر
اس بھری دُنیا میں اب عنقا ہے پورا آدمی

گردشِ افلاک کو اپنا مقدر سونپ کر
بن گیا جبرِ مشیت کا کھلونا آدمی

خواب میں اک عالمِ امکاں ہے زیرِ پائے شوق
آنکھ کھلنے پر بھرے گھر میں ہے تنہا آدمی

وقت وہ آنے کو ہے جب صبحِ نو کی چھاؤں میں
خود گڑھے گا اپنی قسمت کا ستارا آدمی

قدم قدم پہ نیا امتحاں نکلتا ہے
کہ ہر یقین بالآخر گماں نکلتا ہے

جو کچھ کہوں تو بدن جل کے راکھ ہو جائے
رہوں خموش تو سر سے دھواں نکلتا ہے

ہزار سر ہیں سمندر میں، دیکھنا یہ ہے
کہاں کا ڈوبا ہوا سر کہاں نکلتا ہے

بدن کی خاک تو مٹی میں مل چکی لیکن
جلے مکانوں سے اب تک دھواں نکلتا ہے

گماں کو سر پہ چڑھا لو یقین بن جائے
یقیں کی جلد کو کھرچو، گماں نکلتا ہے

جہاں سے دل میں ٹپکتی ہے درد کی شبنم
وہیں سے فکر کا بھی کارواں نکلتا ہے

ہزار دھوپ سہی، یہ کرم ہے شاخوں کا
جہاں ہے سایہ وہیں آشیاں نکلتا ہے

نہ چاندنی میں نہ افسونِ رنگ و بو میں ہے
مگن ہوں جس سے وہ نغمہ مرے لہو میں ہے

میں اب اُڑا تو یہ پرواز آخری ہوگی
بدن کی آگ سمندر کی جستجو میں ہے

کبھی لہو ہے، کبھی زہر ہے، کبھی تریاق
ہر ایک طرح کی صہبا مرے سبو میں ہے

بدن میں جمع ہے صدیوں کی تلخیوں کا زہر
جنم جنم کی کثافت مرے لہو میں ہے

اُدھم مچاؤ، غزل گاؤ، رقصِ بادہ کرو
فروغِ مے کدہ مستوں کی ہاؤ ہو میں ہے

سمجھ رہے تھے جسے حرفِ آخری سب لوگ
وہ گفتگو تو ابھی دورِ ماؤ تو میں ہے

زمیں کی بات کرو

بُرا ہوں میں کہ بھلا ہوں، مجھے خوشی یہ ہے
کہ جاہ و منصب و شہرت اگر نہیں نہ سہی
کچھ ایسا پیار بھی مجھ کو ملا ہے لوگوں سے
جو میری ذات سے ہے، اور صرف میرے لیے

یہی زمیں مرا مسکن یہی مرا مدفن
اسی زمین کی مٹی اسی زمیں کا مزاج
یہی زمین ہماری جراحتوں کا علاج
فلک کی بات نہ چھیڑو، زمیں کی بات کرو
وہاں کے راگ نہ گاؤ، یہیں کی بات کرو

اسی زمیں کا چھوٹا سا آدمی ہوں میں
مری پسند، مری خواہشیں بھی چھوٹی ہیں
مآلِ زیست ہے ادنیٰ صداقتوں کی تلاش
متاعِ شوق ہے ارضی مسرتوں کا حصول

ملا نہ محلوں کا عیش و طرب تو کیا پروا

غریب خانے کی ارزاں فراغتیں تو ملیں
عظیم و دائم و رنگیں مسرتیں نہ سہی
حقیر و سادہ، گریزاں مسرتیں تو ملیں
نہیں نصیب گراں قدر نعمتیں نہ سہی
لب و دہن کی فرومایہ لذتیں تو ملیں
خداگواہ فرومایہ لذتوں کے طفیل
کبھی کبھار نہیں، بارہا کیا محسوس
کہ جذبِ شوق میں سرشار روح کے ہمراہ
کثیف جسم بھی اڑنے لگا ستاروں میں

وفورِ شوق کے صدقے ملی ہے وہ لذت
کبھی کبھی مجھے کافی کی گرم پیالی میں
جو بوسۂ لبِ جاناں میں پائی جاتی ہے
جو پائی جاتی ہے صہبائے پرتگالی میں

جنہیں حقیر سمجھتے ہیں عام طور سے لوگ
متاعِ زیست وہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں
جھلستی، تپتی ہوئی دوپہر کی گرمی میں
نفیس، کوری صراحی سے آبِ سرد کے گھونٹ!
شدید بھوک لگی ہو تو ضعف جاڑوں میں

توے سے اُٹھتی ہوئی نانِ گرم کی خوشبو!
خنک ہواؤں میں، بارش کے پہلے چھینٹے سے
خوشی میں چور کنواری زمیں کا سوندھا پن!
شمالی ہند کی زہرہ گداز سردی میں
غریب پرور و غمخوار دھوپ کی آغوش!
بڑوں کی سادگی، بچوں کی دل نشیں باتیں
مصیبتوں میں وفادار دوستوں کا خلوص!
نمازِ صبح میں میری سلامتی کے لیے
دُعا کے بعد شریکِ حیات کے آنسو
سحر کا نور، پپیہے کی خواب ناک آواز
شفق کے سُرخ دھندلکوں میں ڈوبتی ہوئی شام
حزیں اندھیروں میں ساون کی رات کا افسوں
دیارِ غیر سے دیرینہ ہمدموں کا سلام
کہیں سے تہنیتِ سالِ نو کا تحفۂ خاص
کہیں سے شوقِ ملاقات کا حسیں پیغام
کوئی صدا، کوئی خوش بو، کوئی نظر، کوئی لمس
کوئی ہنسی، کوئی نغمہ، کوئی ادا، کوئی خواب
متاعِ شوق یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں
انھیں سے میں نے سجایا نگار خانۂ شوق
انھیں سے میں نے بنائی ہے کیمیائے نشاط
انھیں سے میں نے پیا ہے خوشی کا آبِ حیات

پروفیسر خلیل الرحمن اعظمی

○

اس پر بھی دشمنوں کا کہیں سایہ پڑ گیا
غم سا پرانا دوست بھی آخر بچھڑ گیا

جی چاہتا تو بیٹھتے یادوں کی چھاؤں میں
ایسا گھنا درخت بھی جڑ سے اکھڑ گیا

غیروں میں بجھ کو دفن کیا شاہراہ پر
میں کیوں نہ اپنی خاک میں غیرت سے گڑ گیا

خلوت میں جس کی نرم مزاجی تھی بے مثال
محفل میں بے سبب وہی مجھ سے اکڑ گیا

بس اتنی بات تھی کہ عیادت کو آئے لوگ
دل کے ہر ایک زخم کا ٹانکا ادھڑ گیا

کس کس کو اپنے خونِ جگر کا حساب دوں
اک قطرہ بچ رہا تھا سو وہ بھی نچڑ گیا

یاروں نے خوب جا کے زمانے سے صلح کی
میں ایسا بد دماغ یہاں بھی بچھڑ گیا

کوتاہیوں کی اپنی میں تاویل کیا کروں
میرا ہر ایک کھیل مجھی سے بگڑ گیا

اب کیا بتائیں کیا تھا خیالوں کے شہر میں
بسنے سے پہلے وقت کے ہاتھوں اجڑ گیا

کس ہاتھ سے ہاتھ میں ملاؤں
اب اپنے ہی ہاتھ مل رہا ہوں

کیوں آئینہ بار بار دیکھوں
میں آج نہیں جو کل رہا ہوں

اب کون سا در رہا ہے باقی
اس در سے میں کیوں نکل رہا ہوں

قدموں کے تلے تو کچھ نہیں ہے
کس چیز کو میں کچل رہا ہوں

اب کوئی نہیں رہا سہارا
میں آج سے پھر سنبھل رہا ہوں

میں کیوں کروں آسماں کی خواہش
اب تک تو زمیں پہ چل رہا ہوں

یہ برف ہٹاؤ میرے سر سے
میں آج کچھ اور جل رہا ہوں

مجھ کو نہ پلاؤ کوئی پانی
پیاسوں کے میں ساتھ جل رہا ہوں

کھانے کی نہیں رہی طلب کچھ
اب بھوک کے بل پہ پل رہا ہوں

رکتی نہیں طبع کی روانی
اب اپنی سطح سے بھی نکل رہا ہوں

○

جلتا نہیں اور جل رہا ہوں
کس آگ میں میں پگھل رہا ہوں

مفلوج ہیں ہاتھ پاؤں میرے
پھر ذہن میں کیوں ٹہل رہا ہوں

اک بوند نہیں لہو کی باقی
کس بات پہ میں مچل رہا ہوں

تم جھوٹ یہ کہہ رہے ہو مجھ سے
میں بھی کبھی بے بدل رہا ہوں

کیوں مجھ سے ہوئے گناہ سرزد
کہنے کو تو بے عمل رہا ہوں

رائی کا بنا کے ایک پربت
اب اس پہ یونہی پھسل رہا ہوں

صبح تک خود سے ہم کلام رہا
یہ شبِ جذب و حال تھی، کیا تھی

دل میں تھی پر لبوں تک آ نہ سکی
آرزوئے وصال تھی، کیا تھی

اپنے زخموں پہ اک فسردہ ہنسی
کوششِ اندمال تھی، کیا تھی

عمر بھر میں بس ایک بار آئی
ساعتِ لازوال تھی، کیا تھی

خوں کی پیاسی تھی پر زمینِ وطن
ایک شہرِ خیال تھی، کیا تھی

باعثِ رنجشِ عزیزاں تھی
خوئے کسبِ کمال تھی، کیا تھی

اک جھلک لمحۂ فراغت کی
ایک امرِ محال تھی، کیا تھی

کوئی خواہاں نہ تھا کہ جنسِ ہنر
ایک مفلس کا مال تھی، کیا تھی

○

رُخ پہ گردِ ملال تھی، کیا تھی
حاصلِ ماہ و سال تھی، کیا تھی

اک صورت سی یاد ہے اب بھی
آپ اپنی مثال تھی، کیا تھی

میری جانب اٹھی تھی کوئی نگہہ
ایک مبہم سوال تھی، کیا تھی

اس کو پا کر بھی اس کو پا نہ سکا
جستجوئے جمال تھی، کیا تھی

○

درمیاں خود اپنی ہستی ہو تو ہم بھی کیا کریں
آئینہ دیکھیں کہ اپنے آپ سے پردا کریں

ایک سے لگتے ہیں سب ہی، کون اپنا کون غیر
بے نقاب آئے کوئی تو ہم در دل وا کریں

حال کے سیلاب میں تو بہہ گئی ماضی کی لاش
دفن اب کس کی گلی میں ہم غم فردا کریں

اک دو پل ہی رہے گا سب کے چہروں کا طلسم
کوئی ایسا ہو کہ جس کو دیر تک دیکھا کریں

کیوں نہ خود اپنا لہو پی کر بجھائیں دل کی پیاس
کس کے گھر کا بھید کھولیں، کس کو ہم رسوا کریں

اب تو امڈا ہی چلا آتا ہے سیلِ آتشیں
چشمِ تر! ہم کس طرح سے پار یہ دریا کریں

یہ تو سچ ہے زہر لگتے ہیں ہمیں بستی کے لوگ
کس توقع پر مگر آباد ہم صحرا کریں

پاس اپنے کیا رہا بس ایک غم، وہ مفلسی
اس کی کیا قیمت لگائیں، اس کا کیوں سودا کریں

سر پھرے سب جمع ہوں، سب کے سروں پر ہوں چراغ
بس چلے تو ہم بھی ایسا جشن اک برپا کریں

کتبہ (۱)

شکستہ ہو چکے اب بادباں سفینے کے
مرے لہو کا سمندر بُلا رہا ہے مجھے
مری رگوں میں مچلنے لگے ہیں وہ قطرے
جو دودھ ماں نے مجھے پیار سے پلایا تھا
نہ رت جگوں کی وہ دستک، نہ نیند کی آہٹ
بس اک سکوتِ صدا ہے جو مجھ سے رہ رہ کر
یہ کہہ رہا ہے کہ لو آ رہی ہے منزلِ شب
مرے رفیق، مرے ہم سفر کہاں ہیں سب
کوئی یہ جا کے کہے ان سے یہ مرا پیغام
کہ ایک کتبہ بنائیں مری لحد کے لیے
ہو جس پہ درج کہ وہ شخص سو رہا ہے یہاں
کہ "اپنا دوست" تھا پر اس کا کوئی نام نہ تھا

کتبہ (۲)

خدایا!
ترے پاس کیا کوئی ایسا فرشتہ نہیں
جو مرے مُردہ، بے دفن، بے قبر کے جسم کو

آ کے اپنے پیروں پر اُٹھالے
اور مجھ کو یہ تیری امانت ابھی سونپ دے

میں نہیں چاہتا
اب کوئی اور آ کر
مجھے آخری غسل دینے کی خاطر
مرے جسم کے سارے کپڑے اُتارے
برہنہ مجھے دیکھے
اور چیخ مارے
کہ یہ کون ہے۔ کس سیہ کار کا جسم ہے؟
اور وہ شخص اس چیخ پر کوئی پتھر دبا کر
بہت منہ بنا کر
بڑی اونچی سی ناک پر اپنا رومال رکھ کر
ادا کر کے سب اپنی رسمیں
مجھے ایک تاریک اور تنگ سی کوٹھری میں چھپا دے
خدایا! نہ میں نے کہیں سر جھکایا
نہ دنیا میں احسان اب تک کسی کا اٹھایا
مرے سر پہ جب دھوپ ہی دھوپ تھی
اس گھڑی میں نہ ڈھونڈا کہیں کوئی سایہ
تو اب تو ہی آ کر مری آبرو کو بچا لے

یہی ایک تحفہ ہے
جو میں ترے پائے اقدس پہ رکھ دوں گا
اور یہ کہوں گا
یہی میری پونجی، یہی ہے کمائی
مجھے اور کچھ بھی عطا کر نہ پائی
یہ تیری خدائی
خدایا!
مری نذر بے مایہ کو دیکھ کر
جس خزانے میں اس کی جگہ ہو
اب وہاں پہ اُسے ڈال دے

کتبہ (۳)

یہ اُس شخص کی قبر ہے
جس کے اب جسم کا کوئی ذرہ یہاں پر نہیں ہے
نہ اس کو کوئی کام اس قبر سے
نہ اُس کو خبر ہے
کہ یہ کس کا گھر ہے
تو اس شخص کے ایک نام گھر کو
کوئی کیوں کسی نام سے آج منسوب کر دے۔

اور اُس نام کا ایک کتبہ بنائے

یہ دنیا ہے جس میں نہ ایسا کوئی گھر بنا ہے اور نہ آگے بنے گا
کہ اس کا مکیں اپنے گھر میں ہمیشہ رہے گا
تو اب کیا کوئی گھر؟
اور اس گھر پہ اک نام کندہ -!
کہ جس مر جانے پر کسی کو کسی گھر کی کوئی ضرورت نہیں

کتبہ (۴)

مری قبر پر ایک کتبہ تو ہے
پر مرا نام اس پر نہیں ہے
مرا نام جو کچھ بھی لکھا گیا تھا
وہ اب مٹ چکا ہے
یہ کتبہ سفید اور سادہ سا ہے
مگر خالی خالی اسے دیکھ کر
ہر اک آنے والا یہ کہتا ہے: کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟
بتاؤ کوئی شخص ایسا بھی ہے
مرا کوئی ہمدرد، میرا معاون
جو آئے اور آ کر مرے سادہ کتبے پہ اپنا بھلا سا کوئی نام لکھ دے

اور پھر کوئی اس سے پوچھے کہ اے مسخرے!
تو تو زندہ ہے، موجود ہے
پھر ترے نام کی قبر کیسی؟
کیا کوئی یہ ترا کھیل ہے؟
اور وہ شخص پھر یہ کہے!
تم سے مطلب؟
یہ مری قبر ہے — ہاں مری قبر ہے
میں اسی قبر میں دفن ہوں —!!

کتبہ (۵)

وہ اک شخص تھا
جو اکیلا تھا، اس کا کوئی بھی نہ تھا
اک اکائی تھا وہ
اور اک دن خود اپنی اکائی میں ختم ہو گیا
اُس نے مرتے ہوئے اک وصیت لکھی
جس میں لکھا تھا:
"اے آدمی!
اے وہ اک شخص
جو میرے مرنے کی پہنچی خبر سن کے دوڑے

اور آواز دے بھائیو آؤ اس کا جنازہ اُٹھاؤ
اور اس آواز پر کوئی آواز اس تک نہ پہونچے
اور پھر مجھ سے بےکس اکیلے کو کاندھوں پہ اپنے دھرے
اور اکیلی سی اک قبر میں مجھ کو لے جا کے محفوظ کر دے۔

میرا وہ دوست اتنا سا احسان مجھ پہ کرے
وہ مری قبر پر اک سادہ سا کتبہ لگا کے
اور اس پر مرا نام لکھ دے
سچ کہوں اس سے میں اپنی شہرت نہیں چاہتا
کیا مرا نام اور کیوں وہ باقی رہے
میں تو اس واسطے چاہتا ہوں کہ جب
شہر کے لوگ یہ سن کر دوڑیں
کہ دیکھو یہ مشہور ہے، لوگ کہتے ہیں وہ شخص تو مر گیا
سوچتے ہیں یہ اس کی شرارت نہ ہو
تاکہ ہم لوگ اب اس سے غافل رہیں
اس کے فتنے سے اپنے کو محفوظ سمجھیں

بس یہی چاہتا ہوں
کہ ایسا کوئی شخص ڈھونڈے مجھے
تو سہولت ہو اس کو یہ تصدیق کرنے کی
یہ شخص سچ مچ نہیں ہے

وہ اب مر چکا ہے
میں تو اب دشمنوں کے بھی آرام کے حق میں ہوں
کیوں کسی کو کسی سے خلل ہو؟
کیوں کسی کو کسی نام سے ایک دہشت ہو؟
سارے انسان دنیا میں آرام سے سوئیں اور خوش رہیں

کتبہ (۶)

یہ کتبہ فلاں سن کا ہے
یہ سن اس لیے اس پہ کندہ کیا
کہ سب وارثوں پر یہ واضح رہے
کہ اس روز برسی ہے مرحوم کی
عزیز و اقارب، یتامیٰ، مساکین کو
ضیافت سے اپنی نوازیں، سبھی کو بلائیں
کہ سب ہی کے مرحوم کے حق میں دستِ دعا کو اٹھائیں
زباں سے کہیں اپنی "مرحوم کی مغفرت ہو"
بزرگ مقدس کے نام مقدس پہ بھیجیں درود و سلام
سبھی خاص و عام

اضافہ (کسی اور کا پنسل سے لکھا ہوا)

مگر یہ بھی ملحوظ خاطر رہے
عزیزو اقارب کا شُرب و طعام
اور اس کا نظام
الگ ہو وہاں سے
جہاں ہو یتامیٰ، مساکین، اندھے، بھکاری
تھٹے اور میلے لباسوں میں سب عورتیں اور بچے
کئی لولے لنگڑے، مریض اور گندے
وہی جن کو کہتے ہیں ہم سب عوام
وہاں ہوگا اک شور و غل، اژدہام
یہ کر دیں گے سب شریفوں کا کھانا حرام

ڈاکٹر وحید اختر

پتھروں کا مغنی (نظم)

مطربِ خوشنوا زندگی کے حسین گیت گاتا رہا
اس کی آواز پر انجمن جھوم اٹھی
اس نے جب زخمِ دل کو زباں بخش دی
سننے والوں نے بے ساختہ آہ کی
عشق کے ساز پر جب ہوا زخمہ زن
شورِ تحسیں میں خود اس کی آواز دب سی گئی

مطربِ خوشنوا پھر بھی تنہا رہا
تشنگیِ شام اس کو بادِ صبا کی طرح گل بہ گل لے گئی
کاسۂ چشم نے پرتوِ گل بھی پایا نہیں
درد اس کا کسی محرمِ درد کے واسطے

در بہ در، شہر در شہر پھرتا رہا
دادِ تحسین کے ہنگامۂ ذوق کشی میں اسے

ہر طرف سے ملامت کے پتھر ملے
مطربِ خوشنوا پتھروں سے پٹکتا رہا اپنا سر
پتھروں کو زباں تو ملی، پر تکلم نہیں
پتھروں کو ملے ہونٹ، لیکن تبسم نہیں
پتھروں کو ملی آنکھ، لیکن نظر کون دیتا انھیں
پتھروں کو ملے کان، پر ذوقِ نغمہ نہیں
پتھروں کو خد و خالِ انساں ملے، دولتِ درد و غم کب ملی

پتھروں کو حسیں صورتیں تو ملیں، دل نہیں مل سکا
پتھروں کو ملے پاؤں، پر اعتمادِ سفر کون دے۔
پتھروں کو ملے ہاتھ، پر عزمِ تیشہ زنی کون دے

سنگ سُنتے ہیں، لیکن سمجھتے نہیں
دیکھتے ہیں، مگر فرق کرتے نہیں
بات کرتے ہیں محسوس کرتے نہیں
ٹوٹ سکتے ہیں، لیکن پگھلتے نہیں
گرد بن کر یہ اُڑ جائیں، سانچوں میں ڈھلتے نہیں
مطربِ خوشنوا پتھروں سے پٹکتا رہا اپنا سر
مطربِ خوشنوا پتھروں کو سناتا رہا دردِ دل
اپنا غم
ان کا غم
سب کا غم
پتھروں نے سُنا اور چپ چاپ ہنستے رہے
پتھروں کی اسی انجمن کا مغنّی ہوں میں
اور بے درد، بے حس، ستم گار پتھر سنیں گے کبھی
اُن کا وہ مطربِ خوشنوا
شکوہ سنجِ زماں
اپنے نغمات کی آگ میں جل گیا
یا پھر ان ہی کی مانند پتھر کا بُت بن گیا

۱۹۵۹ء

غزل

کتنے دل سیراب رہے تشنہ جگری میں میری طرح
کس کو ملی سرافرازی آشفتہ سری میں میری طرح

تم کو خبر کیا کتنے جتن سے اوکھی نیندیں ملتی ہیں
تم نے کب راتیں کاٹی ہیں دربدری میں میری طرح

زخموں کی بوچھار میں روح و جسم کو تم عریاں نہ کرو
عمر کٹے گی زخموں ہی کی بخیہ گری میں میری طرح

اپنے سب محبوب سرِ فہرستِ بزمِ نگاراں ہیں
کس کو یہ اعزاز ملا ہے خوش نظری میں میری طرح

خون کے مد و جزر میں درد کی اٹھتی لہریں رقصاں ہیں
کون شریکِ درد ہے دل کی نامہ بری میں میری طرح

جو دنیا کی کھوج میں نکلے اپنی خبر بھی پا نہ سکے
کس کو خبر عالم کی رہی ہے بے خبری میں میری طرح

ٹوٹے تو پیمانۂ غم، جڑ جائے تو آئینہ ہے
وقت بھی محو ہے خود شکنی اور خودنگری میں میری طرح

آوازوں کے زنداں میں زنجیر بھی پر بن جائے گی
خود سے گذرنا تو سیکھو بے بال و پری میں میری طرح

خشک آنکھوں کے صحرا میں سیلاب اٹھے گا بوند سے بھی
دریاؤں کو سمو تو لو پلکوں کی تری میں میری طرح

شوق ہے گر وحشت کی دریدہ خوں آلود قباؤں کا
پہلے نام کمانا ہوگا دیدہ وری میں میری طرح

میری غزل ہے شعلگیِ گل، خوشبو کی تلوار کی دھار
آگ سے کس نے کام لیا ہے نغمہ گری میں میری طرح

۲۵ اپریل ۱۹۷۶ء

غزل

خواب صحراؤں، سرابوں میں پھرائیں گے تمھیں
سایۂ گل میں بھی شعلے نظر آئیں گے تمھیں

ہم ہی شرمائیں گے کوئی بھی خطا تم سے کرے
تم کسی سے بھی لڑو ہم ہی منائیں گے تمھیں

مسندِ پیرِ مغاں چھوڑ کے جب اٹھو گے
پھر کوئی اور نہیں، یاد ہم آئیں گے تمھیں

ان گنت موجیں ہیں ہر موج میں لاکھوں چہرے
اس سمندر میں کہاں ڈھونڈنے جائیں گے تمھیں

ہم خلش بن کے بہت روز رہیں گے دل میں
خوابِ نادیدہ ہیں صورت نہ دکھائیں گے تمھیں

نہ کرو بات بڑی وقت بدل دے گا تمھیں
ہم سے بچھڑے تو بہت لوگ خوش آئیں گے تمھیں

اچھے اچھوں کو نبھانا ہی پڑا دنیا سے
عہد و پیمانِ وفا راس نہ آئیں گے تمھیں

اہلِ دل! سن لو کہ ہم ہیں سخنِ ناگفتہ
شعر ایسے بھی نہ پھر لوگ سنائیں گے تمھیں

لوگ ہوتے نہیں کیا خود سے بھی بیگانہ وحید
ہم ہی جب ہم نہ رہیں بھول ہی جائیں گے تمھیں

(اکتوبر ۱۹۶۴ء)

غزل

تم جو نہیں ہو رہنے لگی ہے گھر کے اندر تنہائی
محفل سے بھی مجھ کو اُٹھا لاتی ہے جا کر تنہائی

کر کے وداع جو تم کو لوٹا یار احباب نے بتلایا
پوچھ رہی ہے ملنے والوں سے میرا گھر تنہائی

میں تو کتابوں کی دنیا میں خود کو بہلا لیتا ہوں
میرے نام سے خط لکھتی ہے تم کو اکثر تنہائی

اب سے پہلے اس کا ساتھ نبھانا بھی آتا تھا مجھے
کر دیتی ہے اب تو میرا جینا دو بھر تنہائی

برسوں میرے ساتھ رہی تھی تم آئے تو آ کے چھوڑا
آ جاتی ہے پھر سے مجھ کو خالی پا کر تنہائی

تاش کے پتّے، شیشہ و ساغر، اچھے دنوں کے ساتھی ہیں
تم نہ ہو تو بن جاتے ہیں یہ بھی سراسر تنہائی

اُس کو مقفّل کر کے کمروں میں نکلا تھا سفر پہ میں
ریل چلی تو بیٹھی ہوئی تھی میرے برابر تنہائی

کبھی تمھاری دوری بن کر نیند سے چونکا دیتی ہے
سو جاتی ہے کبھی تمھاری طرح لپٹ کر تنہائی

جب کوئی تم سا گل رو گل پیراہن گل گفتار ملے
رکھ دیتی ہے آنکھ میں پھانس اور دل میں نشتر تنہائی

غزلیں لکھنا بھی ہے بہانہ تم سے باتیں کرنے کا
نم دیدہ لفظوں میں بکھرتی ہے کاغذ پہ تنہائی

کبھی کرن کی انگلی تھامے شبنم سے بھی سبک خرام
اور کبھی بن جاتی ہے سینے کا پتھر تنہائی

(جنوری [illegible])

پروفیسر ساجدہ زیدی

میں وہ تصویر نہیں

مجھ کو سمجھا گیا، میں شعرِ مجسّم خود ہوں
بانکپن اور ادا،
شرم و حیا۔
رمزِ تبسّم، نگہہِ لطف کے تیر
کالی زلفوں کی گھٹا،
دستِ حنائی کا کرم
یہی سرمایۂ ہستی ہیں مرا
ہیں یہی میرے ہتھیار

فلسفہ، شعر،
تڑپ دل کی
تمنا کا طلسم
دردِ ہستی کی چبھن
آبلہ پائی کی اساس
تلخ کامی کی مٹھاس
لوگ سمجھے کہ مری ذات کا حصہ ہی نہیں
مجھ کو ہنگامۂ عالم سے سروکار ہی کیا؟
میں یوں ہی گھٹتی، سسکتی رہی لمحہ لمحہ

اور، لوگوں کی اَنا بڑھتی رہی
پھولتی، پھلتی رہی ۔

کسی نے جھانکا ہے مری ذات کی تنہائی میں ؟
کون بھٹکا ہے مری روح کی پنہائی میں ؟
کسی نے امواجِ تخئیل کو گنا ہے میری
کس نے رکھا مرے ۔ ناکردہ گناہوں کا حساب
قلب میں دہکے ہوئے نشترِ غم
شعلہ عشق کا رقصِ بسمل
لذتِ وحشتِ دل ۔ مجھیں خوشی میں غم کی
لغزشیں خواہش بیکار کی
اور لذّتِ اجسام میں جلنے کی، ہوس
دردِ تجدیدِ تمنّا کا تماشائے نشاط
لطف، احساس کی بھٹی میں جلے جانے کا
کرب، امکان کے دھارے پہ بہے جانے کا
عیش، انکار کے شعلے کے بھڑک اُٹھنے کا
کیفیت، حرفِ تمنّا کی فنِ شعر میں ڈھل جانے کی
حوصلہ موت کی وادی میں سفر کرنے کا
خوف خود اپنی ہی ہستی کے تقاضوں سے
کہ اس بحر کا شاید کوئی ساحل ہی نہیں
اضطراب، اس کا کہ موجود اور امکان کی خلیج
کبھی جو ایک قدم ناپ سکیں،
اضطراب، اس کا کہ اک ہستی مطلق بھی نہیں

جس کی طاعت میں ہے روح کو دیرینہ سکون،
کس نے رکھا ہے میرے "کردہ گناہوں" کا حساب ؟
کون اترا کبھی آزادیِ ہستی کے نہاں خانوں میں
مجھ کو اسی رنگ میں گر دیکھا
تو گھبرا گئے، کترا گئے، جھلا گئے لوگ
میرے احساس کو افکار کو پھانسی دے دی
میرے ماتھے کی شکن نوچ لی
آنکھوں سے تمنا کی تڑپ لوٹ لی
ہونٹوں سے اُبلتے ہوئے طوفاں پہ
رسومات کی مہریں رکھ دیں
ذہن کو تھپکیاں دے دے سُلایا
کہ نہ جاگے نہ کرے شور و بکا،
مجھ کو گمنامی کے غاروں میں دھکیلا
مجھے محصور کیا پھر انھیں دیواروں کے پیچھے

کہ جہاں،
میری دلکش تصویر
قرنوں، صدیوں سے سجا رکھی تھی
میں وہ تصویر نہیں ... ...
نقش بہ دیوار نہیں ......
مری نظروں کی تمازت سے
یہ دیواریں پگھل جائیں تو کیا ؟
اس کے آگے بھی تو بس دشت ہے تنہائی کا

نومبر ۶۸ء

نیلے امبر کے سائے تلے

روز و شب
ہیں یکسانیت کے لبادے میں لپٹے ہوئے
—— ایک لائن میں
سیدھے کھڑے ہیں

رنگ شب سرخ ہے
اور نہ رنگ سحر نیلگوں
رخ پہ معمول کی گرد ہے

پردۂ سرد سے
کوئی رنگ تمنا جھلکتا نہیں

رنگ و رامش
بدن
رقص
رفتار
حرکت
ذرۂ ریگ بن بن کے
ہر سو بکھرنے لگے......
لمبے ہونے لگے شام کے زرد تیال سائے۔
جم نہ جائے رگوں میں مچلتا لہو،
تھم نہ جائے کہیں
شورش آرزو

آؤ قید در و بام ہوش و ہوس توڑ ڈالیں
کوئی رمز
کوئی کنایہ
کوئی بے محابہ علامت جگائیں
کہ اس مصلحت کوش
بیداد گر
بے بصر
زیست کی حکمرانی کی سرحد سے باہر
یہی چند دزدیدہ لمحے چرا کر
کسی گوشۂ مختصر میں
گھڑی —— دو گھڑی
بیٹھ جائیں
کچھ کہیں
کچھ کریں
نیلے امبر کے سائے تلے
دل کے اجڑے ہوئے طاق میں
غم کا دیپک جلائیں

[illegible]

افسانۂ دگر

تمھارے مرے درمیاں
لفظ و معنی کی سفاکیاں
تندئ افکار کی تنگ دامانیاں

تمھارے مرے درمیاں
حقائق کا اندھا کنواں
اس کے آگے
فریبِ نظر کا دھواں ہے

تمھارے مرے درمیاں
فاصلے بے کراں
بے اماں ہیں
جیتی صدیوں کے نقشِ قدم
ریگِ احساس پہ مٹ گئے
لمحۂ حال بر فاب سا جم گیا۔

وقت کی گیلری میں
صدائیں ہماری —— تمھاری
گونجتے گونجتے تھک گئیں
درد کے غار میں
ہر کرن بجھ گئی
قطرۂ خونِ دل
لوحِ ہستی پہ افسانہ ہائے دگر
اب بھی لکھ کر مٹاتا ہے
کل بھی مٹاتا تھا
کل بھی مٹاتا رہے گا۔۔۔۔

دن نکلتا رہے گا
رات آتی رہے گی
موسم اپنی قبائیں بدلتے رہیں گے۔۔۔

تا ابد بس یہی سلسلہ
دائرہ وار چلتا رہے گا

جولائی ۱۹۷۸ء

کنور اخلاق محمد خاں شہریار

غزل

سبھی کو غم ہے سمندر کے خشک ہونے کا
کہ کھیل ختم ہوا کشتیاں ڈبونے کا

برہنہ جسم بگولوں کا قتل ہوتا رہا
خیال بھی نہیں آیا کسی کو رونے کا

صلہ کوئی نہیں پرچھائیوں کی پوجا کا
مآل کچھ نہیں خوابوں کی فصل بونے کا

بچھڑ کے تجھ سے مجھے یہ گمان ہوتا ہے
کہ میری آنکھیں ہیں پتھر کی جسم سونے کا

ہجوم دیکھتا ہوں جب تو کانپ اٹھتا ہوں
اگرچہ خوف نہیں اب کسی کے کھونے کا

گئے تھے لوگ تو دیوار قہقہہ کی طرف
مگر یہ شور مسلسل ہے کیسا رونے کا

مرے وجود پہ نفرت کی گرد جمتی رہی
ملا نہ وقت اسے آنسوؤں سے دھونے کا

غزل

جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

سب کا احوال وہی ہے جو ہمارا ہے آج
یہ الگ بات کہ شکوہ کیا تنہا ہم نے

خود پشیمان ہوئے نے اسے شرمندہ کیا
عشق کی وضع کو کیا خوب نبھایا ہم نے

کون سا قہر یہ آنکھوں پہ ہوا ہے نازل
ایک مدت سے کوئی خواب نہ دیکھا ہم نے

عمر بھر سچ ہی کہا سچ کے سوا کچھ نہ کہا
اجر کیا اس کا ملے گا یہ نہ سوچا ہم نے

○

غزل

دل میں اُترے گی تو پوچھے گی جنوں کتنا ہے
نوکِ خنجر ہی بتائے گی کہ خوں کتنا ہے

آندھیاں آئیں تو سب لوگوں کو معلوم ہوا
پرچمِ خواب زمانے میں نگوں کتنا ہے

جمع کرتے رہے جو اپنے کو ذرّہ ذرّہ
وہ یہ کیا جانیں بکھرنے میں سکوں کتنا ہے

وہ جو پیاسے تھے سمندر سے بھی پیاسے لوٹے
اُن سے پوچھو کہ سرابوں سے فسوں کتنا ہے

ایک ہی مٹی سے ہم دونوں بنے ہیں لیکن
تجھ میں اور مجھ میں مگر فاصلہ یوں کتنا ہے

○

غزل

ایسے ہجر کے موسم کب کب آتے ہیں
تیرے علاوہ یاد ہمیں سب آتے ہیں

جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھو دنیا کو
خوابوں کا کیا ہے وہ ہر شب آتے ہیں

جذب کرے کیوں ریت ہمارے اشکوں کو
تیرا دامن تر کرنے اب آتے ہیں

اب وہ سفر کی تاب نہیں باقی ورنہ
ہم کو بلاوے دشت سے جب تب آتے ہیں

کاغذ کی کشتی میں دریا پار کیے
دیکھو ہم کو کیا کیا کرتب آتے ہیں

○

غزل

پھیلے نہائی اُداسی میں پھر آنسوؤں میں رات
یوں بوند بوند اُتری ہماری گھروں میں رات

کچھ بھی دکھائی دیتا نہیں دور دور تک
چبھتی ہے سوئیوں کی طرح جب رگوں میں رات

وہ کھردری چٹانیں، وہ دریا، وہ آبشار
سب کچھ سمیٹ لے گئی اپنے پروں میں رات

آنکھوں کو سب کی نیند بھی دی خواب بھی دیئے
ہم کو شمار کرتی رہی دشمنوں میں رات

بے سمت منزلوں نے بلایا ہے پھر ہمیں
سناٹے پھر بچھانے لگی راستوں میں رات

○

غزل

ہوا تو کہاں ہے زمانے ہوئے
سمندر کے پانی کو ٹھہرے ہوئے

وفا کا ہر اک نقش مٹ کر رہا
ہوس کے سبھی خواب پورے ہوئے

لہو سب کا سب آنکھ میں آ گیا
ہرے پھول سے جسم پیلے ہوئے

جہاں جائیے ریت کا سلسلہ
جدھر دیکھیے شہر اجڑے ہوئے

بڑا شور تھا جب سماعت گئی
بہت بھیڑ تھی جب اکیلے ہوئے

مناظر بہت دور اور پاس ہیں
مگر آئینے سارے دھندلے ہوئے

ہنسو آسماں بے اُفق ہو گیا
اندھیرے گھنے اور گہرے ہوئے

سنو اپنی ہی بازگشتیں سنو
کرو یاد افسانے بھولے ہوئے

چلو جنگلوں کی طرف پھر چلیں
بلاتے ہیں پھر لوگ بچھڑے ہوئے

○

غزل

نشاطِ غم بھی ملا، رنجِ شادمانی بھی
مگر وہ لمحے بہت مختصر تھے فانی بھی

کھلی ہے آنکھ کہاں، کون موڑ ہے یارو
دیارِ خواب کی باقی نہیں نشانی بھی

رگوں میں ریت کی اک اور تہہ جمی دیکھو
کہ پہلے جیسی نہیں خون میں روانی بھی

بھٹک رہے ہیں تعاقب میں اب سرابوں کے
ملا نہ جن کو سمندر سے بوند پانی بھی

زمیں بھی ہم سے بہت دور ہوتی جاتی ہے
ڈرا رہی ہے خلاؤں کی بیکرانی بھی

طویل ہونے لگی ہیں اسی لیے راتیں
کہ لوگ سنتے سناتے نہیں کہانی بھی

○

غزل

کارِ دنیا سے فرومایہ محبت نکلی
اہلِ دل میں بھی بہت جینے کی حسرت نکلی

تم کہو زیست کو کس رنگ میں دیکھا تم نے
زندگی اپنی تو خوابوں کی امانت نکلی

ابتدا عشق سے افسانۂ ہستی کی ہوئی
انتہا اُس کی مگر صرف مروت نکلی

جوئے خوں آنکھوں سے ہم نے بھی بہائی لیکن
کم ہوا بوجھ ہی دل کا نہ کدورت نکلی

پھر کوئی منزلِ بے نام بلاتی ہے ہمیں
رہنمائی کے لیے دھوپ کی شدت نکلی

پاس کی چیزوں پہ دوری کے دھندلکے چھائے
بچھڑے لوگوں سے ملاقات کی صورت نکلی

○

ایک اُداس رات

تھکی ہوئی آہٹوں کے ہاتھوں نے
بند آنکھوں پہ دستکیں دیں
حصارِ تنہائیوں کا توڑا
ہوا میں کچھ رنگ سے اُڑائے
خلا میں کچھ دائرے بنائے
کسی کی زلفوں کے خم سنوارے
کسی کے چہرے کے دھندلے دھندلے
نقوش مہتاب میں ابھارے
اُدھر کسی آب جو کو چھیڑا
اِدھر کسی شاخ کو ہلایا
یہاں وہاں کچھ چراغ رکھے
تمام شب غم گساریاں کیں
تھکی ہوئی آہٹوں کے ہاتھوں نے
بند آنکھوں پہ دستکیں دیں

اعتراف

ہم بہت بزدل ہیں
ہم اقرار کرتے ہیں
آسمانوں سے اُدھر لے جا کے ہم کو پھینک دو
نیچے بہت نیچے
کان، آنکھیں، ہاتھ، لب
باقی رہیں یا ختم ہو جائیں
بس اتنی التجا ہے
ریڑھ کی ہڈی نہ ٹوٹے
رینگتے رہنے کی یہ عادت نہ چھوٹے

تنبیہہ

وہ جو آسماں پہ ستارہ ہے
اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو
اسے اپنے ہونٹوں سے چوم لو
اسے اپنے ہاتھوں سے توڑ لو
کہ اسی پہ حملہ ہے رات کا

اپنی یاد میں

میں اپنے گھاؤ گن رہا ہوں

دور تتلیوں کے ریشمی پروں کے نیلے پیلے رنگ

اُڑ رہے ہیں ہر طرف

فرشتے جیسے آسمان سے اُتر رہے ہیں صف بہ صف

میں اپنے گھاؤ گن رہا ہوں

آنسوؤں کی اوس میں نہا کے بھولے بسرے خواب آ گئے

خون کا دباؤ اور کم ہوا

نحیف جسم پر کسی کے ناخنوں کے آڑے ترچھے نقش

جگمگا اُٹھے

لبوں پہ لکنتوں کی برف جم گئی

طویل ہچکیوں کا ایک سلسلہ

فضا میں ہے

لہو کی بو ہوا میں ہے

ڈاکٹر وارث کرمانی

ستارہ کی آواز

اک ستارے نے ٹوٹ کر یہ کہا۔
دیکھو اے ساکنانِ روئے زمیں
یہ تباہی ہے کس قدر خاموش

تم نے اب تک اسے نہیں سمجھا
گرچہ تنبیہہ بار بار ہوئی
روز گرم آندھیوں نے لوٹ لیے
جب کہیں خیمہ زن بہار ہوئی
خاکِ یونان و بابل و بغداد
سرمۂ چشمِ روزگار ہوئی
فترِ محمود و شوکتِ ہارون
جلوہ فرماتے مزار ہوئی
آپ اپنا فریب کھا کھا کر
زندگی صرف انتظار ہوئی

دیکھو اے. گمرہانِ خطۂ خاک

کب سے اس جبر کا شکار ہو تم
تم نے اس جبر کو چھپایا ہے
کیسی کیسی بہانہ سازی سے
موت کو زندگی کا نام دیا
فلسفوں کی کرشمہ بازی سے
جہل کو عین علم ٹھہرایا
دفتروں میں دقیقہ طرازی سے
اپنی عظمت کے ڈھول بجوائے
رومی و بوعلی و رازی سے
جن حقائق پہ ناز تھا تم کو
وہ سرِ جادۂ فنا نکلے
جن عقائد پہ جان دی تم نے
وہ جہالت کی انتہا نکلے
کتنے دانشورانِ علم و یقیں
چاک کرتے ہوئے قبا نکلے
کتنے گردن کشانِ تند مزاج
گھر کے مٹی سے جا بجا نکلے

دیکھو اے جاہلانِ پست نہاد

آگ چھائی ہوئی ہے ہر جانب
جل رہے ہیں شجر حجر خاموش
زرد ہوتی ہیں پتیاں چپ چاپ
سوکھتے ہیں گل و ثمر خاموش
مٹتے رہتے ہیں بحر و بر کے نشان
جلتے رہتے ہیں دشت و در خاموش

وار کرتی ہے کوئی شے چھپ کر
لوگ مرتے ہیں در بدر خاموش
کوئی فریاد بھی نہیں کرتا
فکر مجہول ہے، نظر خاموش
اس بھیانک تباہ کاری پر
علم خاموش ہے، خبر خاموش
دیکھو اے ساکنانِ روئے زمیں
یہ تباہی ہے کس قدر خاموش

تنہائی

نجانے کیوں اب اک احساس سا ہر وقت رہتا ہے
کہ میں آبادیوں میں رہ کے بھی شاید اکیلا ہوں
گزرتے جا رہے ہیں کارواں در کارواں انساں
میں اس رستے پہ کتنی دیر سے چپ چاپ بیٹھا ہوں
نظر ملتی ہے جب ان سے تو یہ محسوس ہوتا ہے
کہ یہ نا جنس ہیں میری ضرورت ہی نہیں ان کو
نہ میرے دل سے واقف ہیں نہ میرے دکھ کے ساتھی ہیں
یہ بس رستے پہ مجھ کو دیکھتے رہنے کے عادی ہیں
مجھے ان اجنبیوں سے شکایت ہے نہ شکوہ ہے
کہ یہ تہذیب کے پالے ہوئے شہروں کے باسی ہیں
نہ ان کی رمزیت مجھ میں نہ میری سادگی ان میں
نہ ان کی دہلوی اردو کی تلمیحوں سے میں واقف
نہ میرے پوربی دیہات کی بولی انھیں معلوم
انھیں کتنا ہی میں آواز دوں یہ سن نہیں سکتے
کوئی موسم ہو کوئی شعر ہو کوئی حسینہ ہو
کبھی خوش ہو کے یہ جذبات میں ملا نہیں سکتے
طبیعت ان کی افسردہ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں
جوانی ان کی پژمردہ نہ مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
مقاصد ان کے پوشیدہ کوئی بتلا نہیں سکتا
نگاہیں ان کی دزدیدہ کوئی تہ پا نہیں سکتا
عداوت ان کی ہوتی ہے چھپے ہلکے اشاروں میں
محبت دور سے کرتے ہیں رنگیں استعاروں میں
نفاست عشق کو جذبات میں آنے نہیں دیتی
متانت کھل کے شوقِ وصل فرمانے نہیں دیتی
مجھے اپنی جنوں آگیں محبت یاد آتی ہے
جو سر پر ٹوٹتی تھی وہ قیامت یاد آتی ہے
جسے قدموں سے روندا تھا وہ ماضی چیخ اٹھتا ہے
جو دریا بن گئی تھی وہ طبیعت یاد آتی ہے
ہرے کھیتوں کی مینڈوں پر گھنے باغوں کے سائے میں
قدم رندانہ پڑتے تھے نظر مستانہ اٹھتی تھی
ہوا کاشی کی جانب سے سلامِ شوق لاتی تھی
گھٹا سرجو کے دامن سے لیے میخانہ اٹھتی تھی
مرے بیلوں کی جوڑی تھی کہ گویا دو فرشتے تھے
وہ مجھ کو دیکھتے تھے پیار میں ڈوبی نگاہوں سے
میں ان کی گردنوں میں اپنی باہیں ڈال دیتا تھا

مرے کھیتوں کی وہ ٹھنڈی ملائم مدھ بھری مٹی
کہ جس میں باغبانی کرتے کرتے شام ہو جاتی
مرا جنگل دہک اٹھتا تھا جب ٹیسو کے پھولوں سے
فلک گل رنگ ہو جاتا زمیں گلفام ہو جاتی
میں اپنے گھر سے جب چلنے لگا پردیس کی جانب
مجھے دریاؤں نے آوازہ ہی برسات نے روکا
بہاروں کی نشیلی رنگتوں نے التجائیں کیں
پپیہے ڈھونڈتے پھرتے تھے ہر سمت باغوں میں
لپٹ کر رہ گئی گرد وطن اٹھ اٹھ کے راہوں میں
نسیم صبح گاہی کی وہ نغمگیں نغمہ پیرائی
یہ لگتا تھا وہ میرے پیچھے پیچھے دور تک آئی
وہ دن بھی خواب ہو کر رہ گئے گردش کہاں لائی
گزرتے جا رہے ہیں کاروان در کاروان انساں
میں اس رستے پہ کتنی دیر سے چپ چاپ بیٹھا ہوں
کہ شاید کوئی اپنا جاننے والا نظر آئے
کہ جس سے حال دل کہہ کر ذرا آرام مل جائے
چلو اب زندگی کی دوپہر ڈھلنے کو ہے وارث
ابھی امکان ہے شاید وطن کی شام مل جائے

"زمیں جاگتی ہے"

زمیں مدتوں سے پڑی جل رہی تھی
اچانک سمندر کی جانب سے اک پارۂ ابر
نے ہاتھ اپنا بڑھایا
زمیں کے شرر بار ہونٹوں نے اس ہاتھ کو ایک
بوسہ دیا
تاکہ یہ نشتر نرم و نازک رگِ ابر کو چھیڑ دے
اس کو تم کر برسنے پہ مجبور کر دے
مگر ایک جھونکا ہوا کا جو آیا
زمیں تشنہ لب رہ گئی
اے سمندر کی ٹھنڈی ہوا جا کر آوارہ بادل
سے کہنا
زمیں اب تلک جاگتی ہے
وہ ناآفریدہ خزانے چھپائے تری منتظر ہے
تجھے چاہتی ہے
کہیں دور تخلیق کی آرزو چھپکے چھپکے
تری واپسی کی دعا مانگتی ہے

"تم بہت دور سہی"

تم بہت دور بہت دور بہت دور سہی
مجھ سے تا حشر جدا رہنے پہ مجبور سہی
نارسائی مری قسمت مرا مقدور سہی

پرتوِ حسن سے روشن دلِ ناکام تو ہے
اک حسیں چاند خراماں سا لبِ بام تو ہے

کیوں تمھیں غم ہے مجھے عہدِ بہاراں نہ ملا
کوئی سرمایۂ تسکینِ دل و جاں نہ ملا
تم سمجھتے ہو مجھے درد کا درماں نہ ملا

میں تو یوں خوش ہوں مرا درد خوش انجام تو ہے
اک حسیں چاند خراماں سا لبِ بام تو ہے

گرد میں صورتِ امید چھپی جاتی ہے
زندگی ریگِ رواں بن کے اڑی جاتی ہے
تشنہ کامی سے جہاں سانس رکی جاتی ہے

آگے آگے کوئی ہاتھوں میں لیے جام تو ہے
اک حسیں چاند خراماں سا لبِ بام تو ہے

سوچتا ہوں کہ وہی عزمِ جواں لے کے چلوں
نکہتِ گل، رنگ و لبِ نغمہ فشاں لے کے چلوں
صبحِ رفتہ کا نگاہوں میں سماں لے کے چلوں

کچھ اجالا سا بہر حال سرِ شام تو ہے
اک حسیں چاند خراماں سا لبِ بام تو ہے

شمعِ کافور

اب نہ وہ رات کی محفل ہے نہ دھندلے سائے
تیز جھونکوں نے بجھا دی ہے وہ شمعِ کافور
گھولتی رہتی تھی جو نیند کو بیداری میں
ابر سا ذہن پہ جو سایہ فگن تھا نہ رہا
اک تمازت سی دل و جاں میں اتر آئی ہے
خواب و الہام کی ہر شکل کو پگھلائے ہوئے
سر برہنہ نظر آتا ہے جہانِ بے خواب
اپنے مبہم نظریات کو دہلائے ہوئے
وہ حقائق جو حجابات میں خوابیدہ رہے
بن کے خنجر سرِ بازار نکل آئے ہیں
کوہساروں میں دلِ سنگ کو دھڑکائے ہوئے
جن کو ماضی میں اٹکتے ہوئے ڈرتا تھا دماغ
وہ خیالات وہ افکار نکل آئے ہیں
ذرہ ذرہ میں دبی آگ کو بھڑکائے ہوئے
اب نہ عیسیٰ ہے نہ اسحاق نہ الیاس کوئی
اس جہاں سوز تمازت میں نہیں پاس کوئی

لوگ اس آگ کے طوفان میں گھبرائے ہوئے
اپنے اجداد کے مرقد کی طرف جاتے ہیں
کہ یہیں کاش کہیں جائے مفر مل جائے
کیسی منزل ہے جہاں وہم و گماں بھی نہ رہا
اک یقیں صرف یقیں سخت یقیں تلخ یقیں
خود فریبی کے ہر امکان کو جھٹلائے ہوئے
شب کی وحشت کا یقیں دن کے عتابوں کا یقیں
آفرینش کے غضبناک عذابوں کا یقیں
فکرِ ترتیب میں روپوش تصادم کا خیال
عزمِ تعمیر میں پوشیدہ خرابوں کا یقیں
نازپروردہ حسینوں کے لب و رخ کا غبار
تیرِ تخلیق کے آفات و حوادث کا یقیں
جسم میں زہرِ مہ و سال اترنے کا ملال
دشت میں مرگ کے پیرِ دشت بکھرنے کا یقیں
اب وہ امید وہ ابہام کہاں سے آئے
اب نہ وہ رات کی محفل ہے نہ دھندلے سائے
تیز جھونکوں نے بجھا دی ہے وہ شمعِ کافور
گھولتی رہتی تھی جو نیند کو بیداری میں

غزل

بہت دنوں میں جو وہ ہم سے ہم کلام ہوئے
دل و نظر ہمہ تن سجدہ و سلام ہوئے

شفق سی خیمۂ جاناں کی سمت باقی ہے
تمام وادی و کہسار غرقِ شام ہوئے

کئی گلے تھے جو شورِ جہاں میں ڈوب گئے
کئی ستم تھے جو احسان بن کے عام ہوئے

کسی طرف جنھیں راہِ گشادہ مل نہ سکی
کچھ ایسے لوگ بھی دنیا میں نیک نام ہوئے

افق کے پار کہیں سے لہو اچھلتا ہے
زمیں سے دور بھی کیا کیا نہ قتلِ عام ہوئے

چلے تھے ان کی شکایت کو حضرت واعظ
کچھ اور موردِ تضحیکِ خاص و عام ہوئے

○

غزل

شہر میں پھر وہ ہیں میہماں آجکل
رنگ و بو کی کھلی ہے دکاں آجکل

عکسِ رخسار میں غرق ہیں بام و در
ہر مکاں ہے گلِ ارغواں آجکل

کفشِ پا نے ستارے سے بکھرائے ہیں
خاک میں ہے پڑی کہکشاں آجکل

مشک ہی مشک کے ڈھیر ہیں ہر طرف
زلف ہی زلف ہے حکمراں آجکل

عام ہے دعوتِ چشم و لب ان دنوں
مفت ہے چارۂ دردِ جاں آجکل

وعظ متروک ہے، شیخ مغرور ہے
اہلِ دل کو ملی ہے اماں آجکل

○

زاہدہ زیدی

تخریب

ہم کہ اک اجنبی موڑ پر
تشنہ لب، پا برہنہ، بڑی دیر سے
جانے کس چیز کے منتظر ہیں

ہم نے بنیمِ جنوں کی شراب کہن
ایک صحرائے بے برگ و بر میں لنڈھا دی
ہم نے لمحاتِ شب کی متاعِ گراں
فکرِ عکسِ نگارِ سحر میں لٹا دی
ہم نے سیماب پا، شعلہ رُخ زندگی —
ایک موہوم عزمِ سفر میں بتا دی

ہم نے ریشم کے کیڑے کی مانند
اپنے برہنہ بدن کے لیے
نرم و رنگین خوابوں کا خلعت بُنا
اور پھر رفتہ رفتہ
اسی تنگ و تاریک سے ریشمی خول میں
شوق کی سانس گھٹنے لگی
آرزو کا لہو جم گیا
اور ریشم کے کیڑے کی مانند — ہم
اپنے وا ماندہ احساس کی قبر میں سو گئے

اور اب ہم کسی اجنبی موڑ پر
تنہا، زرد خوابوں کے دامن میں لپٹے ہوئے
تشنہ لب، پا برہنہ، بڑی دیر سے
جانے کس چیز کے منتظر ہیں . . . .

۶۶ء ________

فاصلے

فاصلوں سے پرے
فاصلے ______
فاصلے ______
ہم نے سوچا تھا
صحرائے بے برگ و بر سے اُدھر
کوئی منزل
ہمارے لیے منتظر ہے
مگر ______
جیسے، جیسے قدم
آگے بڑھتے گئے
ہم نے دیکھا
کہ صحرا کے آگے بھی
اک اور صحرا تھا۔ پر

کوئی منزل نہ تھی ——
ہم نے سمجھا تھا
ان فاصلوں سے پرے
آسمان و زمیں
خود ہی مل جائیں گے
لیکن ——
ان فاصلوں سے پرے
کچھ نہ تھا
بس وہی
فاصلے ——
فاصلے ——

[illegible] ——

طوفان

—— اور طوفان آیا
گرجتا ہوا
رقص کرتا ہوا
تند موجوں کے بربط پہ گاتا ہوا
—— شوخ لہروں کے ریلے
بڑھے ——

اور پھر
میرے پاؤں میں
طوفان کی انگلیاں
اور ہونٹوں پہ نمکین بوسے
نگاہوں میں سیال چنگاریاں
..... میرا عریاں بدن
شوخ موجوں میں لپٹا ہوا
میری نس نس میں موجوں کی گردش تھی
سینے میں اک کھلبلاتا تلاطم
.... کوئی طوفان آیا

موج در موج
گزرا ہے شاید کوئی
جسم پر
جگمگاتی ہوئی ریت ہے
اور سینوں پہ اس لمس کی برکتیں
—— ہونٹوں پہ ہلکی نمی
نیم خوابیدہ نظروں میں نیلی فضائیں....

سمندر کے پنہاں خزانے
بڑی دور تک
خشک ساحل پہ بکھرے ہوئے ہیں

[illegible] ——

مرا فن —— مرا درد

مرا درد ——
کائی لگے فرش پر
رینگتا ہے —— گر
سرد ا
سنسان
راتوں میں
شعلے جگاتا نہیں

مرا فن ——
ستاروں پہ
چنچل، سنہری کمندیں
گراتا نہیں
ریگزار تمنا میں جاتا نہیں
درد کی تنگ گلیوں میں
نظریں جھکائے کھڑا ہے

مرا فن ——
بھکاری ہے شاید
نہیں —— منفعل ہے
نہیں —— خالی
کشکول ہے

درد کی بھیک ملتی نہیں

مرا درد ——
اڑی ہوئی دھند ہے
اپنے ہی آپ میں
پیچ کھائے ہوئے
فن کی آغوش ملتی نہیں

مرا فن ——
مرا درد ——
فن ——
درد ——
در
در
اگر
یوں بھٹکتے رہے
چند صدیوں
ابھی اور ——
پھر
کون
ہر
ئے
کو
اس کا نیا نام
ہر شام
بتلائے گا

—— ۱۹۶۶ء

وہ حرف و صوت، وہ صدا

وہ حرف ——
جو نغمۂ نیلگوں کی وسعتوں میں قید تھا

وہ صوت ——
جو حصارِ خامشی میں جلوہ ریز تھی
صدا جو کوہسار کی بلندیوں پہ محوِ خواب تھی
زوالِ برف سے ڈھلکی
وہ لفظ جو ہوا کے نیلے آنچلوں سے
چھن کے
جذب ہو رہا تھا
ریگ زارِ وقت میں
جو ذرہ ذرہ منتشر تھا
دھندلی دھندلی ساعتوں کی گرد میں
وہ معنیٔ گریز پا ——
لرز رہا تھا جو رگِ حیات میں

وہ رمزِ منتظر ——
کہ جو کبھی نہاں تھا بطن کائنات میں...

وہ حرف و صوت، وہ صدا
وہ لفظِ منتشر —— ...
وہ رمزِ منتظر —— ...
وہ معنیٔ گریز پا —— —

بس ایک جست میں
حصارِ خامشی کو توڑ کر
پگھل کے میرے درد و آرزو کی آنچ میں
وہ میرے نطق کی صباحتوں میں ڈھل گیا

وہ آبشارِ نغمہ و نوا
کہ کوہسارِ سر سے گرا
کہ گونجتی گپھاؤں سے ابل پڑا
وہ جوئے ذات
نغمۂ حیات
جو رواں دواں ہے
بحرِ بیکراں کی کھوج میں ....

—— ۶۲ء

درد کا کالا سمندر

غارِ ماضی سے نکالو
درد کا کالا سمندر
نیند کے بن میں بلا لو
درد کا کالا سمندر
ظلمتِ شب میں اچھالو
درد کا کالا سمندر
اپنے کمرے میں بچھا لو
درد کا کالا سمندر

جسم کی لہروں میں ڈھالو
درد کا کالا سمندر
لمس کے شعلے میں پالو
درد کا کالا سمندر
دن کی آندھی میں بچالو
درد کا کالا سمندر
قطرے قطرے میں سنبھالو
درد کا کالا سمندر
لفظ کے ساغر میں ڈھالو
درد کا کالا سمندر
ساز کی سرگم بنالو
درد کا کالا سمندر
راگ کے سانچے میں ڈھالو
درد کا کالا سمندر
ڈوب کر اپنے میں پالو
درد کا کالا سمندر
گوشۂ دل میں چھپالو
درد کا کالا سمندر

۶۴ء

آسماں دور ہے

کس کو اپنا کہیں
آسماں دور ہے
اور دھرتی کے سینے پہ ہیں زخم لاکھوں
جو ممتا کبھی اُمڈے
تو چھاتی سے کیسے لگائے......

گرم تاریک بوسوں سے بوجھل ہوا
شکستہ، ادا، ماندہ لمحات کے دوش پر
ہے رواں.. ....
اس کو معلوم کیا
شب کا دردِ نہاں
شب ضعیفہ ہے شاید کوئی
بسترِ مرگ پر
اپنی بے ربط سانسوں میں اُلجھی ہوئی
کیا خبر کب وہ لینے لگے
آخری ہچکیاں

درد کی ڈور کٹ جائے گی
شب گزر جائے گی.......
چھوڑ کر اس کی میت وہیں
دن پرانے سفر پر نکل جائے گا
راہ میں
سینکڑوں مرحلے
منتظر پائے گا

ایک تاریک مبہم لکیر
نوکِ نشتر کی مانند
سینے میں چبھ جائے گی
بحرِ ساکت کے زیریں تلاطم میں
لہرائے گی

۶۴ء

ڈاکٹر ذکاءالدین شایاں

غزلیں

○

صبح کا دل نظر آیا وہی ٹوٹا ٹوٹا!
رات کے ہاتھ سے شاید کوئی شیشہ ٹوٹا

زندگی شاخ سے تا سنگ رہی سبز فریب
خون میں اپنے نہاتا رہا ہر گل بوٹا

ہم تو تھے دھوپ۔ چٹانوں پہ جلے اور بجھے
رات کیوں آئینوں کے رُخ سے پسینہ چھوٹا

حرص آلودہ شعاعوں نے جو تھیں دن کی چور
آتشیں جسموں کا سب شبنمی زیور لوٹا

پرزے پرزے ہیں خیالات کہاں وہم و یقین
تیز آندھی میں تو اب دل کا بھی دامن چھوٹا

منھ لگائیں بھی کیا! ہے چکھا ہوا آبِ حیات
اے لبِ زیست! ترا سارا تقدس جھوٹا!

○

منزل کسی کرن میں چبھو جائے گی ہمیں
اب رات راستے ہی میں ہو جائے گی ہمیں

نیرنگیوں کو چہرے ترس جائیں گے ترے
مت کھیل ہم سے زندگی، کھو جائے گی ہمیں

جاگے ہوئے بہت ہیں، وہ بکھری ہوئی مہک
لے کر کسی خیال میں سو جائے گی ہمیں

یا دل کا جسم، جھرنوں کا دل، سب ہیں آب ریز
ہر آنکھ اپنے حال میں رو جائے گی ہمیں

وہ لفظِ بدنما ہیں کہ تصنیفِ زندگی
دھبے بنائے گی، کبھی دھو جائے گی ہمیں

جائیں کہاں! بھنور میں ہر موجِ بدن کا رقص
ندی چڑھی ہے آج ڈبو جائے گی ہمیں

○

سرد خوشبو کی رگوں میں خون دوڑائیں گے ہم
چاندنی بجھنے تو دو پھر آگ برسائیں گے ہم

سخت جانوں کا یہ شہر بے اماں ہے، تو رہے
پتھروں کے درمیاں اک نہر بن جائیں گے ہم

دیکھنا یہ ہے، ہمیں اب کون سمجھے گا یہاں
اُس کے ہونٹوں پر ادھوری بات ہو جائیں گے ہم

اپنے حق میں تیز سورج ہی سے ہیں شادابیاں
بارشیں جتنی بھی ہوں گی اتنے کمھلائیں گے ہم

کالے پیلے موسموں کا سرخ، نیلا ہے مزاج
گرم چٹانوں سے برگِ سبز تک آ جائیں گے ہم

صبح جیسے چہروں پہ ہے کس لیے افسردگی
رات ہی بھر کے مسافر ہیں چلے جائیں گے ہم

○

کوئی شاخ بدن اُلجھے گھٹا سی ٹوٹتی جائے
خیالوں میں مرے موجِ ہوا سی ٹوٹتی جائے

شکستِ دل کا عالم، آہٹوں کا نرم سناٹا
بیاباں میں کوئی آوازِ پا سی ٹوٹتی جائے

لرزتی چاندنی، نمبوس خوشبو، دم بخود منظر
ہمارے سر پہ راتوں کی بلا سی ٹوٹتی جائے

شکستہ روح کی پرچھائیاں تک کسمسا اٹھیں
نفس کے ساتھ دیوارِ قبا سی ٹوٹتی جائے

اندھیروں کا ہے جسلِ آتشیں کرنوں کو پگھلا دو
سیہ پانی پہ زنجیرِ صبا ٹوٹتی جائے

فضائیں گھٹ رہی ہیں، اپنے ہونٹوں کے ورق کھولو
جھجکتی جائے خاموشی، اداسی ٹوٹتی جائے

آفتاب شمسی

○

تنہائی کی قید میں آ کر اور بھی کچھ بے نور ہوئے
خوابوں کے آئینے دیکھو کیسے چکنا چور ہوئے

رات گئے اک سناٹا سا ذہن میں راہ بناتا ہے
پھر لگتا ہے اپنے آپ سے ہم بھی کوسوں دور ہوئے

زخموں کی نگرانی میں بھی ہم نے کیا کوتاہی کی
دیکھو فصلِ گل آنے تک سب ناسور ہوئے

جسموں کی سرحد پر آ کر چہرے رنگ بدلتے ہیں
جن ہاتھوں کو چھونا چاہا وہ نظروں سے دور ہوئے

نام لکھا تھا ہم نے اس کا بہتے پانی پر اک دن
بس اتنی سی بات تھی جس پر افسانے مشہور ہوئے

○

سبھی بچھڑ گئے مجھ سے گزرتے پل کی طرح
میں گر چکا ہوں کسی خواب کے محل کی طرح

حصارِ جسم میں روتا کراہتا دن رات
مجھے ڈراتا ہے کوئی مری اجل کی طرح

یہ شہر ہے یہاں اپنی ہی جستجو میں لوگ
ملیں گے چلتے ہوئے چیونٹیوں کے دل کی طرح

میں اُس سے ملتا رہا آج کی توقع پر
وہ مجھ سے دور رہا آنے والے کل کی طرح

نگاہیں اُس کی بتاتی نہیں ہیں دل کا حال
کسی معمّے کے محفوظ رکھے حل کی طرح

نگر میں ذہن کے پھر شام سے ہے سناٹا
اداس اداس ہے دل میرؔ کی غزل کی طرح

نڈھال دیکھ کے بستر میں نیند کی پریاں
پھر آج مجھ سے خفا ہو گئی ہیں کل کی طرح

واپسی کے لیے

لگا کر اپنی کشتی کو کنارے
ندی کے پار کچے راستے پر
کہیں دو سائے بھاگے جا رہے ہیں
مگر دانائی دیکھو راستے کی
جو اپنے اوس سے بھیگے بدن پر
نشان پیروں کے لیتا جا رہا ہے
کہ نادم ہوں اگر اپنے کیے پر
نشانوں کے سہارے لوٹ آئیں!

معمول

زمین گھومتی ہے روز اپنے محور پر
فلک کھڑا ہے اُسی طرح سر اُٹھائے ہوئے
دنوں کے پیچھے لگی ہیں اُسی طرح راتیں
سفر ہے جاری اُسی طرح اب بھی لمحوں کا
ہوا کے دوش پہ خوشبو کے قافلے اب بھی
رُتیں، پہ ملنے کے پیغام لے کے آتے ہیں
ہوا کے بیچ مگر فاصلے جو قائم ہیں
کسی طرح نہیں کم ہوتے بڑھتے جاتے ہیں!

ڈاکٹر کبیر احمد صبا جائسی

غزلیات

(۱)

یوں تو ہر زخم تجھے ہم نے دکھایا بھی نہیں
لیکن اے دوست کوئی راز چھپایا بھی نہیں

ہاں یہ سچ ہے کہ حقیقت کی طرح یاد نہیں
خواب کی طرح مگر تجھ کو بھلایا بھی نہیں

کیوں گلے ملتے ہیں رہ رہ کے حوادث مجھ سے
مجھ پہ جو گذری ہے وہ میں نے بتایا بھی نہیں

اپنا سرمایہ جو تھا ایک چراغِ امید
یونہی جلتا رہا اور ہم نے بجھایا بھی نہیں

زندگی یوں تو کوئی چھاؤں ہمیں دے نہ سکی
ریگ زاروں میں مگر اس نے تپایا بھی نہیں

کوئی بتلاؤ کریں کس طرح اپنوں کی تلاش
ایسی منزل پہ جہاں کوئی پرایا بھی نہیں

یوں رہے محرمِ سفر عالمِ حیرت میں صبا
اپنا دامن کبھی کانٹوں سے بچایا بھی نہیں

(۲)

ہاں، خوشی بھی ہم کو راس آئی بہت
لیکن اس نے آگ برسائی بہت

کیا کیا تو نے سکونِ زندگی
بھولنے والے کی یاد آئی بہت

شکریہ تیرا ہجومِ حادثات
بڑھ چلی تھی میری تنہائی بہت

اپنے ہی ہاتھوں سے بکھرے اپنے خواب
ہم نے جینے کی سزا پائی بہت

جانے کیا سوچا مری آواز نے
گنبدِ بے در سے ٹکرائی بہت

کیوں ہوا نازل نہیں یہ سب عذاب
زندگی کے تھے تماشائی بہت

جب ہوئے آسودۂ منزل صبا
یاد آئی آبلہ پائی بہت

(۳)

حکایاتِ قدر و قضا چھوڑ دو
مجھے یونہی الجھا ہوا چھوڑ دو
کہاں تک چلوگی خلا در خلا
ہواؤ، مرا راستہ چھوڑ دو
یہاں کون ہے کس لیے میں جلوں
سرِ شام مجھ کو بجھا چھوڑ دو
بنا دے نہ پتھر صداؤں کا رس
بس اب ساز کو بے صدا چھوڑ دو
کرو کچھ تو اب خیرہ چشمی پہ رحم
جو پردہ گرا ہے، گرا چھوڑ دو

(نا تمام)

ڈاکٹر اسما سعیدی

غزل

شدّتِ اضطراب کا بھیجا ہوا پیام ہے
اپنی یہ ایک عرضِ شوق آج کسی کے نام ہے

اب نہ وہ لطفِ بیخودی اب نہ وہ دورِ جام ہے
اب نہ فراغِ صبحِ عیش اب نہ سرورِ شام ہے

ختم ابھی کہاں ہوئیں قیدِ قفس کی خصلتیں
طائرِ صحنِ گلستاں آج بھی زیرِ دام ہے

ہوتی رہی ہے شام و صبح آج تک کچھ اس طرح
فرق نہ کر سکے یہ ہم صبح یہ ہے کہ شام ہے

کیوں یہ ابھی سے اضطراب کیوں یہ ابھی سے بیخودی
ٹھہر تو دل کہ یہ ابھی جلوۂ ناتمام ہے

لاکھ نقاب اُٹھ چکے سامنے ہیں حقیقتیں
اہلِ جفا و جور میں پھر بھی ہمارا نام ہے

ہم سے نہ پوچھئے کہ ہے مشغلۂ حیات کیا
کوششِ خود فراموشی آج بھی اپنا کام ہے

عقل کی سو مسافتیں عشق کا ایک ہی قدم
فاصلہ فرش و عرش کا دل کا بس ایک گام ہے

پختگیٔ شعور نے دی ہے وہ وسعتِ نظر
آج نظر میں ہر مقام منزلِ نا تمام ہے

گزری تھیں جو کسی کے ساتھ دل نہ اُنھیں بھلا سکا
اب بھی تصورات میں صبح وہی وہ شام ہے

حسنِ نظر سے مدتوں دل نے فریب کھائے ہیں
حسنِ نظر کو آخری آج مرا سلام ہے

اپنی ہی کوششوں سے ہم پائیں گے فرحِ زندگی
کوئی بھی شے بغیرِ سعی اپنے لیے حرام ہے

ذہن و نظر میں ضوفشاں کس کی ہیں جلوہ ریزیاں
حسن یہ کس کا دلنشیں بن کے مرِ تمام ہے

کس کے لیے روش روش پھول کھلے ہیں اے بہار
کس لیے موجِ گُل کا آج اس قدر اہتمام ہے

کون یہ آ گیا یہاں رُوحِ بہار جاگ اُٹھی
جنبشِ بادِ صبح بھی جس کے نثارِ گام ہے

موجِ تجلیات سے نور ہی نور ہر طرف
کس کے فروغِ حُسن سے آج ضیائے عام ہے

ہم نے ہی خواہشات پر اتنا لگائی ہیں حدیں
ہم نے سمجھ لیا یہاں خواہشِ دل حرام ہے

اکبر علی خاں عرشی زادہ

غزل

آج بھی اپنا جنوں رسم پرانی مانگے
سرِ شوریدہ کوئی دشمنِ جانی مانگے

زلف و رخسار سہی یا رسن و دار سہی
جو بھی مانگے ہے سو ایامِ جوانی مانگے

چشمِ نمناک جگر خوں شدہ داماں صد چاک
عشق ہر گام پہ اک تازہ نشانی مانگے

اُس کا خود اپنا لہو آئے گا آخر کس کام
جو بہاروں کے لیے ابر سے پانی مانگے

کچھ تو آشفتہ بیانی ہے طبیعت اپنی
کچھ تری بزم بھی آشفتہ بیانی مانگے

ہم کہ افسانے نہیں بنتے حقائق ہم سے
اور زمانہ کہ حقائق میں کہانی مانگے

ہر ادا چاہے تری غالبِ پرکار سا فن
نقشِ پیکر کا ترے خامۂ مانی مانگے

ساز ڈھونڈے ہے تری شوخیِ آواز کی آنچ
طبعِ شاعر ترے قدموں سے روانی مانگے

غزل

دوانے کو قابو کیا جائے نا
وہ نام اُس کے آگے لیا جائے نا

بہاروں کا بھی ہم پہ کچھ حق تو ہے
بہاروں میں دامن سیا جائے نا

محبت کہ امرت بھی ہے زہر بھی
ہر اک سے یہ پیالا پیا جائے نا

ذرا اُس کو آنکھوں سے بھی کہہ کے دیکھ
سندیسہ جو مکھ سے دیا جائے نا

ترے غم کے ہاتھوں بہت جی لیے
کہاں تک جئیں اب جیا جائے نا

نذرِ خسرو

خسروا! ہند وہی بزمِ بتاں ہے کہ جو تھا
تازہ اب بھی ترے خوابوں کا جہاں ہے کہ جو تھا

مرگ نین آج بھی اس دیس میں ہیں مد ماتے
ان کے تیروں سے وہی دل پہ نشاں ہے کہ جو تھا

اب بھی یوں حسن سنورتا ہے کہ پڑھیے ترے شعر
عشق پر آج بھی صادق وہ گماں ہے کہ جو تھا

اب بھی گفتار کو ملتے ہیں سلیقے تجھ سے
تیری باتوں میں وہی حسنِ بیاں ہے کہ جو تھا

آج بھی یاد ہیں لوگوں کو محبت کے سبق
تجھ سے وہ ولولۂ شوق جواں ہے کہ جو تھا

آج بھی تیرے تخیّل کے صنم خانوں میں
وہی آوازۂ ناقوس و اذاں ہے کہ جو تھا

خانقاہوں میں ترے قول سے ہے مستی و کیف
اہلِ دل کے لیے تو پیرِ مغاں ہے کہ جو تھا

برہمن آج بھی خوش ہے تری بانی سن کر
دیر میں آج بھی تو زمزمہ خواں ہے کہ جو تھا

آج بھی گوری کو بابل سے جدائی پہ سہاگ
دل سے نکلا ہوا اندازِ فغاں ہے کہ جو تھا

کہہ مکرنی ہو کہ نسبت ہو کہ ہوں دو سخنے
اب بھی فن کے لیے تو روحِ رواں ہے کہ جو تھا

آج بھی جی میں ہے اک تجھ سے پہیلی بوجھیں
چیستاں مرحلۂ سود و زیاں ہے کہ جو تھا

تیرے گیتوں سے اترتے ہیں ستارے دل میں
تیری ایجادوں سے اک طرفہ سماں ہے کہ جو تھا

جب تلک اس دیس میں نغموں سے جواں ہیں راتیں
تیرے بولوں کا وہی نرخ گراں ہے کہ جو تھا

مطبوعہ سہ ماہی "گفتگو" بمبئی ستمبر و دسمبر ۱۹۶۷ء ص ۲۰۶، ۲۰۷

فضا میں گونج رہی ہے دلوں کا درد لیے
ترے گلو کی ادا تیری نقرئی آواز

ہوا کے دوش پہ لرزاں ہیں حلقہ ہائے نوا
بکھر رہے ہیں خلاؤں میں رازِ شوخیِ ساز

نفس نفس ہے ترنم کی سرخوشی کو فروغ
روش روش ہے نئی کیفیت نیا اعجاز

ترے لبوں سے یہ پھوٹی ہوئی جواں کرنیں
یہ تیری لے یہ ترا سوز یہ تری پرواز

یہ کنج کنج ابھرتے ہوئے گلِ نغمہ
جہاں کو بخش رہے ہیں سبک سبک انداز

ہجومِ فتنۂ دوراں خیالِ ماہ رُخاں
کسی کے حسن کی لغزش کسی نظر کا خمار

امید و بیم سے پُرداغ بے شمار داغ
فریبِ کشمکشِ دہر در پئے آزار

ہزار سلسلہ ہائے ستم جلو میں لیے
زمانہ درد کے ماروں سے بر سرِ پیکار

کوئی خموش بسِ پردۂ جفائے رسوم
خیالِ تازہ کو سوزش میں دے رہا ہے فشار

چراغِ رہ گزرِ باد ہے متاعِ نگاہ — ہر ایک سمت اندھیرا ہر ایک سمت غبار

ہر ایک لمحہ بدلتی ہے گردشِ گیتی ! — ہر ایک لمحہ اجڑتے ہیں مفلسوں کے شباب
ہر ایک زلف پریشاں ہر اک کلی مایوس — ہر ایک سینہ ہے صد چاک ہر جگر ہے کباب
کوئی نہیں ہے مسیحا کوئی نہیں غم خوار — ہر ایک ہاتھ میں نشتر ہر اک دوا زہر آب
تصورات خوش آئیں۔ ایک خوابِ گراں — سرور و مستی و جوشش و طرب ہوئے نایاب
ہر اک رُخ نگہِ قہر ہر طرف شورش — ہر اک قدم پہ تلاطم ہر ایک گام سراب

کہاں کہاں نہ ہوئی پست عظمتِ آدم — کہاں کہاں نہ مٹی شوخ زندگی کی لکیر
کہاں کہاں نہ ستاروں نے ٹھوکریں کھائی — کہاں کہاں نہ نگوں ہو گیا خطِ تقدیر
کہاں کہاں نہ کیے رقص طوق لے لے کر — کہاں کہاں نہ بجائی ہے پاؤں کی زنجیر
کہاں کہاں نہ رسن کو گلے لگایا ہے — کہاں کہاں نہ لکھی اپنے خون سے تحریر
کہاں کہاں نہ سزاوارِ دار ٹھہرے ہیں — کہاں کہاں نہ ہوئی ہم پہ کاوشِ تعزیر

کبھی کبھی اسی پر ہول تیرگی میں مگر — ستم کشوں کی تمنا چمک بھی جاتی ہے
کبھی کبھی ترے آہنگِ سادہ کی تاثیر — فریب خوردوں کو طرزِ وفا سکھاتی ہے
کبھی کبھی ترے نغموں کا بوجھ اٹھائے ہوئے — خزاں کو چھیڑنے فصلِ بہار آتی ہے
کبھی کبھی تو سمٹتے ہیں ظلم کے بادل — کبھی کبھی تو فضا گیت گنگناتی ہے
کبھی کبھی تو دلِ غم زدہ ہنستا ہے — کبھی کبھی تو مسرت بھی بار پاتی ہے

یہ زیر و بم یہ تری لہر، تیرا فن، ترا لحن — نظامِ کہنہ کو دیتے ہیں ایک شکلِ جمیل
مغنیہ تری آتش نوائیوں کی قسم — خرامِ نغمہ ترا صلح و آشتی کی قسم
اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہوں میں — مرے لیے ہے ترا شعلۂ نوا قندیل"
فسونِ زیست میں ملتا نہیں قرارِ دوام! — جنونِ عیش کی ہوتی نہیں کبھی تکمیل
تری صداؤں کے سیلاب میں خرد تج دیں — بس ایک راہ یہی ہے بس اک یہی ہے سبیل

گلوں پہ گرتے ہیں جس طرح قطرۂ شبنم — شرابِ ناب مچل جائے جیسے در تہِ جام
چھنک کے جیسے کوئی غنچہ روح چونکا دے — رباب چھیڑے کوئی جیسے چاند کے ہنگام
ردائے شب میں کبھی دامنِ سحر میں کبھی — فسردہ ذہن پہ ہوتی ہے بارشِ الہام
تری عطا کا یہ صدقہ ترے کرم کا طفیل — بھلائے بیٹھا ہوں ادبارِ گردشِ ایام
فنائیوں کا تصادم لطافتوں کا خروش — سلام لکھتا ہے شاعر ترے خلوص کے نام

سکوتِ رنج و الم کی اداس راہوں میں — جہاں جہاں بھی ترا رشتۂ دل ہوا ہے دو نیم
تھکی ہوئی مری نظریں تھکی رہیں لیکن! — "فنائے سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم"
کبھی حیاتِ گریزاں کے کام آئے جا! — کبھی تو سخت ہیں اوقات، مرحلے ہیں عظیم
کبھی رکا تو نہیں ہے سفینۂ غمِ دل — ابھی ہوئی تو نہیں ہے سکون کی تنظیم
یہ آسرا بھی بڑا آسرا ہے جینے کو! — چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا یہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا"

مطبوعہ نقوش اگست ۱۹۶۰ء

جنابِ منظور ہاشمی

غزل

بس ایک نقشِ خیالی سا رہ گزار میں تھا
نہ قافلے میں تھا شامل نہ میں غبار میں تھا

نجانے کون سے موسم میں پھول کھلتے ہیں
یہی سوال خزاں میں یہی بہار میں تھا

ہر ایک سمت ہوا کے عظیم لشکر تھے
اور اک چراغ ہی میدانِ کارزار میں تھا

کھنچی ہوئی تھی مرے گرد واہموں کی فصیل
میں قید اپنے بنائے ہوئے حصار میں تھا

تمام عمر دکانیں سجائے بیٹھے رہے
زیان اگرچہ تمنا کے کاروبار میں تھا

کوئی کہیں تھا نہ مہمان آنے والا تھا
کواڑ جانے کھلا کس کے انتظار میں تھا

مرے شجر پہ مگر پھول پھل نہیں آئے
وہ یوں تو کھلتے درختوں ہی کی قطار میں تھا

غزل

سبھی کے ظرف کو یوں آئینے دکھائے تھے
دیارِ سنگ میں شیشے کے گھر بنائے تھے

بس اک خدا کی پرستش اصول تھا ان کا
ہر ایک شخص نے اپنے ہی بُت بنائے تھے

یہ بات الگ ہے کہ اک دن کی بادشاہت تھی
پر اپنے نام کے سکّے تو کچھ چلائے تھے

مہک رہا تھا ترا خط تمام خوشبو سے
ہر ایک لفظ میں کیا پھول سے کھلائے تھے

اداس آنکھوں میں خوابوں کی فصل سوکھ گئی
ہرے درخت کہاں ریت میں لگائے تھے

اب ان فضول سی باتوں پہ خوب ہنستے ہیں
کبھی انھیں کے لیے اشک بھی بہائے تھے

ڈاکٹر زیدی جعفر رضا

(۱)

سر جھکائے کھڑے تھے کچھ الفاظ
مایوسیوں کی ردا اوڑھ کر
اور کچھ
اپنے چہروں پہ چپکائے بےجان سا اشتہارِ خموشی
ملے مجھ کو بازار میں
سو رہے تھے کچھ الفاظ فٹ پاتھ پر
ٹانگ پھیلائے
دنیا کے ہنگاموں سے بے خبر
گفتگو میں نے لفظوں سے کی
تو بتایا گیا
سب کرشمہ ہے تقدیر کا
ورنہ الفاظ ایسے بھی ہیں
جن کے ادنیٰ اشاروں پہ
ہوتا ہے سب کچھ یہاں

(۲)

عصا اژدہوں کو نگل جائے
دریا میں راہیں بنائے
ہتھیلی سے ہر نور سا طلع
یہ قصے بڑے دل نواز ہیں
مگر
______
اس جگہ تو یہ کچھ بھی نہیں تھا
وہاں تو
تشدد کے دریا میں
تشنہ لبی کا سفینہ
مخالف ہواؤں سے ٹکرا رہا تھا
نہا کر خود اپنے لہو میں
رضائے الٰہی کا سودا کیا جا رہا تھا
وہاں بے زبانی تھی
جو ناوکوں کی زباں بند کر گئے

تشدد کی بے مائیگی پر ہنسی تھی
وہاں رسیاں ظلم کی
صبر و ایثار کی تیغ سے کٹ رہی تھی
وہ کیسے بشر تھے
کہ جن کے مقابل میں فرعون کو
فتح پا کر بھی آخر میں جھکنا پڑا تھا۔

کالی چھپکلی بڑھ کر نکل جائے گی
میں پھر بھی ہنسوں گا
قہقہے گونجیں گے
دیواریں نگل جائیں گی سارے قہقہے

---

(۳)

ٹیوب لائٹ کی طرح
پھیلی ہے کمرے کے ہر اک گوشہ میں
میری دھڑکنوں کی روشنی
الماری پر سجی ہیں
میرے ماضی کی کتابیں
جن کے ہر صفحہ پہ میری داستاں لکھی ہوئی ہے
الماری زندگی ہے
اور کتابیں زندگی کا ماحصل ہیں
اور یہ سب میرا بدل ہیں
اور میں کچھ بھی نہیں ہوں
روشنی کے نام پر آئی ہوئی تتلی کو

(۴)

تمنا بے تنائی سے ملتی ہے گلے
خوابوں کو بے خوابی تسلی دے رہی ہے
جمع ہے بھیڑ پنگھٹ پر
گھڑے کی نرم گردن میں
پڑا ہے ریشمی پھندا
مگر کنوئیں میں اک قطرہ بھی پانی کا نہیں ہے

۵

عادت کی گئی ایسی
کہ گنگا پتھروں کا چیر کر سینہ نکل آئی
بھگیرتھ بن کے دیکھے تو سہی کوئی
پگھل جائیں گی سنگینوں کی آوازیں
فلک سے بات کرنے والے
اونچے پربتوں کو ٹوٹنا ہوگا
اسی ماحول سے پھوٹیں گے گنگا کے کئی چشمے

جنوری ۱۹۶۵ء

۶

میں شبِ تار میں خاموش کھڑا تھا کہ مجھے
ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کہتا ہو
چاند کی طرح کبھی تم بھی چمک کر دیکھو
رات کو تیرہ و تاریک نہ پاؤ گے کبھی
کوئی شے لائقِ تضحیک نہ پاؤ گے کبھی
رات دراصل اس آفاق کا آئینہ ہے
حسن کا، عشق کا، اخلاق کا آئینہ ہے
روشنی تم میں نہیں گر ــــ تو اجالا نہ کرو
اپنی آہوں سے مگر رات کو کالا نہ کرو

۱۹۶۶ء

۷

چاند تاروں کی میت کو
سورج کے تابوت میں رکھ کر
رات کے ویراں قبرستان میں
گاڑ آتے ہیں
وقت کے ہاتھ بہت لمبے ہیں

۱۹۶۸ء

۸

ملا ہے رام کو بن باس
سیتا کو اٹھا کر لے گیا راون
ندائے حق کسی تاریک زنداں میں تڑپتی ہے
دلوں پر خوف کا احساس طاری ہے
شعورِ کیکئی شرم و حیا نیلام کر بیٹھا
وہ کل کی بات تھی
جب اس کو اپنے کارناموں پر ندامت تھی
یہ کلجگ ہے
یہاں لفظ ندامت کوئی بھی معنی نہیں رکھتا
یہاں تو کیکئی کی اکثریت ہے
جئے دشرتھ کہ مر جائے
کسے غم ہے۔

دسمبر ۱۹۶۲ء

جناب احتشام اختر

غزل

دل برباد کو چھوٹا سا مکاں بھی دے گا
جب نیا زخم بھرے گا تو نشاں بھی دے گا

پہلے گزروں گا میں امید و یقین کی رہ سے
پھر ترا پیار مجھے وہم و گماں بھی دے گا

کوہ جامد کہ جو لگتا ہے قلندر کی طرح
آبشاروں کو یہی عزم جواں بھی دے گا

پیکر رنگ جو پل بھر میں بکھر جائے گا
جاگتی آنکھوں کو خوابوں کا جہاں بھی دے گا

تم جلانا مجھے چاہو تو جلا دو لیکن
نخل تازہ جو جلے گا تو دھواں بھی دے گا

وقت دیتا ہے جنھیں آج کھلونے اختر
انھیں اطفال کو کل تیر و سناں بھی دے گا

غزل

خیال و خواب کے پیکر بدلتے رہتے ہیں
ہم اپنی آگ میں ہر دم پگھلتے رہتے ہیں

ہمیں ہے ناز کہ ہم ہیں پہاڑ کی مانند
ہماری آنکھوں سے چشمے ابلتے رہتے ہیں

تمھارے واسطے یہ چیز ہے نئی ورنہ
یہاں پہ سانپ تو اکثر نکلتے رہتے ہیں

بلندیوں میں جو اُڑتے ہیں اُن کو کیا معلوم
گھنے بنوں کی ہیں ہم آگ جلتے رہتے ہیں

تم اپنے جسم کے ملبوس کو بچائے رکھو
غلیظ پانی ہیں ہم تو اچھلتے رہتے ہیں

ہمارے ساتھ کہاں تک چلو گے ضد نہ کرو
کہ راستوں کی طرح ہم تو چلتے رہتے ہیں

بدلتی رت کی طرح ان کے پیار میں ہم بھی
خود اپنی شکل کو ہر دم بدلتے رہتے ہیں

جناب ہمایوں ظفر زیدی

غزل

یہ شام شام کی تنہائیاں مٹا دوں گا
میں دل کے گوشۂ ارماں میں تجھ کو جا دوں گا

جو ایک عمر سے حائل ہے خامشی کی فصیل
اسے میں تیشۂ آواز سے گرا دوں گا

گلوں سے ذکر کروں گا تیری صباحت کا
صبا کو تیری گلی کا پتہ بتا دوں گا

ابھی ہے تشنۂ تکمیل شوق کی تصویر
تیرے لبوں کو ابھی سرخیٔ حنا دوں گا

یہ ایک لمحہ مری زندگی کا حاصل ہے
اس ایک لمحے کو میں جاوداں بنا دوں گا

طلسم ٹوٹ کے رہ جائے گا حقیقت کا
میں ایک خواب کو یوں معتبر بنا دوں گا

غزل

صدا سکوت کی سُن شور و شر سے باہر آ
پُکارتا ہے تجھے دشت گھر سے باہر آ

طلسمِ ہوشربا ہے یہاں کا ہر منظر
اگر تو حلقۂ دامِ نظر سے باہر آ

یہاں نہ دے گا کوئی دادِ آبلہ پائی
ہے اب بھی وقت، طلسمِ سفر سے باہر آ

ہے ایک جسم ترے انتظار میں کب سے
کبھی تو رُوح کے سونے نگر سے باہر آ

نیا جہان ہے اک وقت کی حدوں سے پرے
فریبِ گردشِ شام و سحر سے باہر آ

جنابِ مرغوب حسن

غزلیں

کس درجہ پیچ و تاب تماشا سفر میں تھا
پھر بھی گریزِ خاک مری رہ گذر میں تھا

نکلا ہے ڈھل کے آگ سے موسم کے روبرو
وہ موسمِ سیاہ جو قیدِ شرر میں تھا

ڈوبے تمام عکس سرِ ساحلِ نگاہ
آنکھوں کا اعتبار بھی خوفِ خطر میں تھا

مصروفِ راز تھے سبھی منظر مرے خلاف
پھیلا ہوا سکوت عجب بحر و بر میں تھا

اٹھی تھی موجِ زہر کوئی بوسۂ لمس میں
سارا بدن اسی کے فریبِ اثر میں تھا

○

وہ لوگ ہواؤں کے اشاروں پہ چلیں گے
سمتوں کی عبادت سے جو انکار کریں گے

خوشبو کے پروں سے جو اڑے تیز ہوائیں
موسم کی چٹانوں سے وہ ٹکرا کے گریں گے

دریاؤں کے اسرار عیاں ہوں گے انھیں پر
جو ڈوب کے ساحل کی صداؤں کو سنیں گے

بے جان لکیریں جو ابھرنے سے ہیں معذور
خواہش کے پیمبر انھیں بیدار کریں گے

سیلابِ سیاہی سے جو کچھ رنگ ہیں محفوظ
خوابوں کے افق پر وہ مہ و مہر بنیں گے

○

ہم سفر اس کے سوا راہ میں جب کوئی نہیں
سایۂ جسم سے بیکار الجھتی ہے زمیں

جس جگہ رات صداؤں نے کیا تھا حملہ
اب بھی دیوارِ خموشی ہے بدستور وہیں

ان سے ہم رہ گذرِ خواب میں بھی مل نہ سکے
ساعتیں جن کے لیے دشتِ تمنا میں لڑیں

کتنے جسموں نے بلایا تھا انھیں رات مگر
شب کی دیوار سے پرچھائیاں لپٹی ہی رہیں

کھردری سخت زمیں جس سے چھپی رہتی ہے
آندھیاں ریت کی اس تہ کو اڑا دیں نہ کہیں

ڈاکٹر راشد فضلی

غزل

آنکھ شاموں سے خوں رلاتی ہے
کیسے موسم ہمیں دکھاتی ہے

جب ہوا اس کو چھو کے آتی ہے
مجھ سے اپنا بدن چراتی ہے

جب بھی سورج نظر میں چڑھتا ہے
رات آنکھوں میں ٹوٹ جاتی ہے

مرے احساس کی گلابی شام
پھر کسی کو دلہن بناتی ہے

آتے جاتے دنوں کے پت جھڑ میں
بارشوں کی بھی یاد آتی ہے

رات تھمتے ہی دھوپ کی آہٹ
دستکیں دے کے لوٹ جاتی ہے

بے ہوا آسمان کے نیچے
اک گھٹا کانپ کانپ جاتی ہے

بھولتا جا رہا ہوں سانسوں کو
زندگی یوں ہی جھلملاتی ہے

نوحہ لکھنے سے باز آ راشد
اس میں غزلوں کی بے ثباتی ہے

غزل

ریتوں کا انتشار تھا جسموں کے خواب میں
میں بھی لگا ہوا تھا حساب و کتاب میں

سورج کی سرخیوں میں بٹا جا رہا تھا دن
شامیں لپٹ رہی تھیں بدن کی کتاب میں

بے دھند آئینوں کی حقیقت کہاں کھلی
ایک عکس ماہتاب ہے عکس حباب میں

پی کے فقیر لذتِ شام و سحر گیا
میری رگوں کا خون تھا چشمِ شراب میں

لذت مری زبان سے ٹپکی تھی بوند بوند
کیسی ہوس تھی آہٹِ آبِ سراب میں

بے دھوپ دائروں کی غلامی سے دور دور
اک آسماں ہے زیرِ زمیں پیچ و تاب میں

سایہ سا بن کے تیری ہی آنکھوں میں ڈوبتے
چھپتی کہیں جو رات کسی آفتاب میں

پہلے لکھی گئی تھی سویروں کی چاندنی
اب آگ لکھ رہے ہیں دلوں کی کتاب میں

نظم

درد کی دھوپ کڑی
سر پہ آکر ہے کھڑی
دل وہ پنچھی ہے کہ جو شام کا سایہ مانگے
وقت کی ڈور کٹے
لمحہ آگے کو بڑھے
شام مگر درد کا درماں تو نہیں
شام کے بعد وہی رات کا چکر ہوگا
اور کڑی دھوپ کا درد
لمحہ لمحہ کسی بیوہ کی آہوں کی طرح
شب کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں
دل سے نکلے گا مگر
کون جانے کہ یہ آنکھوں سے پرے بھی ہوگا
آنکھیں کھولو، تو وہی دھوپ کڑی
زیست کے ساتھ چلی

نظم

سایہ سایہ بھاگ رہا ہے
انسانوں کی اس بستی میں
چلتے پھرتے جسم کا جنگل،
آوازوں کا شور بہت ہے
آوازوں کے پیچھے لیکن
تنہائی خاموش کھڑی ہے

ڈاکٹر شہاب عراقی

غزل

ہمیں نہ چھیڑو کہ ہم آنسوؤں کے پیکر ہیں
اداس پلکوں پہ ٹھہرے ہوئے سمندر ہیں

بجھاؤ آگ نہ ان پر یہ پھول برساؤ
بھٹکتی روحیں جو اپنی چتا کے باہر ہیں

طلوعِ صبح سے پہلے ہی ٹوٹ جائیں گے
وہ آئینے جو ترے حسن پر نچھاور ہیں

ستارے ٹوٹ کے پانی میں گر گئے ورنہ
بدن کی آگ میں پاکیزگی کے جوہر ہیں

یہ پتھروں کا نیا روپ بھی عجیب رہا
ذرا سنبھال کے دیکھو تو سنگ مرمر ہیں

شہید ہو گئے سب اپنی اپنی قدروں پر
نئے وجود کے یہ آخری پیمبر ہیں

غزل

رات کے وقت بھی کچھ ایسی ہوائیں آئیں
وہ تمازت تھی کہ سورج کی شعاعوں میں نہیں

دھوپ چڑھنے لگی احساس کی دیواروں پر
خواب گاہوں میں پڑے ہیں ابھی ذہنوں کے مکیں

آج بھی ان درو دیوار پہ تاریکی ہے
سیکڑوں سال جہاں روشنیاں قید رہیں

اوڑھ کے خواب کی چادر میں جہاں بیٹھا ہوں
کوئی چنگاری وہاں اڑ کے نہ آ جائے کہیں

میں نے کل رات بھیانک سا جو سپنا دیکھا
یوں سمجھ لو وہ حقیقت ہے کوئی خواب نہیں

غزل

گہری ندی چڑھی تو سمندر بہا گئی
اتری بھی اس طرح سے کہ خود میں سما گئی

پہلے تو آگ بن کے جھلستی رہی ہوا
پھر ابر بن کے مردہ زمینوں پہ چھا گئی

چہرہ پہ سرخیوں کے نشاں دوڑنے لگے
مجھکو لہو میں قید فضا راس آ گئی

مردہ عمارتوں پہ لکھا ہے خدا کا نام
روشن محل کو زندگی کی آگ کھا گئی

آواز وہ جو قید تھی صدیوں گپھاؤں میں
نکلی تو رسم و راہ ہمیں بھی بتا گئی

محمود غزنوی کی طرح ہم بھی آئے تھے
تیموریوں کی بات مگر دل کو بھا گئی

غزل

آؤ مسافروں کی طرح پھر دیا جلے
کچھ دیر بیٹھ جائیں کسی پیڑ کے تلے
اندھا یہ راہ گیر بڑا سود مند ہے
رکھتا ہے اپنے ہاتھ میں جلتے ہوئے دیے
ہر دم نئے لباس کی خواہش رہی مجھے
چاہے وہ جسم کا ہو یا احساس کے لیے
اب تیرگی شام گذر جائے بھی تو کیا
مرجھا گئے سنہری لکیروں کے دائرے
انمول موتیوں کا سمندر اداس ہے
اور مسکرا رہے ہیں پہاڑوں کے سلسلے
آسودگی کی آگ میں جلتے ہوئے کنول
معصوم خوشبوؤں کی نظر میں سما گئے
ہر سمت سے پکارا رہی ہے کوئی صدا
تنگ آ کے اپنے آپ سے جب بانجھ زندگی لیے

غزل

بدلی کا آبشار ہو یا دھوپ کی چٹان
چاروں طرف کے عکس اتارے گا آسمان
ترکش کے تیر بہہ گئے سیلاب کی طرح
قوسِ قزح کی زد میں ہے ٹوٹی ہوئی کمان
پو پھٹتے ہی لہو کا سمندر اُبل پڑا
بے حس پڑا ہوا تھا اندھیروں کے درمیان
بے جان پتیوں سے گرے اوس کے محل
جب لے اڑے پرند درختوں کا سائبان
ہلکی پھوار پاتے ہی خاموش ہو گیا
کب سے دھواں دھواں تھا سلگتا ہوا مکان
بچ کر نکل گیا تھا جو شہروں کے وار سے
مارا گیا خلاؤں کی بستی میں بے زبان

جناب سلمان حسین فرشوری صہبا بدایونی

غزل

رفتارِ طلب بڑھ جاتی ہے جب فاصلہ کم ہو جاتا ہے
منزل کے قریب آکر رہرو، کچھ تیز قدم ہو جاتا ہے

ہر ترکِ تعلق کا مطلب بیگانگی، باہم ہی نہیں
دل اور قریب آجاتے ہیں، جب واسطہ کم ہو جاتا ہے

خاموش نگاہوں کی جنبش تمہید ہے اک افسانے کی
جب دو نظریں مل جاتی ہیں افسانہ رقم ہو جاتا ہے

احساسِ پشیمانی کی قسم ایسا بھی ہوا ہے بعد ستم
وہ مجھ پہ ستم فرماتے ہیں خود ان پہ ستم ہو جاتا ہے

ہر ظلم و ستم سر آنکھوں پر لیکن کوئی ان سے یہ کہہ دے
اک حدِ معین سے بڑھ کر ہر ظلم کرم ہو جاتا ہے

تخریب حسیں کر دیتی ہے تعمیر کے نقشِ ناقص کو
بُت خانے کی قسمت کیا کہیے اجڑے تو حرم ہو جاتا ہے

آدابِ غمِ دل اے صہبا ہر دل کو نہیں آتے لیکن
جس پر وہ نظر پڑ جاتی ہے شائستۂ غم ہو جاتا ہے

غزل

ذہن جب ماضی سے بیگانے نظر آنے لگے
واقعے تھے جتنے افسانے نظر آنے لگے

بزم میں شمعیں فروزاں ہوں بس اتنی دیر تھی
پھر تو پروانے ہی پروانے نظر آنے لگے

دردِ دل، دل سے گریزاں اشکِ غم آنکھوں سے دور
جتنے اپنے تھے وہ بیگانے نظر آنے لگے

کہہ دیا ہوگا ہنسی میں تم نے دیوانہ ہمیں
اور ہم سچ مچ ہی دیوانے نظر آنے لگے

میکدے میں چشمِ ساقی کی ادائیں دیکھ کر
ہم کو میخانے میں میخانے نظر آنے لگے

اجنبی راہوں میں تم بھی آ گئے جب میرے ساتھ
راستے پہ کچھ جانے پہچانے نظر آنے لگے

ہم کو اے صہبا کبھی جن دوستوں پر ناز تھا
اب وہی بیگانے بیگانے نظر آنے لگے

غزل

رُخ پہ افشاں لگا رہی ہے رات
نازنیں بنتی جا رہی ہے رات

روشنی سے سنور رہا ہے دن
تیرگی میں نہا رہی ہے رات

ہائے وہ غم کدہ جہاں پیہم
رات کے بعد آ رہی ہے رات

شمعِ امید بجھنے والی ہے
آ بھی جاؤ کہ جا رہی ہے رات

ایک مجبورِ غم کے اشکوں سے
پیاس اپنی بجھا رہی ہے رات

صبحِ نو کے حسین ہاتھوں سے
اپنی باہیں چھڑا رہی ہے رات

ڈوبتا جا رہا ہے دل صہبا
کانپتا ہوں کہ آ رہی ہے رات

غزل

دوست ہوس کی عشق کی دشمن
اے خرد کا دیوانہ پن
ماضئ غم پر ہنسنے والو
غم کا مستقبل ہے روشن
اہلِ گلستاں ہوش میں رہنا
کانٹے بھی ہیں گل پیراہن
زلفِ مشکیں، روئے تاباں
شامِ رنگیں، صبحِ روشن
حسنِ چمن پہ آنچ نہ آئے
جلتا ہے جل جائے نشیمن
دستِ کرم تو محوِ کرم ہے
دیکھنا ہے گنجائش دامن
وقت بدلتا ہے جب صہبا
ہو جاتے ہیں دوست بھی دشمن
عقل جہاں ناکام ہوئی ہے
کام آیا ہے دیوانہ پن

غزل

دوپہر کے لمحوں کا جب خیال آتا ہے
صبح کے مسافر کا خون سوکھ جاتا ہے
اس طرح تبسم ہے غم نصیب چہرے پر
جیسے زرد پتوں میں پھول مسکراتا ہے
جب نہیں خیالوں میں وہ پری نما چہرہ
جانے کون پھر ہم کو رات بھر جگاتا ہے
رات بھر مچلتا ہے خواب کے دریچوں میں
صبح کے نکلتے ہی چاند ڈوب جاتا ہے
دوستی کا رشتہ بھی ایک خواب ہے صہبا
مدتوں میں بنتا ہے پل میں ٹوٹ جاتا ہے

جناب مہدی حیدر زیدی

غزل

وہ میرے پاس تھا اور میری دسترس میں تھا
میں خود ہی قید کسی لمحۂ عبث[1] میں تھا
سبھی گھروں سے نکل آئے کیا ہوا آخر
یہ کیسا شور نہاں نالۂ جرس میں تھا
طلسمِ صوت و صدا ٹوٹتا بکھرتا رہا
عجب سکوت میرے نغمۂ نفس میں تھا
دباؤ نیند کا بڑھتا چلا گیا آخر
مگر مسافرِ شب دامِ پیش و پس میں تھا

غزل

کہیں پہ ٹوٹنا ہے اور کہیں بکھرنا ہے
ہمیں سفر کی صعوبت سے پھر گزرنا ہے
وہ کیا کشش تھی جو لے آئی اس بلندی پر
اب آسمان سے نیچے ہمیں اترنا ہے
پھر اس کے بعد وہی دھوپ کا سفر ہوگا
دیارِ شب میں گھڑی دو گھڑی ٹھہرنا ہے
یہ ایک جسم ہے اس کے بدن کی پرچھائیں
اب اس وسیلے سے اس کو تلاش کرنا ہے

نظم

زمیں کی سرحدوں سے دور اوپر آسمانوں میں
جہاں بے آب صحرا ہیں جہاں بنجر زمینیں ہیں
چلو اس سرزمیں کو سازِ خوں کی موج سے سینچیں
چلو اس سرزمیں پر نفرتوں کے بیج بوئیں
درد کی کھیتی اگائیں
دلوں کی ٹہنیوں پر زخم کو کھلتا ہوا دیکھیں

---

[1] عبث صوتی قافیے کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے

جناب فوق کریمی

غزلیں

○

لب پر ہے فغاں طرز فغاں کوئی نہیں ہے
مظلوم کے نالوں کی زباں کوئی نہیں ہے
احساس کے مطلع پہ دھواں کوئی نہیں ہے
اب دل پہ میرے بار گراں کوئی نہیں ہے
جس راہ میں ہر گام پہ سو سنگ گراں تھے
اس راہ میں اب سنگِ گراں کوئی نہیں ہے
احساس کی گیرائی ہو یا فکر کی پرواز
اب میں ہوں وہاں دوست جہاں کوئی نہیں ہے
ہر در پہ پکارا کہ یہاں کوئی تو ہوگا
ہر در سے صدا آئی یہاں کوئی نہیں ہے
آخر ہے یہ کیا بات لہو تھمتا نہیں کیوں
جب تیر کلیجہ میں نہاں کوئی نہیں ہے
یوں جیتے ہیں اس دور میں کچھ لوگ بھی اے فوقؔ
جیسے کہ انہیں کارِ جہاں کوئی نہیں ہے

○

تھم گئے اشک مگر آہ ابھی باقی ہے
دل میں چنگاری کوئی اور دبی باقی ہے
آپ نے اشکِ محبت کو چھپایا تو بہت
پھر بھی رخسار پہ ہلکی سی نمی باقی ہے
ہم نے اک عمر ترے ساتھ گزاری ہے مگر
ہائے ابتک تری بیگانہ روی باقی ہے
فیض ساقی بھی ہے گردش میں ہے پیمانہ بھی
پھر بھی اک کیفیت تشنہ لبی باقی ہے
دوستو شمع بہر گام جلاؤ کہ ابھی
دور تک سلسلۂ تیرہ شبی باقی ہے
صبح کو دور نہ کردے یہ خوشی کا طلسم
اور کچھ فکر کرو رات ابھی باقی ہے
یوں تو ہر چند سیے جیب وگریباں اے فوق
پھر بھی دامن کی مگر بخیہ گری باقی ہے

○

بیٹھنے بھی ابھی پائے نہ تھے معتوب ہوئے
سرخ رو آکے تری بزم میں ہم خوب ہوئے
جن فسانوں میں ترا جور و ستم تھا شامل
وہ فسانے بھی مرے نام سے منسوب ہوئے
ہر ادا اُن کی بنی دل کے لئے وجہ کشش
جتنے قاتل وہ ہوئے اور بھی محبوب ہوئے
جن کو لکھا تھا بڑے شوق سے اخلاق کے ساتھ
میری رسوائی کا باعث وہی مکتوب ہوئے
بے تکلف وہ مرے سامنے آئے اکثر
جانے کیا بات ہوئی آج وہ محجوب ہوئے
کیا طبیعت ہے کہ نفرت ہوئی پھولوں سے کبھی
اور کانٹے کبھی دل کو مرے مرغوب ہوئے

آشفتہ چنگیزی

غزل

تمہارے شہر کے رستے عجیب رستے ہیں
کہ واپسی کیلئے آج تک ترستے ہیں
ہزار شکر پناہوں سے دور ہیں ہم لوگ
بدن ہمارے ابھی دھوپ میں جھلستے ہیں
جو قہقہوں کی عمارت میں ہو گئے محصور
کچھ ایسے لوگوں کی بستی میں ہم بھی بستے ہیں
بنے ہوئے تھے کبھی بوجھ جن کے ذہنوں پر
ہمارے قرب کو وہ آج کیوں ترستے ہیں
ابھی کی بات ہے اک خوف دل میں رہتا تھا
اور آج ہجر کے ساون بھی کم برستے ہیں
وجود اپنا مکمل نہیں ہے جن کے بغیر
وہی رفیق ہمیں ناگ بن کے ڈستے ہیں

٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭

○

ٹھکانے یوں تو ہزاروں ترے جہان میں تھے
کوئی صدا ہمیں روکیگی اس گمان میں تھے

عجیب بستی تھی چہرے تو اپنے جیسے تھے
مگر صحیفے کسی اجنبی زبان میں تھے

ہم ایک ایسی جگہ جا کے لوٹ کیوں آئے
جہاں سنا ہے کہ سب آخری زمان میں تھے

بہت خوشی ہوئی ترکش کے خالی ہونے پر
ذرا جو غور کیا تیر سب کمان میں تھے

علاج ڈھونڈھ نکالیں گے اپنی وحشت کا
جنوں نواز ابھی تک اسی گمان میں تھے

اب آگے اور چڑھائی کا سلسلہ ہو گا
یہ بھولنا ہے کہ ہم بھی کبھی امان میں تھے

———•———

○

ہر ایک بات پہ وہ قہقہے لگاتا ہے
یہ اور بات کہ ہنسنے سے جی چراتا ہے
جو مشکلوں کے کئی حل تلاش لایا تھا
کھلونے بانٹ کے بچوں میں مسکراتا ہے
ہزار موجیں ہیں خاموشیوں کے سینے میں
کمی وہ کیا ہے سمندر جو خود میں پاتا ہے
ہے انتظار مجھے جنگ ختم ہونے کا
لہو کی قید سے باہر کوئی بلاتا ہے
شگفتی ریت ہے اور ٹھنڈے پانیوں کا سفر
وہ کون ہے جو ہمیں راستہ دکھاتا ہے
تمام راستے اب ایک جیسے لگتے ہیں
گمان راہ میں شکلیں بدل کے آتا ہے
جو ایک بار ہواؤں سے جوڑ لے رشتہ!
کہاں وہ لوٹ کے شہروں کی سمت آتا ہے
شکار دھندھ کا صحرا نورد کرتے ہیں
فریب کھانا کہاں دوسروں کو آتا ہے

○

خود اپنے لہو میں ہی نہایا ہوا اک شخص
بیچارہ تعارف کا ستایا ہوا اک شخص

ڈرتا ہوں کہیں نیند میں کروٹ نہ بدل لے
کہسار کی ڈھلوان پہ سویا ہوا اک شخص

لے ڈھونڈھ چکا ہے کئی گیتوں کی وہ دھنیں بھی
وہ ساز ازل پر کبھی گایا ہوا اک شخص

مقتل کی زمین پر بھی وہ سرگرم سفر تھا
آپ اپنی حراست میں ہی آیا ہوا اک شخص

جب قصہ سنا اس نے اترنے کا زمیں پر
تھا رحم کے قابل وہ چڑھایا ہوا اک شخص

○

غزلیں

جس سے مل بیٹھے لگی وہ شکل پہچانی ہوئی
آج تک ہم سے یہی بس ایک نادانی ہوئی

ہم نے سمجھا تھا کہ اس سے فاصلے مٹ جائیں گے
خود کو ظاہر بھی کیا لیکن پشیمانی ہوئی

کیوں کھلونے ٹوٹنے پر آبدیدہ ہو گئے
اب تمہیں ہم کیا بتائیں کیا پریشانی ہوئی

سیکڑوں پردے اٹھا لائے تھے ہم بازار سے
گتھیاں کچھ اور الجھیں اور ہلکائی ہوئی

کیا بتائیں فکر کیا ہے اور کیا ہے جستجو
ہاں طبیعت دن بدن اپنی بھی سیلانی ہوئی

اعتراف

تمہاری باتوں سے اوبتے ہیں
ہمیں یہ کہنے میں آج کوئی جھجھک نہیں ہے
تم اس مہذب جہاں سے اپنے
ہمیں نکالو
یا کوئی تازہ جدید سولی ہی بخش ڈالو
تمہاری باتوں سے اوبتے ہیں
ہمیں یہ کہنے میں آج کوئی جھجھک نہیں ہے
خزاں کے موسم میں دھانی کپڑے
پہن کے پھرنا
ہماری عادت سی بن گئی ہے
بہار پچھلے تمام معنیٰ کو کھو چکی ہے
کمہار اپنے کھلونے لے کر
ہر ایک موسم میں گھومتے ہیں
تمہاری باتوں سے اوبتے ہیں
ہمیں یہ کہنے میں آج کوئی جھجھک نہیں ہے

تم اپنی بستی کے راونوں کو
سُنا ہے ہر سال پھونکتے ہو
مگر ــــ !
ہمارا بھی فیصلہ ہے
کہ تم کڑھائی میں تیل کِتنا ہی جوش دے لو
کسی کی دوشیزگی کو تلنا
ہمارے بس میں نہیں رہا ہے
دہکتی اگنی کو اپنے ڈھنگ سے
ہزار کاموں میں آنے والا بنا لیا ہے
تمہاری باتوں سے اوبتے ہیں
ہمیں یہ کہنے میں آج کوئی جھجھک نہیں ہے

تمام شرم و حیا کے پردے
ہمیں وراثت میں جو ملے تھے
وہ ہم نے چوراسی آسنو کو
اُڑھا دئے ہیں
جو بچ رہے ہیں
انہیں اٹھانے ہمارے بچّے
تمہاری آنکھوں کو ڈھونڈتے ہیں
تمہاری باتوں سے اوبتے ہیں
ہمیں یہ کہنے میں آج کوئی جھجھک نہیں ہے

عظیم ماضی کی داستانیں
تمہارے پنہائے سارے معنی
اُگل چکی ہیں
علامتوں نے محاوروں کا
مہین چولا بدل لیا ہے
جہاز لنگر اٹھا چکے ہیں
تمہاری باتوں سے او پتے ہیں

(جولائی [illegible]ء)

نراج

ہیں یہاں پر سب اکیلے
ایک دم ویران سے
سنسان سے

اور ـــــ
کھنڈروں کی طرح ہیں
بے حس و بے جان ہے
جب بھی ان سے بات کی
تو ـــــ "
یہ ہوا محسوس جیسے
بولتے ہیں گنبد ویراں ہیں ہم "

" اور ـــــ
سنتے ہیں ہمیشہ
اپنی ہی آواز بس

یہ بھی سچ ہے

یہ بھی سچ ہے
کہ ہم اک دوسرے سے خوب واقف ہیں
کمی دوری کی دونوں کو
بہت محسوس ہوتی ہے
میں کن باتوں سے بچتا ہوں
تمہیں احساس رہتا ہے
مجھے معلوم ہے
کہ تم کہاں ناراض ہوتے ہیں
مگر کچھ ان دونون
تنہا ملاقاتوں سے ڈرتے ہیں
خموشی ہی ہمارے درمیان
اک ربط رکھتی ہے
یہ کس رشتے سے ہم تم روز ملتے ہیں

چلو پھر سے
اٹھائیں ہم وہ دیواریں
جنہیں ڈھانے کو تنہائی ضروری ہے

(نومبر ۷۷ء)

رونق زیدی
ایس۔این۔ ہال

غزل

دریچے، کھڑکیاں حیران رہ جائیں تو کیا کیجئے
اُجالے میرے گھر میں آکے شرمائیں تو کیا کیجئے
بھلانے کی انہیں ہر چند کوشش کر چکے لیکن
سجے بزم تصور اور وہ آجائیں تو کیا کیجئے
جو یادوں کے کھنڈر کی خاک اپنے ساتھ لاتے ہیں
وہی جھونکے مری سانوں کو مہکائیں تو کیا کیجئے
ہمیشہ ہم تو الجھائے رہے کانٹوں سے دامن کو
مگر وہ مسکرائیں، پھول کھل جائیں تو کیا کیجئے
نظر مایوس ہو تو سب جہاں ویران لگتا ہے
خوشی کے طور بھی دل کو نہ بہلائیں تو کیا کیجئے

○

○

جب میسّر ہوئیں مجھ کو تنہائیاں
رقص کرنے لگیں غم کی پرچھائیاں
کون کہتا ہے غم سے میں گھبرا گئی
غم کے سازوں پہ سنتی ہوں شہنائیاں
ہر تمنا دھواں بن کے اڑنے لگی
جب سے دیکھی ہیں اوروں کی رسوائیاں
میری آنکھوں میں اترو نہ تم اس طرح
کون جانے سمندر کی گہرائیاں
پتھروں کے نگر میں ٹھہرنا محال
ہر بلندی کے ہمراہ گہرائیاں
سبز پتے ہواؤں میں اڑنے لگے
پڑ گئیں ماند پیڑوں کی پرچھائیاں

پرویز جعفری

غزلیں

اب تو لفظ عشق ہونٹوں سے ادا ہوتا نہیں
کوئی نغمہ دل کا پابندِ نوا ہوتا نہیں

چاہئے جینے کا اک انداز جینے کے لئے
ہو شعورِ غم تو غم بھی بے مزہ ہوتا نہیں

ہر طرف رقصاں نظر آتا ہے حسنِ زندگی
مفلس و نادار کے خوابوں میں کیا ہوتا نہیں

صرف میدان چاہئے ان کو امنگوں کے لئے
اپنی منزل کا غزالوں کو پتہ ہوتا نہیں

اپنی مٹی سے اگاؤ اپنے معبودوں کی فصل
آسمانوں پر زمینوں کا خدا ہوتا نہیں

بے وفائی تو سکھا دیتا ہے یاروں کا سلوک
فطرتاً پرویزؔ کوئی بے وفا ہوتا نہیں

غزل

یہ آدمی ہے مجھے اعتبار اب بھی ہے
ہزار روگ سہی جاندار اب بھی ہے

خود اپنے پانو سے روندے گئے پھول والوں نے
مری نظر میں چمن لالہ زار اب بھی ہے

نکل چلا ہے دبے پانو کاروانِ حیات
مجھے کسی کا مگر انتظار اب بھی ہے

بہت دنوں سے محبت کی بات ہوتی ہے
مگر گلاب کے پہلو میں خار اب بھی ہے

بدستِ دیر و حرم میکدے کو بیچا تھا
ہمارے شہر میں وہ بادہ خوار اب بھی ہے

لٹے ہوئے مرے گھر کو گزر گئیں صدیاں
مگر پڑوس کے گھر میں گہار اب بھی ہے

غزل

ایسے درد کے لمحے کم کم آتے ہیں
موسمِ خشک کے منتظر بھی کم آتے ہیں
خوش خبری کا سے خشک زباں پہ خوش خبری
پیاس بجھانے قطرۂ شبنم آتے ہیں
دہرائے گی آج اپنے کو پھر تاریخ
میرے لب تک پھر بارِ ماتم آتے ہیں
ابر گھرے، کب برف گرے، کب برسے دھوپ
بے سوچے سمجھے اب موسم آتے ہیں
دشت میں رہ کر وحشت کی جب ہوتی ہے طلب
وحشت میں ایسے بھی عالم آتے ہیں
کہہ دے فراز دار و رسن سے اب کوئی
بہرِ استقبال، اٹھیں ہم آتے ہیں
زینتِ بزمِ عدل ہیں خاک آلودہ لوگ
سر کو جھکائے پرویز و جم آتے ہیں

غزل

ہم اپنا حال نہ کہتے کئی بہانے تھے
ہمیں بھی چند لطیفے مگر سنانے تھے
یہ صرف ضد تھی کہ ڈیرا یہیں جما بیٹھے
تری گلی کے علاوہ بھی کچھ ٹھکانے تھے
یہ زخم زخم بدن لیکے اپنے گھر آئے
کچھ ایسے قرض تھے جو اس طرح چکانے تھے
ہمیں تو بات بنانے کا فن نہیں آتا
وہ لوگ لفظوں کے ماہر بڑے سیانے تھے
نہ چاشنی، نہ گھلاوٹ نہ کچھ اتار چڑھاؤ
عجب سپاٹ سے اس دور کے فسانے تھے
کسے پڑی تھی جو تحقیق جرم بھی کرتا
جو طے شدہ تھے وہی فیصلے سنانے تھے
بزرگ لوگوں کی باتوں کا ماحصل ہے یہی
یہ کیا زمانہ ہے، اور وہ بھی کیا زمانے تھے

پروردگارِ تیرہ سامانی

رات کے تاریک رخساروں پہ صبح نو کی چنگاری جلی۔

اک نور کا دریا بہا

کچھ دور چل کر

چیخنے شعلوں کے بے چہرہ سمندر میں گھرا

ہیرو شما پر آگ شہ برسی

جسم ویت [illegible] پر چھالے پڑے

اور رفتہ رفتہ

وہ خدائے نور و دانش

وہ خدائے عقل نو

وہ کہ جو تہذیبِ عہدِ نو کا تھا پروردگار

کس طرح پروردگارِ تیرہ سامانی ہوا؟

عنوان

میں ایک آواز ہوں خاموشیِ مطلق کے سینے کی
میں ٹکراتا ہوں لمحوں کی چٹانوں سے
بکھرتا ہوں، سنورتا ہوں
یہی تقدیر ہے میری
سمندر کی تہوں میں
آسمان کی وسعتوں میں
کوہساروں کی گپھاؤں میں
ہزاروں سال کی تاریخ میں
بکھرے ہیں میری داستاں کے منتشر ٹکڑے
میں کب سے منتظر ہوں
مجھکو اچھا سا کوئی
عنوان مل جائے

وہ

وہ عجیب لڑکی ... ہے
جانے کیا سمجھتی ہے
میرا اس کا رشتہ کیا
پھر بھی راہ تکتی ہے
اس گلی سے ہو کر میں
جس گھڑی گزرتا ہوں
نیم وا دریچے سے
چاند اک ابھرتا ہے
چاندنی کی انگلی میں
سبز ریشمی پردہ
ہولے ہولے ہلتا ہے
سرمئی سلونی شام
سایہ صنوبر میں
تھک کے بیٹھ جاتی ہے
گہری گہری دو جھیلیں

خوابگوں دھندلکوں میں
ڈوبتی ابھرتی ہیں
پھول کھلنے لگتے ہیں
رنگ رقص کرتے ہیں
مے برسنے لگتی ہے
کہکشاں اترتی ہے
وہ عجیب لڑکی ہے!

چاہے جو بھی ہو موسم
چاہے صبح ہو یا شام
جیسے اس کو ہو معلوم
میں کب آنے والا ہوں
چھوڑکر وہ گھر کے کام
دوڑی دوڑی آتی ہے
اور اسی دریچہ سے
راہ تکنے لگتی ہے
منہ سے کچھ نہیں کہتی

آنکھیں بات کرتی ہیں
کچھ سوال کرتی ہیں
کچھ جواب دیتی ہیں
گاہے روٹھ جاتی ہیں
گاہے خود مناتی ہیں
انتظار کے قصے
شکوے اور گلے کتنے
دور سے سناتی ہیں
سانس تیز ہوتی ہے
پاؤں جمنے لگتے ہیں
راہ بھول جاتا ہوں
برف گرنے لگتی ہے
وہ عجیب لڑکی ہے!

میں کہ شاعرِ مفلس
اجنبی و آوارہ
زندگی کے صحرا میں
ایک پیاس کا مارا
دربدر بھٹکتا ہوں
منزلوں کی باتیں کیا

راستہ نہیں ملتا
شہرِ دل میں رہتا ہے
آرزو کا ماتم سا
خواب ریزہ ریزہ ہیں
روح درد کا دریا
ہوش ہی نہیں مجھ کو
شام کیسے ڈھلتی ہے
رات بھیگتی ہے کب
صبح کب نکھرتی ہے
اس سے میں کہوں کیسے
کوئی اور سمجھا دے
میرا اس کا رشتہ کیا؟
وہ عجیب سی لڑکی
انتظار میں میرے
کیوں دیئے جلاتی ہے؟
عمر کیوں گنواتی ہے؟
وہ عجیب لڑکی ہے
جانے کیا سمجھتی ہے؟

مہتاب نقوی

غزل

دیکھنا ہو تو بلندی پہ پہونچ کر دیکھو
چار سو چھائے ہوئے ٹھہرے منظر دیکھو
نیند آ جائے تو پھر خواب کے پیکر دیکھو
آنکھ کھلتے ہی سرابوں کو سراسر دیکھو
سات پردوں میں چھپے ہیں ابھی اس دنیا کے راز
پا سکوگے نہ پتہ پاس بھی جا کر دیکھو
گھر میں بیٹھو تو کئی سائے پریشان کریں
اور نکلو تو کڑی دھوپ کو سر پر دیکھو
چھوڑ آئے تھے جنہیں اگلے زمانے میں کبھی
موسم گل میں سبھی چہرے برابر دیکھو
ہم نے کیا صرف کیا خون جگر شعروں میں
ہم سے بہتر نہیں کوئی بھی سخنور دیکھو

غزل

نکل پڑے ہیں جو گھر سے تو کیوں قرار آئے
یہ اور بات کہ رستہ بھی سایہ دار آئے
سبھی کی وحشتِ دل کا علاج تھا لیکن
ہمارے واسطے جنگل نہ آبشار آئے
خبر نہیں ہے کہ لے جائیگی کہاں راہیں
اگرچہ سیلِ زمانہ کے ہم شکار آئے
وصال اصل میں ہوتا ہے ہجر کا پیغام
خدا کرے نہ کبھی موسم بہار آئے
ہوئے تھے یوں تو کبھی ہل کا رواں واپس
مگر ہمیں تھے جو گھر اپنے شرمسار آئے
کوئی زمین تلاشو کوئی غزل ہی کہو
اسی بہانے سے پھر آج ذکر یار آئے

غزل

صحرا کی ہو ہوس نہ بدن سنگسار ہو
وحشت پہ اپنے اپنا بھی کچھ اختیار ہو

خوابوں کا سلسلہ ہو نہ راتوں کا جاگنا
نظروں میں اب ہماری نہ کچھ بھی شمار ہو

ملنے کا اور بچھڑنے کا ایسے مزہ نہیں
گر ہو وصال و ہجر تو پھر بار بار ہو

مسدود سارے راستے ہو جائیں اس طرح
کوئی نہ اب سفر کے لئے رہگزار ہو

دنیا میں آج کوئی بھی ایسی نظر نہیں
جنبش کئے بغیر جو ہر دل کے پار ہو

اپنے لئے ہم ایک نیا چہرہ ڈھال لیں
پچھلی مسافتوں کا نہ جس پر غبار ہو

غزل

جب بھی کسی سے حالِ دل کہہ آئے ہیں
واپس آکر ہم کتنا پچھتائے ہیں

ان کی باتیں بالکل یاد نہیں آتیں
بیچ میں جانے کیسے کیسے سائے ہیں

کتنی راتیں جاگتی آنکھوں سے کاٹیں
راز مگر خوابوں کے سمجھ نہ پائے ہیں

تو اپنی راہوں کی مسافت کم کر دے
تیری آہٹ کی ہم آس لگائے ہیں

تھک کر واپس آنے کی جب بات چلی
سب سے پہلے ہم گھر واپس آئے ہیں

چار شعر

دل پچھلے خوابوں میں پھر کھو جائیگا
تجھ سے چھٹ کر کیا کیا یاد نہ آئیگا
موسمِ وحشت پھر سے آنے والا ہے
دشت جنوں پھر آہوں سے بھر جائیگا
ہم بن تیشے کے فرہاد جئیں کیونکر
بن تیشہ ہم کو منہ کون لگائیگا
اپنے تخیل سے بھی پرے یہ بات ہوئی
موسمِ جاناں پھر سے کبھی کیا آئیگا

غزل ○

آنسوؤں میں کوئی سمو جاتا
جسم سارا کا سارا دھو جاتا
ایک مہلت ہمیں بھی مل جاتی
راستہ راستوں میں کھو جاتا
دل اگر تھا تو پھر یہی ہوتا
اس کی یادوں میں محو ہو جاتا
ہم نہیں چاہتے تھے جنس وفا
وہ ہمارے گھروں میں سو جاتا
راس ہم آپ خود کو آجائے
یونہی قصہ تمام ہو جاتا
ایک خواہش رہی ہے برسوں سے
رات ہوتے ہی گھر میں سو جاتا

غزل ○

ہوا کے دوش پہ کیوں کارواں روانہ ہے
ہمیں تو لوٹ کے اپنے گھروں کو جانا ہے
یہاں پہ آ کے ہمارا سفر تمام ہوا
یہیں پہ ساری خطاؤں کو بخشوانا ہے
کسے خبر ہے کہ تجھ کو بھی بھول جائیں کبھی
ہمارے جیسے مسافر کا کیا ٹھکانا ہے
شکار کرتے رہے عمر بھر اندھیروں کا
سروں پہ پھر بھی وہی شب کا شامیانا ہے
بچھڑ کے تجھ سے نہ کوئی اثر ہوا مجھ پر
خزاں کو اور نیا رنگ کیا دکھانا ہے

غزل

جہاں سے ہٹ کے جو کچھ دل کا حوصلہ ٹھہرا
میں اپنے شہر میں خود اپنا حادثہ ٹھہرا

تم اپنے آپ کے اوراق خود الٹ ڈالو
ہمارے بیچ جو تھوڑا سا فاصلہ ٹھہرا

کسے خبر ہے کہ ہم خود پہ کب گراں گزریں
کچھ اپنے آپ سے ایسا ہی واسطہ ٹھہرا

عجیب حرف و حکایات کا سماں ہوگا
تمہارے شہر سے ہو کر جو راستہ ٹھہرا

کہاں سکون کہاں پر قرار ملتا ہے
ہمارے ساتھ کسی دل کا حوصلہ ٹھہرا

ہماری پیاس ہمیں دیکھئے کہاں لے جائے
ابھی تلک تو سرابوں سے واسطہ ٹھہرا

غزل

اے خدا تو میری آنکھوں کو کچھ ایسے خواب دے
جاگتے رہنے کی دل میں آرزو باقی رہے

پانیوں کا یہ سفر اب ختم ہونے کا نہیں
سوچتا یہ تھا کہ اپنے گھر کو ہم واپس ہوئے

میرے ہونے کا تجھے احساس بھی ہو جائیگا
تیری چوکھٹ کی جبیں سائی سے ہم جس دن پھرے

اس اجڑتے شہر میں کیا کوئی بھی ایسا نہیں
جو کبھی اپنی سنائے اور کبھی میری سنے

وصل کے موسم ہوں یا ہوں ہجر کی راتوں کے خواب
اب ہمیں لگنے لگے ہیں سارے منظر ایک سے

غزل

قدم بڑھے ہوئے پیچھے کو لوٹ جاتے ہیں
نقوش پا جو نظر رفتگاں کے آتے ہیں

جو بوالہوس تھے وہ قطروں سے ہو گئے سیراب
کرشمے دیکھئے کیا کیا نظر میں آتے ہیں

جنوں کے قصے ہوئے داستان کا حصہ
ہم آج ان کو فقط سُنتے اور سُناتے ہیں

ہمارے پاس تری یاد کے سوا کیا ہے
اسے بھی دیکھئے آگے کہاں گنواتے ہیں

ارادہ جن کا تھا اونچی اڑان کا وہ سب
پرندے لوٹ کے اپنے گھروں کو جاتے ہیں

اسعد بدایونی

غزلیں

ہم تو ہر شخص کو ہی محوِ طرب جانتے ہیں
غمزدہ اور بھی ہیں شہر میں کب جانتے ہیں

تیری رفتار سمجھتے ہیں صبا کا چلنا
پھول کا کھلنا تیری جنبشِ لب جانتے ہیں

سادہ الفاظ سے کھاتے ہیں معانی کا فریب
ہم غزل والے بھی ہر شئے کو عجب جانتے ہیں

کتنے بھولے ہیں مرے شہر کے رہنے والے
جب بھی سورج پہ گھٹا چھاتی ہے شب جانتے ہیں

اس کے غم نے ہی عطا کی ہے بلندی مجھ کو
جس کو سب میری تباہی کا سبب جانتے ہیں

اپنے چہرے کو بدل کر نہ مل اِن سے اسعد
شہر کے لوگ ترے بارے میں سب جانتے ہیں

سارے چہرے ایک جیسے سب نگاہیں ایک سی
ہیں ہمارے عہد کے لوگوں کی راہیں ایک سی

ایک سی جھنکار ہے زنجیر ہو یا زیب ہو
سارے زنداں ایک سے سب رقص گاہیں ایک سی

آخرش مجھ کو سمندر میں اتر جانا پڑا
جب ملیں سارے جزیروں میں پناہیں ایک سی

سب کے دروازے مقفل سب کے روزن بے صدا
ہیں ہمارے شہر میں سب بارگاہیں ایک سی

چاہتا ہے تو اگر ہم ظلمتوں کو دیں شکست
ایک سے دل دے عطا کر ہم کو باہیں ایک سی

غزل

میرے لئے وہ بدن قرضِ خواب آور تھا
مگر وصال نہ ہونا مرا مقدّر تھا

کہیں نشیب کہیں تھے فراز رنگ بھرے
وہ جسم تھا کہ کوئی خوشگوار منظر تھا

کہاں تلاش کروں قربتوں کے انگارے
تمام رات بہت سرد میرا بستر تھا

ترے بدن کا جزیرہ تھا مجھ کو جائے پناہ
پھر اس کے بعد بہت دور تک سمندر تھا

میں اب بھی اسکو گلابوں کی طرح جانتا ہوں
کہے ہزار زمانہ اُسے کہ پتھر تھا

تمام رات کا حاصل فقط یہی اک خواب
سکوتِ مرگ میں ڈوبا ہوا مرا گھر تھا

اندھیرے اس کو بھی ہمراہ لے گئے اسعد
وہ ایک شخص کہ جو روشنی کا پیکر تھا

غزل

جہاں تک دیکھئے منظر خدا کے
دریچے شہرِ بے حس میں صدا کے

گئے سیلاب آئی خشک سالی
بدلتے ہی نہیں موسم دعا کے

عبث دریاؤں سے ہم کو شکایت
سمندر بھی تو شاطر ہیں بلا کے

سبھی میں خود کو شامل پا رہا ہوں
لکھوں میں کس طرح لوگوں کے خاکے

نشاں اپنے اٹھا لو راستوں سے
زمانے اب نہیں ہیں نقشِ پا کے

یزیدوں کی یہاں بھی بادشاہت
علی گڑھ میں بھی نقشے کربلا کے

غزل

دکھاتے ہیں یخ زدہ پرندوں کو اونچا اڑنے کا خواب موسم
کبھی یہ موجوں کے آبلے تو کبھی ہیں یار و سراب موسم

ہماری چاہت کی شاخ پر اب نہیں ہے پتا کوئی سلامت
ہماری آنکھوں کے دیدبانوں میں تھے سبھی باریاب موسم

وہ اور تھے جن کو موسموں نے کرن کرن چاندنی عطا کی
زیادہ تر لے کے آئے یادوسرے لئے آفتاب موسم

ہماری بستی ہمارے جنگل میں پیاس بکھری ہے کتنے دن سے
کبھی تو ہمراہ لے کے آئیں کوئی بڑا سیلِ آب موسم

کہاں سے آئے ہیں کسنے بھیجا ہے کس کے پابند ہیں یہ پوچھوں
مگر نہ جانے سوالِ سادہ کا دینگے کیسا جواب موسم

یہ روشنائی کے قافلے بھی غبارِ شب کا بنیں گے حصہ
اڑا کے لے جائیں گے کسی دن ورق ورق ہر کتاب موسم

سہیل احسن

شعبہ انگریزی

اے، ایم، یو۔ علی گڑھ

غزل

جانے وہ کون سے چہرے ہیں جو بھولے ہی نہیں
چند گزرے ہوئے لمحے ہیں کہ گزرے ہی نہیں

تم نے راہوں کی طرح موڑ دئے ہیں اتنے
راستے گھر کی طرف اب مرے جاتے ہی نہیں

ہم جو اس دھوپ میں خوابوں کے تمنائی تھے
اس طرح ٹوٹ کر بکھرے ہیں کہ سمٹے ہی نہیں

اک تری یاد نے بدلا ہے یوں رستوں کا شعور
قافلے دل کے کسی موڑ پر ٹھیرے ہی نہیں

وقت کے پنچھی بھی ساکت ہوئے جاتے ہیں سہیل
ایسے خوابوں کے لئے جو کبھی دیکھے ہی نہیں

دن ڈھلے ... دیر ہوئی درد کے پیکر جاگے
آنکھ میں شبنمی آنسو کے سمندر جاگے

آئینۂ زیست کا ریزہ ہوا ڈھیرے ڈھیرے
وقت کے ہاتھ میں یادوں کے وہ پتھر جاگے

دائرے وقت کے ہر آن بدلتے ہیں اگر
آنکھ کے سامنے کیوں ایک ہی منظر جاگے

رشتۂ خواب وفا توڑ کر جوڑے جس دم
یادِ ایام کے بھولے ہوئے دفتر جاگے

ایک نقطے پہ سمٹ آئے خیالات سہیل
دشتِ احساس میں سلگے تو مقدر جاگے

ــــــــــــــــــــ
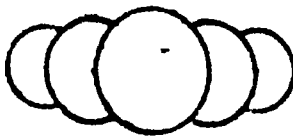
یہ ہزار صدیوں کا رنج و غم مرے روز و شب کا حساب ہے
جسے کھو دیا ترے قرب میں وہی ایک لمحہ عذاب ہے

مری آنکھ کا یہ کڑا سفر، ہوا دشتِ ذات طویل تر
کروں طے میں کس طرح رہگذر کہ شکستہ پا مرا خواب ہے

وہ جو ڈھونڈتے ہیں نظر نظر انہیں تیری ذات کی کیا خبر
ذرا چشمِ دل کو صدا تو دیں کسی آنکھ کو کہاں تاب ہے

نہ خیالِ یار نہ درد و غم ہے عجیب عالم جستجو،
وہی روح ہے وہی جسم ہے وہی زندگی کی کتاب ہے

یہ خیال و خواب کی رہگذر اسی انتظار کے موڑ پر
سرِ شام ہی سے کھلا ہوا.. مرے آنسوؤں کا گلاب ہے

کبھی آندھیاں جو چلیں سہیل تو الٹ گئی ہے بساط دِل
کبھی ہنس پڑے کبھی رو پڑے یہی زندگی کا نصاب ہے

غضنفر علی غضنفر

غزل

جب کوئی چادر رخِ شفاف پر تانی گئی
تب کہیں جاکر ہماری شکل پہچانی گئی

شادماں ہیں لوگ اب دنیا سے من مانی گئی
سچ تو یہ ہے رفتہ رفتہ ان کی حیرانی گئی

عقل و دانش کی کمی کا رنج ہے سب کو مگر
غمزدہ میں ہوں کہ میرے گھر سے نادانی گئی

اب کنارے پر پہنچنے کا مزہ باقی کہاں
کشتیاں سیدھی ہوئیں دریا سے طغیانی گئی

ساتھ اس کے ولولے، پہچان، لذت سب گیا
میں نے سمجھا تھا فقط آنکھوں سے ویرانی گئی

غزل

نیند کی کون سی منزل سے گزرتے ہوں گے
خواب کے پاؤں زمینوں میں اترتے ہوں گے

جانے کیا سوچتی ہونگی وہ اندھیری راتیں
چاند جب ان کی نگاہوں میں ابھرتے ہوں گے

ہم کہ مربوط ہوئے اور شکستہ ہو کر
ٹوٹ کر کیسے بھلا لوگ بکھرتے ہوں گے

تم جھلستے ہو چٹانوں پہ مگر جانے دو
کتنے ہی لوگ مکانوں میں سنورتے ہوں گے

ہم تو ساحل کے تصور سے سہم جاتے ہیں
لوگ کس طرح سمندر میں اترتے ہوں گے

غزل

بدلا بدلا جو فضاؤں کا سماں لگتا ہے
اک نئے قہر کی آمد کا نشاں لگتا ہے

آج ہر شاخ پہ ہوتا ہے گماں خنجر کا
آج ہر پھول مجھے سنگ گراں لگتا ہے

سرخیاں اوڑھ کے سڑکوں پہ نکلتا ہوگا
ورنہ وہ شخص تو کمرے میں دھواں لگتا ہے

وحشت آباد ہے اس میں کبھی جاکر دیکھو
سبز رنگوں میں نہایا جو مکاں لگتا ہے

وہ وہی ہے ہمیں تسلیم مگر شام کے وقت
صبح جس رنگ میں دیکھا تھا کہاں لگتا ہے

کتنا ساکت ہے ذرا نیچے اتر کر دیکھو
دوڑتی ریل سے منظر جو رواں لگتا ہے

دل کے زخموں کی عنایات ہے ہم پر ورنہ
ایسے موسم میں کہاں کوئی جواں لگتا ہے

جس دن سے میں نے اپنا ہتھیلی پہ سر لیا
قاتل کی تیز تیغ کو مٹھی میں کر لیا

یہ کیا پتہ تھا اور بھی جھلسیں گے جسم جاں
میں نے تو کچھ سکون سے رہنے کو گھر لیا

اس کی صدا پہ ہاتھ بڑھا جیب کی طرف
اپنی صدا نے بڑھ کے مگر قید کر لیا

دنیا کو جب بھی دیکھنا چاہا قریب سے
بتی بجھا کے آنکھ کو ظلمت سے بھر لیا

رسماً ہی ہمکلام ہوا غیر سے وہ کیوں
دل نے ذرا سی بات کا کتنا اثر لیا

ایک بے کار آدمی کا روزنامچہ

زندگی کا تو اپنی یہ معمول ہے
صبح کو دیر سے جاگنا
اور بیڑی کا بنڈل لئے
ٹوآئلیٹ (Toilet) میں پڑے دیر تک
کش پہ کش کھینچنا

اور پھر
کچھ نئے فیشنوں کے لباسوں سے ننگا بدن ڈھانپ کر
پولی کیفے میں جا بیٹھنا
کاؤنٹر پر رکھے
ایک کھاتے میں
نو پانچ ۹۵ کا ہندسہ ڈال کر
پستکالیہ کی جانب قدم موڑنا
لمبی میزوں پہ بکھرے ہوئے
تازہ اخباروں سے جوجھنا
تھک کے بیڑی لبوں سے لگا کر
فضا میں دھوئیں کو اڑانا
اڑا کر اسے غور سے دیکھنا

سوچنا
پھر کتابوں کی الماریاں کھول کر
موٹی موٹی کتابیں لئے
ایک سنسان گوشے میں جاتے ہوئے
نوکری سے لگے آدمی سے
بڑا خود کو محسوس کرنا
شام کو لوٹ کر
کافی ہاؤس کا چکر لگاتے ہوئے
ایک ایک شخص کو
غور سے دیکھنا
دیکھ کر کوئی ساتھی وہاں
یوں لپکنا
کہ برسوں سے جیسے ملے ہی نہ ہوں
میز پر رکھے پیکٹ سے
سگریٹ یوں بے نیازی سے لے کر
لبوں سے لگانا
کہ اپنا ہی پیکٹ ہو وہ
اور پھر
بات سے بات کا سلسلہ
شام سے شب ڈھلے تک

ہزاروں مسائل کا حل ڈھونڈنا
دفتروں اور مکانوں میں
سمٹی ہوئی
دوست احباب کی
بدمزہ زندگی پر
عجب شان سے مسکراتے ہوئے
فلسفی کی طرح
روز گھر لوٹنا
زندگی کا یہی اپنی معمول ہے

آصف نقوی

تم

میرے خیال کی دنیا کے گھپ اندھیرے ہیں
کون آیا ہے روشنی بن کر
دھندلی تصویروں کے نقوش
جو کہ دھندلے بہت تھے پہلے
رفتہ رفتہ ہونے لگے نمایاں
اور جو تصویر ابھری ان تاریکیوں سے
وہ سو فی صدی تمہاری ہے
تم ۔
موجود تھے میرے وجود میں
نہ جانے کب سے
آج اکیلے میں ابھرے ہو
خیال بن کر ۔

"ماٹی"

میں بھی ماٹی ۔ تو بھی ماٹی
مرنا ماٹی ۔ جینا ماٹی
روپیہ ماٹی ۔ پیسہ ماٹی
ماٹی کے یہ کھیل ہیں پیارے
اور جب سب کچھ ہے یہ ماٹی
تو پھر اس ماٹی کے کارن
دنیا میں یہ جھگڑا کیوں ہے
کیوں نہ ہم اس ماٹی کے گھر میں
کچھ دن تک مل جل کر رہ لیں
ہر دکھ سکھ کو ہنس کر سہہ لیں
کیونکہ جب ... ماٹی کا گھر یہ
ڈھے جائیگا ۔
سب کچھ ماٹی ہو جائے گا

Pollution

آج کا انسان اس زمین پر
سانس، روکے کھڑا ہے
کیونکہ آدم کا گھر یہ
ماحول کی کثافت سے بھرپور ہے
ہوا ملگجی ۔
پانی اپنی کیمیائی شکل کھو چکا ہے
اور انسان کو ۔ رفتہ رفتہ زہر دے رہا ہے
کارخانوں کی چمنیاں
اُگل رہی ہیں موت کے بادل
مگر یہ انسان ۔
آخر سانس روک سکتا ہے کب تک
کبھی نہ کبھی تو اسکو سانس لینا ہی ہوگا
وہی اسکی زندگی کا آخری وقت ہوگا
اسلئے شاید یہ انسان ۔ ہے کوشاں
نیا کوئی مسکن کھوجنے میں
تاکہ یہ اسکو آباد کرکے ۔ پھر اسکے سکوں کو برباد کرکے
[illegible] ہے اپنے انتھک سفر پر
نئی منزلوں کی طرف ۔

"ایک سوال"

کارخانے کی بھٹیوں میں سیسہ پگھل رہا ہے
ایک مزدور
جسکا پسینے میں شرابور جسم، ابھری ہوئی پسلیاں
حیران پھیلی ہوئی پتلیاں
تک رہی ہیں مشینوں کے گردش کرتے ہوئے WHEEL کو
اور یہ مزدور تو شاید "سوچتا ہے اپنے شکم سے"
اس وقت یہ سوچتا ہو
کہ بھوک، جو اسکے زندگی کے پہیے کے ساتھ
گرداں ہے کب سے
کیا اس پہیے کے رکنے سے پہلے
ساتھ چھوڑ سکتی ہے اس کا؟

سید نظیر الدین

غزل

پہچان کی دیواریں اور سر پہ سفر لے کر
آئے ہیں زمینوں پر ٹوٹے ہوئے پر لے کر

خوابوں سے الجھنے کی یہ ہم نے سزا پائی
اب چیختے پھرتے ہیں آنکھوں میں سفر لے کر

دیکھا ہے کسی کو جب ہنستے ہوئے گلیوں میں
اک یاد چلی آئی بہتا ہوا گھر لے کر

یہ کس نے پکارا ہے تاریک مکانوں سے
کیوں دوڑتے پھرتے ہیں باتوں میں اثر لے کر

سو بار پکارا ہے ہنستے ہوئے ہونٹوں نے
لوٹ آؤ دوبارہ تم گندم کا شجر لے کر

وہ خود ہی پریشاں ہے کیوں آج خدا جانے
پھرتا رہا کل تک جو چنگیز کا سر لے کر

غزل

پہچانتا کسی کو بھی ایسا کوئی نہ تھا
تھے اور بھی ہزاروں پر ہم سا کوئی نہ تھا
ایسی ہزار راتیں سفر میں گزار دیں
اپنوں کا تھا ہجوم پر اپنا کوئی نہ تھا
ہر شخص منتظر تھا زمانہ شناس بھی
پانی کی تیز دھار پہ ٹھہرا کوئی نہ تھا
ہم خود کو ڈھونڈ رہے تھے ہزار دن کے نام تک
ہم کو بچاتا ہم سے مسیحا کوئی نہ تھا

سمندروں کا سفر اک گمان ہے اب تک
ہمارے بیچ کئی لغزشوں کے پہرے ہیں
اسی میں قید ہیں وابستگی کے راز ہنوز
جو درمیان ہیں کچھ فاصلے سے ٹھہرے ہیں
تمام رات قیامت کا کرب ہوتا ہے
ہماری جاگتی راتوں کے راز گہرے ہیں
ہمیں زمانے کو آنکھوں میں بس کھٹکتے ہیں
قدم قدم پہ نگاہوں کے سخت پہرے ہیں

نسیم صدیقی

سیلاب وہ اٹھا ہے کہ غوغا غضب کا ہے
پانی کے دیوتا کا سراپا غضب کا ہے
ہر شخص بے تکان رواں ہے اُسی طرف
کوہ ندا سے اب کے بُلاوہ غضب کا ہے
خاموشیوں کا کوئی نیا باب وا نہ ہو
دشت جنوں میں شور شرابا غضب کا ہے
ہے منتظر غبار و خس و خاک ہر طرف
اب کے مرے نگر میں تہلکہ غضب کا ہے
صحرا میں پھول کھلنا سنا تھا سو دیکھ لو
ابر گریز پا کا کرشمہ غضب کا ہے
یہ اور بات ہے کہ نہ بن پائی کوئی بات
لیکن نسیم شعر کا لہجہ غضب کا ہے

غزل

موجیں ٹکراتی رہیں یونہی اگر سر اپنا
راز اُگل ڈالے گا اک روز سمندر اپنا
ہو بلندی پہ ہواؤں کے سہارے لیکن
جب بھی چاہیں گی بدل دینگی یہ تیور اپنا
کوئی آذر بھی نہیں ہے جو ٹٹولے ان کو
بھید بتلانے کو تیار ہیں پتھر اپنا
عمر بھر اپنے ہی سائے کے تعاقب میں رہا
پھر بھی وہ شخص نہ ہو پایا گھڑی بھر اپنا
بات کب کی ہے ہمیں یاد نہیں ہے لیکن
ہم بھی رکھتے تھے کبھی چھوٹا سا اک گھر اپنا

غزل

پرواز کی طاقت ہے نہ پر ہے مجھ کو
درپیش خلاؤں کا سفر ہے مجھ کو
جینے کی بھی خواہش نہیں باقی لیکن
مر جاؤں نہ اس بات کا ڈر ہے مجھ کو
کیوں نوح کے احکام کا پابند بنوں
سیلاب سے بچنے کا ہنر ہے مجھ کو
اک جلوہ سے جل جاؤں یہ ممکن ہی نہیں
ہاں پاس کسی شے کا مگر ہے مجھ کو
رشتوں کے تکلّف سے نکل آیا ہوں
اب کشمکشِ خیر و شر ہے مجھ کو
ایسا بھی نہیں ہوں کہ بہل جاؤں گا
سب کھیل تماشہ ہے خبر ہے مجھ کو

غزل

ہر طرف بکھرا ہوا خوابوں کا ملبا پاؤ گے
جاگنے کے بعد دیکھو اور بھی پچھتاؤ گے

رفتہ رفتہ خود سے جب آگاہ ہوتے جاؤ گے
اپنے چہرے پر کئی لوگوں کے چہرے پاؤ گے

ہے ابھی تو ناامیدی کے سفر کی ابتدا
دھیرے دھیرے سارے دروازوں سے واپس آؤ گے

گو کہ آنکلے زمانے کی نگاہوں سے پرے
اپنی زد سے تم مگر بچ کر کہاں جا پاؤ گے

اک فریب زندگی ہیں حشمت و جاہ و جلال
ان کھلونوں سے کہاں تک خود کو تم بہلاؤ گے

خود کو جب آوازکے صحرا میں پاؤ گے اسیر
اور لبوں کے درمیاں کا فاصلہ بن جاؤ گے

بچ نکلنے کی سبھی راہیں ملیں گی پر فریب
[illegible]

غزل

میں اگر بولا تو منظر ہی بدل جائے گا
میرا لب کھولنا ہر شخص کو کھل جائے گا

بے خبر اس کو کہ مٹّی کے کھلونے ہیں یہ جسم
میرا دل طفل نہیں ہے کہ مچل جائیگا

تو جو ناگن ہے تو سُن میں بھی سپیرا ٹھہرا
ایک منتر میں ہر اک جسم کا بل جائے گا

سنگ اچھالا تھا کہ موجوں کے تماشے دیکھوں
کیا خبر تھی کہ سمندر ہی اچھل جائیگا

تم کھڑی کرتے رہو لاکھ فصیلیں لیکن
فیصلہ تیز ہواؤں کا اٹل جائے گا

میرے جلتے ہوئے احساس کا تنہا ساتھی
ایک سورج ہے سو شام آتے ہی ڈھل جائیگا

اقبال فہیم

غزل

دشت و صحرا کبھی تاکتے تھے ہمیں ہم کبھی صورتِ جنسِ بازار تھے
آبلہ آبلہ جھلسی ہوئی خواب ٹوٹے ہوئے ہم کبھی منظروں میں بھی جھنکار تھے

شہر گاؤں کے کتنے پریشان تھے آسماں سے بلائیں اترتی رہیں
اک برہنہ بدن رقصِ اظہار تھا سنگ سجدوں میں اپنے گرفتار تھے

شہر گاؤں کبھی گونجتے غار تھے یا زمیں آسماں آگ ہی آگ تھے
آدمی پا بہ زنجیر حسرت میں تھے اور پرندے کئی بر سرِ دار تھے

ناشنیدہ صدا ہم سے منسوب تھی ہم صداؤں کی نادیدہ تصویر تھے
نیلی جھیلوں میں کس نے ڈبو یا نہیں ہم ابھی ناشناسائے اظہار تھے

موجِ دریا کا ہم آئینہ بن گئے ... دشت و صحرا میں پھر بھی رہے اجنبی
ہم سماتے کہاں ہم میں طوفاں ہزاروں سمندر سمندر کے بیدار تھے

اس تعاقب میں گزری ہے عمرِ جنوں ہے پسِ پردہ کس کی نظر کا فسوں
کون تھا وہ جو پس منظروں میں رہا ہم کہ دیوار و در میں گرفتار تھے

نظم

(اپنی ماں کے نام)

کبھی سوچتا ہوں
کہ ریگِ رواں پر میں اپنے لہو سے یہ تحریر کر دوں
انا الحق کا حامل
نبوت کا حامل
یہ اپنی جلن میں جھلس تو رہا ہے
کہ صحرائے ادراک سے اٹھ رہا ہے
دھواں ہی دھواں سا
کبھی سوچتا ہوں
دھوئیں کی لکیروں میں تحلیل ہو کر
میں بادل کی صورت برف کے مکانوں
پہ لیٹا رہوں گا۔
کبھی سوچتا ہوں
کہ ریگ رواں سے میں منہ ہاتھ دھو کر
میں ریگِ رواں اوڑھ کر
کوہساروں کے سائے بھٹکتا
پھروں گا

کبھی سوچتا ہوں
شہادت کی میں انگلی توڑوں
کہ آنکھ اپنی پھوڑوں
نگاہ اپنی سوئے بیابان کر دوں
کبھی سوچتا ہوں
اس انسان کا تذکرہ میں کروں گا
جو دشتِ فنا میں
سسک تو رہا ہے
بھڑ تو رہا ہے
کہ آنسو لہو کے بہا تو رہا ہے
کبھی سوچتا ہوں
کئی سال سے ایک چڑیا دریچے پہ میرے
کسی بات کا تذکرہ کر رہی ہے
یہ کچھ کہہ رہی ہے
کہ دشتِ فنا میں بکھر کر میں موجِ صدا
بنکے جیتی رہوں گی
کبھی سوچتا ہوں
انا الحق کا حامل
ثبوت کا حامل
حقیقت کے پر تو حقیقت میں اظہار کر دے
مجھے پھر بکھیرے ،، وہ دشت فنا میں

دھواں سا کس لئے صحرائے نم سے اٹھتا ہے
حیات بجھتے چراغوں کا سلسلہ سا ہے
یہ کس کے سنگِ ستم سے لہو لہان ہوا
کہ زخم زخم مرے آنگنوں کا سایا ہے
کدھر کے وار بچاؤں کدھر کے وار سہوں
مرے چہار طرف رقصِ سنگ ہوتا ہے
وہ جن کے چہرے نہیں روشنی سے بھاگیں گے
میں آئینوں میں رہا ہوں مرا تو چہرہ ہے
حقیقتوں سے اُگے پھر نہ آگ آگ دھواں
یہ کائنات جگا دو کوئی سلگتا ہے

لمحے کا تصوّر

ایک لمحے کے تصور میں کئی لمحے اُگے
اور رقصاں ہو گیا دشتِ صدا
میں نے تم کو دیکھنا چاہا تھا بس آئینہ احساس میں
لمحۂ احساس میں
تو مقید گر نہیں لمحات کا
انکشافِ ذات میں لمحات کا سایا نہیں
میں فقط یہ دیکھنا چاہوں وے
آگ میں لمحات کی
دھوپ میں لمحات کی
ایک لمحے کے تصور میں کئی لمحات ہیں
لمحۂ احساس میں ہے
لمس لمحہ
پ لمحہ

سر پھرے صحراؤں میں پھر سر پھری آندھی چلے
سر پھرے دشتِ صدا میں موجِ خون اُٹھے تو دے
یہ دیکھ لیں
لمحات میں
مرے خدا
تو کہاں ہے
کیوں یدِ بیضا نہیں اُگتا ہے اب
میرے خدا

اظہار ندیم

۱

غزل

ٹوٹتے لمحے فضاؤں میں تو گونجے ہونگے
ہم ہی ہونگے کہ نہ سن پائے ہوں جھنکار کوئی
کیسے پاتا کوئی اُن چیختے شعلوں کا سراغ
حلقۂ زخم میں پھرتی رہی تلوار کوئی
خشک صحراؤں میں یہ زندہ صداؤں کا ہجوم
بکھرے ذروں میں بھی پوشیدہ ہے دیوار کوئی
آج بکھر جاتے سورج کا فسوں ٹوٹ گیا
رات بھر ڈھونڈے ہے خوابوں کا گنہگار کوئی
ایک لمحے کو بھی میں خود کا شناسا کر لوں
میرے سر پہ نہ انڈیلے میرا گھر بار کوئی

نظم

اپنی پونجی اپنے جینے کا وسیلہ
شام کو گھر لوٹتی چڑیوں کی ٹولی
اک تھکے راہی کو مسکن کی ضرورت
کون جانے
یہ جئے جانے کا دھوکہ
کب ہمارے خواب کے پر کاٹ لے
یا کوئی بے بال و پر تعبیر کر دے
اس سے بہتر ہے
مکانوں کے ادھورے زرد سایوں میں
خود اپنے خواب کا بستر لگائیں
اور
پل
دو چار پل
آرام کر لیں

عزیز خیرآبادی

غزل

دیارِ شب میں تھے جلتے ہوئے دئے ہم لوگ
اذانِ صبح ہوئی اور چل دئے ہم لوگ

سفر میں دھوپ کی تیزی سے جب بھی گھبرائے
ترے خیال کے سائے میں ہو لئے ہم لوگ

وہ شور تھا کہ کسی کی کوئی نہ سنتا تھا
کھڑے تھے شہرِ صدا میں بھی لب سئے ہم لوگ

کسے پڑی تھی کہ پڑھتا یہاں توجہ سے
کتابِ زیست کے تھے صرف حاشئے ہم لوگ

ہمارے بعد ہوا بھی رہے گی نغمہ بار
فضا میں چھوڑ کے جاتے ہیں قافئے ہم لوگ

خوشی کی تیز ہوا میں بکھر گئے ہوتے
غمِ عزیز میں گم تھے اسی لئے ہم لوگ

ساجدؔ امام

غزلیں

سورج کی جدائی پر یوں چاند سسکتا ہے
آنسو کی جگہ دریا چاندی کا ابلتا ہے
آنکھوں کے دریچے پر پلکوں کی جو چلمن ہے
زلفوں سے سرکنے پر دل اس میں الجھتا ہے
اوراقِ تخیل کے بڑھ جاتے ہیں خود دامن
تحریر کی آنکھوں میں جب خون ٹپکتا ہے
آرزوؤں کو اگلنا بھی کوئی نہیں کرسکتا
ارمانوں کا شیرازہ اس طرح بکھرتا ہے
لمحوں کے جو پنچھی تھے اب وقت کے قیدی ہیں
اس طرح زمانہ بھی انداز بدلتا ہے
الفاظ کے سینوں پر کیوں خون کے دھبے ہیں
شاید کوئی ماضی کو چٹکی سے مسلتا ہے
ہر لمحہ فضاؤں میں یہ کیسی صدائیں ہیں
ساجدؔ مرے سینہ میں کیا ہے جو دھڑکتا ہے

ہر اک جہاں میں انساں نما لگے ہے مجھے
یہ زندگی بھی بس اک واقعہ لگے ہے مجھے
قریب رہتے ہوئے پاس آ نہیں سکتی
کہ اپنی موت بھی اب بے وفا لگے ہے مجھے
خوشی کے ساتھ جو میں اس جہاں میں زندہ ہوں
کسی رقیب کی یہ بددعا لگے ہے مجھے
نہ درد ہے نہ الم ہے نہ غم کا شکوہ ہے
مری حیات بھی اک معجزہ لگے ہے مجھے
ہر ایک ایک نظر دیکھ کر گذرتا ہے
یہ اپنا چہرہ بھی اب آئینہ لگے ہے مجھے
فلک پہ مہر درخشاں نہیں ہے یہ ساجدؔ
کسی حسین کا یہ نقشِ پا لگے ہے مجھے

ڈاکٹر محمد حسن

نظمیں

ویران غار

(ویت نام کے نام)

ان ویران غاروں کو دیکھو
یہاں
انسانیت کی جرأت کی کہانی دفن ہے
یہاں انسان نے اندھی طاقت سے ٹکر لی تھی
ہمدردی کے بول
سارے ہمدردوں کے پاؤں کی زنجیر بنے تھے
اور لٹیرے
ہمارے ہنستے ہوئے بچوں کو کچلتے رہنے کے لیے آزاد تھے

ایک نظر
ان ویران غاروں کو دیکھو
کہیں یہ وہی غار تو نہیں
جن کی اوٹ سے ہر روز نیا سویرا
لٹیروں کے لیے آگ،
ہمدردوں کے لیے شرم،
اور دبے کچلوں کے لیے امید کی
ننھی ننھی سی کرن لے کر ابھرتا ہے!

غبارہ

ایک بچے نے
رنگ برنگے غبارے کو ہنستے ہنستے چھوڑ دیا
آسمان تک اچھلا اور ہنسی کا ایک فوارہ بھی اس کے ہمراہ گیا
آخر آ کر دور گرا
اور ٹکرا کر پھوٹ گیا

ٹیڑھے میڑھے حرفوں میں
کیا اس غبارے پر لکھا تھا
سکھ۔ آنند۔ مسرت۔ ارماں!؟
جانے کیا تھا!

عزیمت

تم نے ایسے گیت کیوں مجھ کو سکھائے ہیں
بتا!
جن کو سننے والا یاں ناپید ہے
تم نے ایسا رقص کیوں میرے مقدر میں لکھا
جس کے ہر گام پہ اک تازہ غم آباد ہے

دور وہ مجمع ہے جس کی آنکھیں، جس کے دل
رقص کے ہر موڑ اور سنگیت کی ہر تھاپ
ہر دُھن کے لیے بے چین ہیں
اور جیسے تم بے نوا اور بے بصر کر آئے ہو

اور ہم دونوں میں اک عزیمت حائل ہے جسے
پہچانتے سب ہیں
مگر کوئی بھی اس کا نام لے سکتا نہیں!

لکھنؤ کے نام

لکھنؤ
تیری سڑکوں پہ وہ چلنے والے کدھر مڑ گئے
جن کے ہونٹوں پہ تھا
پھول سا قہقہہ
جن کی باتوں میں تھا دوستی کا نشہ
جن کے سانسوں میں تھی گومتی کے کنارے کی مٹی کی سوندھی مہک

تو نے شاید انھیں در بدر کر دیا
اور اُن کے لبادوں سے الفت، محبت، شرافت، کرم، دوستی اور
مروّت کے سب لال، سارے گہر
چھین کر
زندگی کے جہنّم کو لوٹا دیا

ڈاکٹر وحید اختر

مرثیہ

دربیانِ جنابِ زینبؑ بنتِ علیؑ

(طویل مرثیے کا انتخاب)

رات یہ حق کے چراغوں پہ بہت بھاری ہے — سانس لینے میں بھی ایمان کو دشواری ہے
کشمکش مرگ و مسیحائی میں اب جاری ہے — چارہ گر آ بھی چکیں، کوچ کی تیاری ہے

نشۂ فتح میں باطل ہے کہ آتا ہے یزید
مسندِ عدل پہ حق اپنا جتاتا ہے یزید

عدل گاہوں میں ستم گر کی عملداری ہے — صدق بھی جرأتِ اظہار سے اب عاری ہے
نگہ و لب پہ لگی مہرِ طلب گاری ہے — ذہن و دل جو بھی ہے محکوموں کا سرکاری ہے

علم کو جہل نے انعام کی رشوت دی ہے
بزدلی نے قدمِ ظلم پہ بیعت کی ہے

چشمِ بینا سے تقاضا ہے نظر بھی نہ اٹھے — گوشِ شنوا کو اشارہ ہے کہ دل کی نہ سنے
لبِ گویا سے ہے اصرار کہ وہ کچھ نہ کہے — ذہنِ بیدار کو تاکید ہے اب سو جائے

فکر ہے یہ کہ زباں لفظ سے تر ہو نہ سکے
دشتِ ظلمات میں شمعوں کا سفر ہو نہ سکے

کوئی رستہ ہو کہ حالات کی زنجیر کٹے — کوئی تیشہ کہ غمِ ذات کی زنجیر کٹے
کوئی شعلہ ہو کہ ظلمات کی زنجیر کٹے — کوئی سورج ہو کہ اس رات کی زنجیر کٹے

کوئی رہبر ہو تو یہ قید کی دیوار گرے
جبر کے ہاتھ پہ خود جبر کی تلوار گرے

کیسے قرآن اترتا ہے، حرا سے پوچھیں　　کیسے ملتا ہے خدا، بیتِ خدا سے پوچھیں
شوکتِ فاقہ و فقرِ آلِ عبا سے پوچھیں　　قوتِ نانِ جویں قلعہ کُشا سے پوچھیں

موت! تیرے وہ طلبگار نمازی ہیں کہاں
زندگی! تیرے مسیحا، ترے غازی ہیں کہاں

عشقِ سلمانؓ ہے کدھر صدقِ ابوذرؓ ہے کہاں　　حق نما جراتِ عمارؓ ولاور ہے کہاں
خندہ زن ظلم پہ میثمؓ کا کٹا سر ہے کہاں　　رعبِ حمزہؓ ہے کہاں صولتِ جعفرؓ ہے کہاں

ہیں کہاں جن سے رسالت کا پتا ملتا تھا
جن کی تلواروں کے سائے میں خدا ملتا تھا

صرف ظاہر کے پرستار فقیہانِ کرام　　روحِ معنی سے تہی کھوکھلے لفظوں کا نظام
ہیں مصلّے گرِدِ خواہشِ سلطنت و انعام　　دین دنیا طلبی ہی کا ہے اک رنگیں نام

ہر نفس عینِ عبادت ہو، وہ طاعت ہے کہاں
جس پہ خود ناز کرے خود عبادت ہے کہاں

جس سے انساں کا نقصاں ہو، وہی شے ہے حرام　　ہے زیاں روح کا ظالم کی حکومت کا قیام
جبر سے صلح میں بے روح صلوٰۃ اور سلام　　جو نہ بیعت ہی ہو غاصب کی وہی حق کا امام

قہر کو سہ لے جو چپ چاپ، وہ قاہر کا شریک
جبر پہ کچھ نہ کہے جو، وہ ہے جابر کا شریک

مطلعِ نور جو ہو جائے اندھیروں کا غلام　　شہرِ اللہ و نبیؐ پر جو چلے سکۂ شام
مسندِ عدل پہ فائز ہوں جو قتالِ عوام　　کذب منبر سے حکومت کے جو کرتا ہو کلام

ہاتھ لازم ہے کہ حاکم کی قبا تک پہونچے
سفرِ بے وطنی کرب و بلا تک پہونچے

گھر اجڑ جاتے ہیں مظلوموں کی غمخواری میں　　موت ملتی ہے گلے زیست کی سالاری میں
مشک چھد جاتی ہے کوثر کی طلبگاری میں　　بازو کٹ جاتے ہیں ایماں کی علمداری میں

حق کی ہے جا، جنھیں تشنہ دہن رہتے ہیں
جسم آزادوں کے بے گور و کفن رہتے ہیں

کب ہر اک بات وحی بنتی ہے کہ دیں گے رسولؐ ۔۔۔ شیرِ حق بولے گا، کب تیغ کا ہوتا ہے نزول
صبر کس وقت ہیں لازم ہے، بتا دیں گی بتولؑ ۔۔۔ دیں گے یہ درس حسنؑ جنگ کا کیا ہو گا اصول

کس کی بیعت ہے حرام آلِ نبیؐ سے پوچھو
جنگ کا طرز حسینؑ ابنِ علیؑ سے پوچھو

کہ باغی سے کرے غیرتِ انساں کو شکار ۔۔۔ ہو جو ممکن تو شرافت کے ہٹا دے آثار
توڑ دے حرفِ صداقت کی سپر اور تلوار ۔۔۔ سخنِ حق کی دیانت پہ کرے قہر کا وار

یہ نہ ممکن ہو تو پھر کرب و بلا میں آئے
سرنگوں مقتلِ شاہِ شہدا میں آئے

حق نے ساتھ اپنے لیا ہے سروساماں کیا کیا ۔۔۔ ساتھ اک گل کے ہیں عنوانِ بہاراں کیا کیا
غنچے ہیں ہم سفرِ نکہتِ پرّاں کیا کیا ۔۔۔ ہیں رفیقانِ رہِ ہجرتِ ایماں کیا کیا

باندھ کر سر سے کفن غنچہ دہاں نکلے ہیں
مرنے گل پیرہناں، سیم تناں نکلے ہیں

پیر کس شان کے، اطفال و جواں کیسے ہیں ۔۔۔ دیکھ لے چشمِ فلک گل بدناں کیسے ہیں
ساتھ دیں نجم و قمر، مہر نشاں کیسے ہیں ۔۔۔ جان لے موت مسیحا نفساں کیسے ہیں

اے شہادت! تیرے تو بانِ طرح دار چلے
زندگی! چوم قدم سیّدِ ابرار چلے

احد و بدر کے سارے شہدا ساتھ ہوئے ۔۔۔ بن کے قاسم حسنؑ سبز قبا ساتھ ہوئے
تیغِ عباسؑ لیے عقدہ کشا ساتھ ہوئے ۔۔۔ شکلِ اکبرؑ میں رسولِ دوسرا ساتھ ہوئے

خالی ہو جائے جو گہوارۂ اصغرؑ بھی ہے ساتھ
سر سے لُٹ جائے جو تطہیر کی چادر بھی ہے ساتھ

اے بنِ فاطمہؑ! فرزندِ علیؑ! سبطِ نبیؐ! ۔۔۔ محرمِ سرِّ جہاں، جانِ رسولِ عربی
جرأتِ نطق ترے سامنے ہے بے ادبی ۔۔۔ تجھ سے کہتی ہے مگر روحِ شہادت طلبی

نفع باطل کا ہے گر زینبؑ کبریٰ نہ ہوں ساتھ
بے زباں حق کا، اگر ثانیِ زہراؑ نہ ہوں ساتھ

کون سردار ترے بعد حرم کا ہوگا — کون سالار اسیرانِ ستم کا ہوگا
کون غم خوار یتیموں کے الم کا ہوگا — کون پُرساں ترے سجادؑ کے غم کا ہوگا
ظلم سے عدل کی حجت نہ مکمل ہوگی
ہوں نہ زینبؑ تو شہادت نہ مکمل ہوگی

اے قلم! عظمتِ زینبؑ کا بیاں کرنا ہے — دل کو خوں، آنکھ کو دریائے رواں کرنا ہے
ہے کہیں مدح، کہیں آہ و فغاں کرنا ہے — قطع ہر گام پہ یاں ایک زیاں کرنا ہے
کر دعا فرق نہ کردارِ سخن میں آئے
ایک لغزش بھی نہ رفتارِ سخن میں آئے

کیا کہا تو نے کہ زینبؑ نہیں شبیرؑ کے ساتھ — کیا کہا تو نے کہ آنکھیں نہیں تنویر کے ساتھ
کب نہ تھا دیدۂ تر نالۂ شب گیر کے ساتھ — کون سا دن تھا کہ سوز نہ تھے ہمشیر کے ساتھ
اس قدر عشق تھا شبیرؑ کو ماں جائی کا
دل بھی اک ساتھ دھڑکتا تھا بہن بھائی کا

حمد اسلام ہیں، اکملتُ کی آیت زینبؑ — بدر تمہید ہے، تکمیلِ شہادت زینبؑ
کربلا نقطۂ آغاز ہے، تمت زینبؑ — ابتدا اس کی حسینؑ اور نہایت زینبؑ
نقطۂ با کو جو پھیلاؤ تو قرآں ہو جائے
حق کی جو شرح کرو، زینبِ ذیشاں ہو جائے

کس طرح بہنیں مدینے میں، جو سرور نہ رہے — بھائی گھر چھوڑے تو کیوں ساتھ میں خواہر نہ رہے
جی میں آئیں نہ قدم شاہ کے وہ گھر نہ رہے — زیست بے لطف ہے جب سر پہ برادر نہ رہے
فاطمہؑ روتی ہوئی بیٹے کے ہمراہ چلیں
اپنا گھر چھوڑ کے زینبؑ سوئے جنگاہ چلیں

کربلا بڑھتا ہے پابوسی سرور کے لیے — منتظر ہے یہ ازل سے شہِ صفدر کے لیے
کب سے آغوش ہے وا اکبرؑ و اصغرؑ کے لیے — نہر بے چین ہے مہمانی کوثر کے لیے
کربلا! اُٹھ ترے اربابِ شرف آپہنچے
بنتِ زہراؑ، پسرِ شاہِ نجف آپہنچے

اِس طرف آئے حسینؑ اور اُدھر لشکرِ کیں — اِس طرف زینبؑ و کلثوم و سکینہ اتریں
اُس طرف اُترے ستم گار، جفا کیش لعیں — اُس طرف کذب کے ہتھیار اِدھر حق کا یقیں
ابر اُمڈے چلے آتے ہیں جفا کاروں کے
پیاس لب چوستی ہے نور کی تلواروں کے

فوج پر فوج چلی آتی ہے غداروں کی — صفیں جمتی ہیں حکومت کے پرستاروں کی
تیر در دست جماعت ہے کماں داروں کی — زہر آلودہ ہیں تلواریں جفا کاروں کی
کون سے اسلحے جلادوں کی ٹولی میں نہیں
کون سا سنگِ ستم ظلم کی جھولی میں نہیں

ظلم بڑھتا ہے تو بڑھ جاتی ہے شانِ تسلیم — تیر آتے ہیں تو تنہا ہے کریم ابنِ کریم
سنگِ دشنام کو دیتا ہے دعا کی تعلیم — غم کے شعلوں میں ہے گل بار نگاہوں کی نسیم
کر کے پیاروں کو فدا شکرِ خدا کرتے ہیں
حق کا حق زینبؑ و شبیرؑ ادا کرتے ہیں

کیا شبیرؑ نے ہم شکل نبیؐ کو رخصت — کھوئی زینب نے بھی اٹھارہ برس کی محنت
کی فدا بھائی نے حق کے لیے اپنی دولت — کون سا غم ہے بہن کی نہیں جس میں شرکت
بھائیوں بیٹوں کا شبیرؑ نے گو غم نہ کیا
لاش پر بیٹوں کی زینبؑ نے بھی ماتم نہ کیا

جا کے رن سے شہِ دیں دونوں کی میت لائے — خوں میں ڈوبی ہوئی خواہر کی ریاضت لائے
اپنے دامن میں یہ گل ہائے شہادت لائے — ظلم سے چھین کے زینبؑ کی امانت لائے
سر کو نیوڑھائے سوئے خیمۂ ہمشیر آئے
دو علم حق کے اٹھائے ہوئے شبیرؑ آئے

ماں نے آغوش میں یوں اپنے شہیدوں کو لیا — جیسے لاشے نہیں شہ دیتے ہوں انعامِ خدا
بال بکھرائے نہ سر پیٹا نہ ماتم ہی کیا — تھام کر دل کو کیا سجدۂ شکرانہ ادا
نوحہ و نالہ و فریاد ہے کیا، غم کیسا
بی بیاں روئیں تو فرمایا کہ ماتم کیسا

بولیں فضّہ میری شہزادیِ اکرم رو لو   ضبط کی ہوتی ہے حد، نازشِ مریم رو لو
گریہ فرماتے ہیں خود سرورِ عالم رو لو   حکم فطرت کا ہے، اے شاہ کی ہمدم رو لو
اب کے بچھڑیں گے تو پھر آنکھیں نہ پائیں گی انھیں
جنت میں آپ کہاں ڈھونڈنے جائیں گی انھیں

منھ سے تو کچھ نہ کہا، پر امڈ آئے آنسو   دیکھتی بیٹھی رہیں بیٹوں کے زخمی پہلو
جھک کے سلجھاتی رہیں خوں میں لتھڑے گیسو   اپنے چہرے پہ ملا اپنے شہیدوں کا لہو
سرخرو کر گئے مادر کو شہیدانِ جفا
پا گئیں گور و کفن بھی نہ قتیلانِ جفا

دل کو یاد آتی رہیں بیٹوں کی پیاری باتیں   آ گئیں لوٹ کے آنکھوں میں کٹی سب راتیں
لایا گزرا ہوا ہر لمحہ نئی سوغاتیں   جھوم اٹھیں آنکھوں کے صحرا میں کئی برساتیں
روئیں تو شاہ کا غم ہوگا فزوں، دھیان ہے یہ
ماجرا دیکھ لو، قربانیوں کی شان ہے یہ

شہِ والا نے جو یہ صبر کا منظر دیکھا   کم ہوا دردِ دلِ کشتۂ غم اور بڑھا
صبرِ زینبؑ سے ملا حوصلہ صبر ایسا   قتلِ اصحاب و اعزّہ کا کوئی غم نہ رہا
حق نے جانا کہ ریاضت نہ اکارت ہوگی
ہیں جو زینبؑ تو شہادت نہ اکارت ہوگی

صبرِ زینبؑ نے دیا حوصلہ صبر ایسا   لاشِ اکبرؑ پہ بھی شبیرؑ کا آنسو نہ گرا
مرگِ عباسؑ سے بھی پرچمِ حق جھک نہ سکا   قتلِ اصغرؑ ہوئے، پر ضبط کا دامن نہ چھٹا
شہ کا دن تعزیتِ اہلِ شہادت میں کٹا
صبر کا مرحلہ زینبؑ کی رفاقت میں کٹا

صبرِ شبیر سے آگے ہیں کئی سخت مقام   حق پہ راضی نہ ہوا اپنے لیے غم کا امام
قرعۂ فال پڑا زینبؑ و سجادؑ کے نام   جیتے جی کارِ شہادت انھیں کرنا ہے تمام
جان دے کر شہدا ظلم و ستم سے چھوٹے
عمر بھر زینبؑ و سجادؑ نہ غم سے چھوٹے

چھپ گیا سبزہ گھنی ہوگئی آلام کی شام   چمکا نیزے کی بلندی پہ سرِ شاہِ امام
چادریں چھنتی ہیں، گھر جلتا ہے، لٹتے ہیں خیام   عورتوں بچوں کے رونے سے پڑا ہے کہرام
روکنے والا نہیں کوئی ستم گاروں کو
پرسہ بھی دیتا نہیں ہے کوئی غم خواروں کو

کوئی والی نہیں وارث نہیں غم کا جز پاس   قاسمؑ و عونؑ و محمدؑ ہیں نہ اکبرؑ عباسؑ
غش میں سجادؑ ہیں شبیرؑ کا خیمہ ہے اداس   تازیانہ لیے شمر آتا ہے بیمار کے پاس
حرم کے ہاتھ سکینہ کے گہر لوٹیں گے
بندۂ جبر دُرِ دیدۂ تر لوٹیں گے

آج زینبؑ نئی تاریخ رقم کرتی ہیں   دل کو وقفِ الم و جور و ستم کرتی ہیں
نئے انداز سے شبیرؑ کا غم کرتی ہیں   بکھرے اوراقِ صحائف کو بہم کرتی ہیں
اک جلا خیمہ ہے اور عترتِ شاہِ شہدا
ہاتھ زینبؑ کے ہے اب قسمتِ شاہِ شہدا

تھے یہی ہاتھ سبب یا زدہم عقدہ کشا   سر پہ بے وارثوں کے جب کوئی سایہ نہ رہا
ام کلثومؑ سے زینبؑ نے بصد یاس کہا   آج ہم ہی کو ہے خیموں کا طلایہ پھرنا
خاک میں مل گئے سب گوہرِ شہوارِ حسینؑ
کل تو خیموں کے طلایہ کو تھے انصارِ حسینؑ

ہوکتا دشت، وہ لاشوں کا ڈراونا جنگل   وہ سیہ رات، وہ آلام کے کالے بادل
چاند پژمردہ، سیہ رنگ ستاروں کے کنول   سر پہ چھت گھر کی نہ سایہ نہ ردا نے آنچل
بی بیاں خیمۂ آلام میں گھبراتی تھیں
کوئی پتہ بھی کھڑکتا تھا تو ڈر جاتی تھیں

زخم چبھتے تھے سسکتی تھی زمینِ مقتل   ٹکڑے تیغوں کے تھے اور نیزوں کے ٹوٹے ہوئے پھل
طبل و قرنا کی صدائیں تھیں کہ آواز دہل   بھرتے تھے غول درندوں کے، پرندوں کے دل
دشت میں لاشِ امامِ شہدا تنہا تھی
خیمۂ سوختہ میں آلِ عبا تنہا تھی

اپنی شب گشت میں زینبؑ نے یہ دیکھا اک بار — کوئی آتا ہے سوئے خیمۂ آلِ اطہار
کہا زینب نے "نہ آ اس طرف اے شاہ سوار — تھک کے سوئے ہیں ابھی سوختہ جاں سینہ فگار
لُٹ چکی خیمہ سرا، مال و گہر پاس نہیں
کوئی بھی چیز بجز دیدۂ تر پاس نہیں"

آنے والے نے نہ روکا مگر اپنا رہوار — بنتِ حیدرؑ نے غضبناکی سے دیکھا اک بار
غیظ کے تیوروں میں شیرِ خدا کے آثار — تھام لی بڑھ کے لجامِ فرسِ شاہ سوار
اور فرمایا "قدم اب نہ بڑھانا آگے
ہے یہی حدِ ادب، اس سے نہ آنا آگے"

اپنے رہوار کو راکب نے وہیں روک لیا — اُلٹی چہرے سے نقاب اور یہ زینبؑ سے کہا
"تیری غیرت پہ مری جان ترا باپ فدا — تیری نصرت کے لیے آیا ہے خود شیرِ خدا
آج میں خیمے کے اطراف پھروں گا بیٹی
تو کر آرام، میں بیدار رہوں گا بیٹی"

دوڑ کر باپ کے سینے سے لگی وہ ناشاد — صابرہ بیٹی نے کی عقدہ کشا سے فریاد
"آپ فرماتے ہیں دنیا میں ہر اک کی امداد — ہم پہ اس دشت میں ہوتی رہی کیا کیا بیداد
آپ کے گھر کو ستمگاروں نے برباد کیا
پیاس نے ساقیِ کوثر کو بہت یاد کیا"

"اے خبرِ حق مدد دے، قبلۂ ایماں مدد دے — آلِ احمدؐ کی ہے اور غم کے بیاباں مدد دے
امتحاں اور بھی ہیں، مرضیِ یزداں مدد دے — طاقتِ صبر ہو سجادؑ کو ارزاں مدد دے
آپ کا پوتا ہے اور طوقِ گراں ہے بابا
بازوؤں پہ مرے دُرّے کا نشاں ہے بابا"

کہا حیدرؑ نے "ستم اور مری جاں ہوں گے — دشت در دشت مرے پھول پریشاں ہوں گے
شہر در شہر ترے فتنے کے ساماں ہوں گے — شام و کوفہ میں نئے ظلم کے عنواں ہوں گے
نفس سے اپنے جہاد اب تجھے کرنا ہوگا
زندہ رہتے ہوئے ہر سانس پہ مرنا ہوگا"

"تو جو گھبرائی تو بحرِ غرق ہے کشتیِ نجات
خاتمہ حق کا ہے لرزا جو ترا پائے ثبات
تیرے باندھی کی رسن باندھے گی جلّادوں کے ہات
کربلا کا ہے خلاصہ تری اک تنہا ذات
بے چادر جو تجھے ظلم نہاں ہووے گا
بے ردائی سے تری کذب عیاں ہووے گا"

بنتِ زہرا نے رکھی لاج لسانِ حق کی
رہیں راضی برضا ہاتھوں میں رسی جو بندھی
مُنھ کو بالوں سے چھپائے رہیں جب اور جو چھنی
نیل دُرّوں کے اُبھر آئے شکایت نہ ہوئی
ناقے رسوائی کے ہیں اور عماری بھی نہیں
پا برہنہ ہے امام اور سواری بھی نہیں

کرتی ہیں پردۂ زینبؑ کا ردائیں ماتم
بچوں کی پیاس پہ اطفال کی آنکھیں ہیں نم
صحبتیں کرتی ہیں بیماریِ سجادؑ کا غم
دیکھ کر سرِ شہدا کے سرِ قتال ہے خم
جبر کے ہاتھ میں ہیں اب سینہ فگاری کے لیے
تازیانے ہیں ستمگاروں کی خواری کے لیے

اس کے آگے بھی کئی سخت مقامات ملے
صبر کا حکم ملا غم کے اشارات ملے
سرِ شبیرؑ سے احکامِ عبادات ملے
کہیں رُکنے کہیں بڑھنے کے پیامات ملے
لبِ زینبؑ غمِ شبیرؑ کو یوں عام کریں
فتح کوفہ ہو سرِ معرکۂ شام کریں

گزرے کتنے ہی مراحل سے اسیرانِ محن
پا برہنہ گئی تا شام ستم دل کی جلن
آئی دربارِ یزیدی میں شہِ حق کی بہن
حق کے پتے بارہ گلے، ظلم کی تھی ایک رسن
گردنِ نور میں ظلمات کی زنجیریں تھیں
صبح کی کرنیں تھیں اور رات کی زنجیریں تھیں

تختِ زر پر متمکن تھا شہنشاہِ شام
نقرئی کرسیوں پر تھے ہوسِ زر کے غلام
عصمتیں خاک بسر طوق بہ گردن تھا امام
عارضی فتح کے نشّے نے کیا حق سے کلام
"دیکھ لی آلِ محمدؐ نے بغاوت کی سزا
باغیوں کو ملی انکا ر حکومت کی سزا

کانپ اُٹھیں غیظ سے بنتِ اسد ذوالاکرام ہٹ گئے سامنے سے ڈر کے غلام ابنِ غلام
سرنگوں نیزے ہوئے، اوڑھ لی تیغوں نے نیام کرسیاں پست ہوئیں، ہلنے لگی مسندِ شام
سر جھکائے وہ اُٹھیں، خود گرے، تاج گرا
جبر نے جان لیا، تخت سے وہ آج گرا

مسند آرائے حکومت سے کیا ایسے کلام جیسے حاکم نہیں، سامنے اک ادنیٰ غلام
غیظ نے کھینچ لی یوں تیغِ خطابت سے نیام عرش سے جیسے علیؑ کے لیے اتری ہو حسام
کاٹ ایسی ہے کہ زخم کا بھرے گا نہ کبھی
ظلم لڑنے کا تصور بھی کرے گا نہ کبھی

یہ زباں تیر بھی، نشتر بھی ہے، شمشیر بھی ہے خنجر و نیزہ بھی ہے، طوقِ گلوگیر بھی ہے
تشنگی کہتی ہے لب تشنۂ تقریر بھی ہے تیغِ عباسؑ بھی، مظلومیِ شبیرؑ بھی ہے
آب میں اس کی ہے لب تشنگیِ اصغرؑ بھی
کاٹ میں اس کی ہے شاملِ نگہِ سرور بھی

اس کے رک رک کے تڑپنے سے یہ ہوتا ہے عیاں ابھی اکبرؑ کے کلیجے میں کھٹکتی ہے سناں
اس کی آواز کی اونچائی سے ملتا ہے نشاں ابھی نیزوں کی بلندی پہ ہے فرقِ ایماں
سر جو اٹھتا نہیں شبیرؑ کی ماں جائی کا
بوجھ سینے پہ ہے بیواؤں کی رسوائی کا

پھر بھی وہ رعب ہے، لرزے میں ہیں تخت و منبر نگہِ غیظ سے ہیں زلزلے میں بام و در
خوف سے اٹھتی نہیں جھوٹ کے حاکم کی نظر بارِ اپنے گناہوں کے دبے ہیں خود سر
حق کو چھیڑا ہے تو ظلم اپنی کہانی سن لے
حالِ شبیرؑ کا زینبؑ کی زبانی سن لے

جھک گیا فرقِ ستم حق کی زباں کے آگے فق ہوا کذب کا رخ صدق عیاں کے آگے
قہقہے ڈوب گئے اشکِ رواں کے آگے بند لب ہو گئے زینبؑ کے بیاں کے آگے
شمر اٹھا اور بھی کچھ تنگ رسن کرنے کو
تازیانے بھی بڑھے قطعِ سخن کرنے کو

صبر کہے اُن سے کہ دل اپنا سنبھالیں زینبؑ — جتنے بھی درد ہیں سینے میں چھپا لیں زینبؑ
اشک مظلوموں کے آنکھوں سے لگا لیں زینبؑ — بکھرے اوراقِ صحائف کو اٹھا لیں زینبؑ

فرضِ سالاریِ اربابِ نظر باقی ہے
کربلا اور مدینے کا سفر باقی ہے

رات یہ حق کے چراغوں پہ بھاری اب بھی — نور و ظلمات میں ہے معرکہ جاری اب بھی
مسند و تخت ہیں کردار سے عاری اب بھی — بے حدی خواں ہے شہادت کی سواری اب بھی

غم کی قسمت کو ہے درکار فغانِ زینبؑ
چاہیے حق کے لیے اب بھی زبانِ زینبؑ

شمیم حنفی

ڈرامہ

پانی بہہ رہا ہے

کردار

بوڑھا	وقت کا استعارہ
پروفیسر	ایک معمر تاریخ داں
آفتاب / داور	پروفیسر کے شاگرد

چار سفید پوش پیکر ——

آوازیں:

ایک آواز ——

ہجوم کی آوازیں ——

پرچھائیاں

روشنیوں کے بدلتے ہوئے رنگ

پس منظر سے ابتدائی موسیقی —— پرشور اور لرزہ خیز —— موسیقی کی دھن رفتہ رفتہ دھیمی ہوتی جاتی ہے۔ ہوا کا شور سنائی دیتا ہے، اس شور میں گھوڑوں کی ٹاپ گونجتی ہے۔ پھر دھیمی ہوتی جاتی ہے اور بالآخر گھڑی کی ٹک ٹک میں ڈوب جاتی ہے ——

پس منظر ہی سے سرگوشیوں میں ایک آواز ابھرتی ہے: گمبھیر اور حزنیہ:

تجھے تو اس کی خبر ہے ——— مرے خدا مرے دل
کہ اس کرے پہ ہے جو کچھ بھی اس کے پہلو میں
وہ شئے جس پہ شکن ہے تری ہی کروٹ کی
ترے ہی دائرے کا جزو ہیں، وہ دور، کہ جب ———
چٹانیں، آنکھیں، ستارے چلے، زمانے ڈوبے

(آواز میں گونج کی کیفیت پیدا ہوتے ہی دفعتاً اسکرین پر روشنیاں گردش کرنے لگتی ہیں۔)

وہ گردشیں جنھیں اپنا کے ان گنت سورج
ترے سفر میں نکلے۔ ——— مرے خدا، مرے دل!
گھلا ہوا مری سانسوں میں ہے سفر تیرا ——— تجھے تو اس کی خبر ہے
مرے خدا، مرے دل،

آواز میں ہانپنے کی کیفیت

——— اسٹیج پر مکمل تاریکی ———

(آواز کے ساکت ہوتے ہی گھڑیال بجتا ہے ——— مہ بہ لمحہ پاؤں کی چاپ کے ساتھ فرش پر چھڑی کی مسلسل ٹک ٹک کے ساتھ ایک بوڑھا، ہاتھ میں لالٹین لیے اسٹیج پر آتا ہے۔ دھندلی روشنی میں اس کے جسم پر سائے کا گمان ہوتا ہے۔ بوڑھا اسٹیج کے بیچوں بیچ کھڑا ہو جاتا ہے۔ لالٹین کی لو اونچی کرتا ہے اور بلندیوں کی طرف دیکھنے کے انداز میں اپنی نگاہ پردے کی طرف اٹھاتا ہے ——— بوڑھے سے ملتی جلتی ایک شبیہہ پردے پر نمودار ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ بڑی ہوتی ہوئی اسٹیج پر بوڑھا اور پردے پر اس سے ملتی جلتی شبیہہ، دونوں ساکت ہیں۔

ایک آواز: (پس منظر سے) تم؟ تم کون ہو؟

(بوڑھا خاموش رہتا ہے)

آواز: (گھبرا کر) تم بولتے کیوں نہیں؟ کون ہو تم؟

(اچانک بوڑھے کا قہقہہ گونجتا ہے)

آواز: بتاؤ۔ بتاؤ، کون ہو تم؟

بوڑھا: (دھیرے سے) وقت!

(موسیقی کی ایک کپکپاتی ہوئی لہر)

آواز: (سوالیہ) وقت!

بوڑھا: ہاں! میرے ماتھے کی سلوٹوں کو غور سے دیکھو ـــــ اس پر کتنی صدیاں کھنچی ہوئی ہیں۔ میری آنکھوں میں جھانکو ـــــ ان میں کیسے کیسے خواب چھپے ہوئے ہیں ـــــ میرے ہاتھوں کو دیکھو ـــــ انھوں نے تمھارے راستے میں کتنے چراغ روشن کیے ہیں۔ (دانت بھینچ کر) اور میرے تلوؤں کو دیکھو ـــــ (پیر اٹھاتا ہے) ان سے خون رس رہا ہے ـــــ یہ سفر بہت لمبا ہے، بہت جاں کاہ ـــــ

(اسٹیج پر سرخ روشنی پھیل جاتی ہے۔ پرچھائیں غائب ہو جاتی ہے۔)

ہیجان خیز موسیقی

آواز: (خوفزدہ) راستے؟ راستے! راستے؟ سفر! ـــــ اور منزل؟

(بوڑھا ہنستا ہے)

آواز: اتنا نہ ہنسو کہ میں ڈر جاؤں! بتاؤ، اس سفر کا خاتمہ کہاں ہے؟

بوڑھا: خاتمہ کہیں نہیں ـــــ ہر لمحہ آغاز ہے ایک نئی کہانی کا۔ اس سفر کے راستے میں تمھیں کسی کبھی منزل کا بھید نہ ملے گا۔

(ہنستا ہے)

پردے پر روشنیاں گردش کرتی ہیں۔ بوڑھا خاموش کھڑا دکھائی دیتا ہے ـــــ
روشنیاں گل ہوتے ہی موسیقی کی ایک لہر ابھرتی ہے۔ گھڑی کی مسلسل آواز کے ساتھ ـــــ

(پروفیسر کا مطالعے کا کمرہ ــــ عقبی دیوار پر دو کھڑکیاں ــــ دائیں اور بائیں
دو دروازے۔ وسط میں ایک ایزی چیئر ــــ پہلو میں کتابوں کی الماری۔
سامنے میز پر کچھ فائلیں، کاغذات، قلمدان ــــ عقبی دیوار پر ایک کیلنڈر جس پر
بڑے ہندسوں میں ۱۹۶۵ کا نقش۔ اسٹیج روشن ہوتے ہی پروفیسر ایزی چیئر پر بیٹھا
ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کسی سوچ میں گم۔)

داور: (دائیں دروازے پر دستک کے ساتھ) میں اندر آ سکتا ہوں؟

(پروفیسر ادھر نظر اٹھاتا ہے)

پروفیسر: (بھرائی ہوئی آواز میں) آ جاؤ!

(داور اندر آتا ہے اور ایک تپائی پر بیٹھ جاتا ہے)

آفتاب: (بھاری قدموں سے چلتا ہوا بائیں دروازے سے بلا اجازت لیے داخل ہوتا ہے) ہلو پروفیسر (تضحیک آمیز انداز میں)

پروفیسر: (اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے) اوہ! آفتاب

آفتاب: (ایک کرسی پر بیٹھ کر پاؤں پھیلاتے ہوئے) پروفیسر! میں خود بیٹھ گیا ہوں۔

(پس منظر سے ایک [illegible])

داور: (چونک کر) روشنی بہت تیز ہے۔

(پروفیسر چپ رہتا ہے۔ آفتاب کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے)

(پروفیسر سوالیہ نظروں سے آفتاب کی طرف دیکھتا ہے)

آفتاب: میں یوں ہنس رہا ہوں کہ تمھیں روشنی کے وجود کا احساس تو ہوا۔

پروفیسر: (تنبیہ کے انداز میں) آفتاب! ننھے بچے! تم بہت شوخ ہوتے جا رہے ہو۔

آفتاب: (دیوانہ وار ہنستے ہوئے) غور سے دیکھو پروفیسر! داور کے چہرے پر تمھیں آنکھیں دکھائی نہ دیں گی۔

(داور حیرت سے پلکیں جھپکاتا ہے)

آفتاب: اس کی آنکھیں گردن پر چپکی ہوئی ہیں ــــ تیجے ــــ وہ صرف گذری ہوئی نصلوں کا

نوحہ گرہے۔ زندگی کی ہر سچائی پر ـــــ اس کی نگاہ صرف اس وقت پڑتی ہے تب وہ تاریخ کا کوڑا کرکٹ بن جائے۔ اس کے ماضی کا حصہ بن جائے۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد ہو جائے۔ ان افسانوں کا تجربہ بن جائے جو زمین میں دفن ہو چکے ہیں۔ ایک ایسا افسانہ بن جائے جو ہوا کے کسی کھوئے ہوئے جھونکے کی زبان پر آیا تھا۔

(پروفیسر دیوار پر لگے ہوئے کیلنڈر کی جانب دیکھتا ہے)

(اور بھی گھبرا کر اسی طرف دیکھنے لگتا ہے۔

آفتاب: (ہنستے ہوئے) دیکھو، دیکھو، اپنے ماتھے کی قندیلوں کو اگر روشن کر سکو تو دیکھو۔ ایک نو ـــ سات ـــ پانچ ـــ ۱۹۷۵۔ یہ تمھارا حال ہے۔ YOUR PRESENT۔ سڑی گلی لاشوں کی پرستش سے اگر تمھیں مہلت مل سکے ـــــ تو دیکھو!

داور: (دھیمے لہجے میں) روشنی بہت تیز ہے۔

(پس منظر سے موسیقی کی ایک لہر طوفانی اور لرزہ خیز۔ گھڑگھڑاہٹ کی ایک آواز کے ساتھ اسٹیج کی روشنی گل ہو جاتی ہے۔ اس شور و غل میں اسٹیج کا منظر غائب ہو جاتا ہے اور پردے پر بوڑھے کی پرچھائیں ابھرتی ہے۔ وہ چھڑی ٹیکتا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا ہے۔)

آواز: (پس منظر) کون ہو تم؟ کون ہو؟

(پرچھائیں رک کر بلندیوں کی جانب سر اٹھاتی ہے۔ اس درمیان میں بوڑھا پھر اسٹیج پر آتا ہے۔ لالٹین لیے ہوئے۔)

آواز: تم بولتے کیوں نہیں؟ کون ہو تم؟ (جھنجھلا کر) کون ہو؟

(بوڑھا اسٹیج کے بیچوں بیچ کھڑا ہو جاتا ہے اور اسکرین پر پھیلی ہوئی پرچھائیں کی طرف دیکھتا ہے جو دھیرے دھیرے حرکت کر رہی ہے۔ بالآخر غائب ہو جاتی ہے۔)

بوڑھا: (کانپتی ہوئی آواز میں) میں وقت ہوں (آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے)

آواز: رک جاؤ! رک جاؤ! رک جاؤ!

بوڑھا: (حقارت آمیز لہجہ) پانی کبھی نہیں رکتا۔ تم ہوا کے جھونکے کو مٹھی میں بند کرنا چاہتے ہو۔ ہونہہ!

آواز: لیکن تم کہاں جا رہے ہو؟ کہاں؟ کس طرف؟

بوڑھا: (ٹھہرے ہوئے لہجے میں) مجھے معلوم نہیں۔

آواز: پھر یہ لالٹین تمھارے ہاتھ میں کیوں ہے۔ تمھیں کس راستے کی جستجو ہے؟ بتاؤ؟ کدھر جاؤ گے؟

بوڑھا: مجھے معلوم نہیں

آواز: (جھنجھلا کر) تم جھوٹ بولتے ہو؟ تمھیں سب کچھ معلوم ہے۔ تمھاری آستین میں کتنے تجربے چھپے ہوئے ہیں — تم! بوڑھے! نامہربان! ظالم وقت!

(بوڑھا اپنی ڈھیلی ڈھالی آستین جھٹکتا ہے)

بوڑھا: (اپنے آپ سے) کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں؟ یہ آستین خالی ہے۔ یہ سینہ خالی ہے۔ یہ آنکھیں خالی ہیں اور یہاں سے وہاں تک، کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں، ہلکے سبز دھند لکے سے بھرا

(اسٹیج پر سبز روشنی)

بوڑھا: اس سبز رنگ سے دھوکا نہ کھاؤ۔ مہندی کے پتیوں کی طرح مجھے مسل کر دیکھو تمھاری ہتھیلی لال ہو جائے گی ———

(اسٹیج پر سرخ روشنی)

بوڑھا: (چند لمحوں کے توقف کے بعد) میں سفر میں ہوں۔ ایک ایسے راستے پر جس کا خاتمہ ایک نئے راستے پر ہوتا ہے، پھر ایک اور نیا راستہ، پھر ایک اور — چاروں طرف راستوں کا جال بچھا ہوا ہے۔

(اسٹیج پر روشنیاں گردش کرنے لگتی ہیں)

(روشنیوں کی گردش سے پریشان ہو کر بوڑھا حیرت سے چاروں طرف دیکھتا ہے)

بوڑھا: (خود کلامی) کیا یہ سچ ہے؟ یہ سچ ہے کہ انسانوں کی ہر پیڑھی تبدیلی اور ترقی کے مخصوص مرحلوں سے گزرتی ہے اور ایک دائرے میں سفر کرتی ہے۔ ایک دائرے میں، ایک دائرے میں انسان میرا سر چکرا رہا ہے ———

(روشنیوں کی گردش تیز ہو جاتی ہے)

(پس منظر سے ہلکی گھڑ گھڑاہٹ اور موسیقی کی ایک تیز لہر)

آواز: (گھبراہٹ کا لہجہ) تو کیا؟ تو کیا کوئی بھی حقیقت نئی نہیں۔ کوئی بھی منظر نیا نہیں۔ کوئی بھی تجربہ انوکھا اور تازہ کار نہیں۔

بوڑھا: (چیخ کر) ہاں! ہاں! ہاں! سب کچھ پرانا ہے۔ جو آج ہو رہا ہے، کل ہو چکا ہے۔ امید اور مایوسی، روشنی اور اندھیرا، نشاط اور غم، سکھ اور دکھ، انھیں دو نقطوں کے درمیان تمھاری زندگی چکر لگاتی رہتی ہے۔

(روشنیوں میں لرزش)

ہر تہذیب وقت کی ٹہنی پر کونپلوں کی طرح پھوٹتی ہے، کھلتی ہے، مہکتی ہے اور مرجھا جاتی ہے۔ تم اپنے تجربوں کی اس گھسی پٹی روداد کو، جسے تم تاریخ کہہ کر پکارتے ہو، ماضی، حال اور مستقبل کے خانوں میں کیوں بانٹتے ہو۔ جو تھا وہ ہے اور وہی ہوگا۔ دائرہ در دائرہ اسی طرح تم بھٹکتے رہو گے اور یہ سمجھ کر خوش ہوتے رہو گے کہ تم ترقی کر رہے ہو۔ ترقی ـــــ دائرہ میں گھومنے کا نام ترقی ہے؟ بولو؟ جواب دو؟ (دیوانہ وار ہنستا ہے)

(روشنیوں کی گردش تیز ہوتی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ دھیمی، پھر غائب۔ اسٹیج کی روشنی غائب ہوتے ہی پردے پر بوڑھے کی شبیہہ ابھرتی ہے اور پس منظر سے گھوڑوں کی ٹک ٹک۔ یہ آواز تیز ہوتی جاتی ہے۔ گھوڑوں کی ٹاپ کی گونج کے ساتھ منظر بدلتا ہے۔)

(منظر ـــــ پروفیسر کا مطالعے کا کمرہ۔ پروفیسر آرام کرسی پر نیم دراز پائپ کے دھیمے دھیمے کش لے رہا ہے۔ داور ایک تپائی پر بیٹھا ہوا کتابوں کی الماری کو گھور رہا ہے۔ آفتاب کی نگاہیں پروفیسر کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں)

پروفیسر: (پائپ کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے) تم بہت مضمحل دکھائی دیتے ہو داور۔

داور: (جمائی لے کر) سفر نے تھکا دیا ہے، پروفیسر!

(آفتاب ہنس پڑتا ہے۔ داور غصیلی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔)

پروفیسر بھی سوالیہ نظروں سے آفتاب کی طرف دیکھتا ہے۔

پروفیسر: تمھاری کھلنڈری طبیعت تمھیں چین نہیں لینے دیتی۔
آفتاب: (مسکراکر) یہ کھلنڈرا پن ہے ؟
پروفیسر: (جھنجھلاکر) اور نہیں تو کیا؟ داور سے اس کے سفر کا حال تو سننے دیتے ـــــ
آفتاب: (اچانک اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے) سفر؟ ہونہہ (منہ بناتا ہے) ایک ہی نقطے پر ٹھہری ہوئی یہ بے رنگ بے نام، بے چہرہ، بے نمک زندگی ـــــ یہ سفر ہے ـــــ تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہم سب ایک طویل سفر سے گذر کر اس نقطے تک پہنچے ہیں۔ انسان غاروں اور جنگلوں اور گھاٹیوں اور صحراؤں اور کوہساروں کو عبور کرتا ہوا تاریخ کے اس موڑ تک آیا ہے۔

(پروفیسر کیلنڈر کی طرف دیکھنے لگتا ہے)

صدیوں پر پھیلے ہوئے اس سفر کے سامنے تمھارے چند گھنٹوں کے سفر کی حقیقت کیا ہے اور صدیوں کا وہ سفر بھی ـــــ ہونہہ! (چپ ہو جاتا ہے)
داور: (اداس لہجے میں) کہو کہو، تم رک کیوں گئے؟

(آفتاب پھر ہنس پڑتا ہے)

پروفیسر جھنجھلا کر اپنی کتاب بند کر دیتا ہے۔
آفتاب: (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ جس سفر کی روداد تم کتابوں کے صحرا میں ڈھونڈتے پھرتے ہو، وہ جھوٹی ہے۔ کتابوں کی قید سے باہر نکلو تب تمھیں کھلی ہوئی فضا کا احساس ہوگا پروفیسر۔ اس وقت تمھیں اپنے دیوتاؤں کے، جن کی تم پرستش کرتے ہو، ان دیوتاؤں کے مٹی کے پیر دکھائی دیں گے۔ تمھارے ہیرو جرائم پیشہ تھے۔ مجھے ان کی آپ بیتیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ـــــ مطلق العنان بادشاہوں، تجارت پیشہ دینی رہنماؤں کی فراغت اور سکون کے دائرے سے باہر بھی ایک دنیا تھی ـــــ بھرے پیٹوں، مرجھائے ہوئے چہروں اور خواب سے بوجھل آنکھوں کی دنیا ـــــ اس دنیا کی کہانی بھی کبھی تم نے سنی ہے؟
پروفیسر: (تنبیہ کے انداز میں) آفتاب!
آفتاب: (اس تنبیہ سے یکسر بے نیاز دکھائی دیتا ہے) تمھاری تاریخ ایک گہری سازش تھی۔ اقتدار اور سیاست اور جھوٹی مذہبیت کی، جس نے انسان کی جبلتوں کو پسپا کرنے کی کوشش کی؛ اسے

فطری زندگی کے جوہر سے محروم کرنے کی جستجو کی، اس کے آزاد ارادوں کو کچلنا چاہا ــــــ

داور: (کانپتی ہوئی آواز میں) آفتاب!

آفتاب: (اسی رو میں) جرائم کا وہ سلسلہ آج بھی جاری ہے، قومی ترقی اور تحفظ کے نام پر، روایات اور اقدار کے نام پر، اجتماعی مقاصد کے نام پر ــــــ فرد، فرد نہیں، خشک ایندھن ہے جسے تم معاشرے کی بھٹی میں جھونک دینا چاہتے ہو۔

(پروفیسر غصے میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

پروفیسر: (چیخ کر) آفتاب!

(آفتاب اور داور دونوں اس کی طرف دیکھتے ہیں)

پروفیسر: (کلبلا کر) تمھارا دماغ خراب ہو چکا ہے۔ تم ہمیں بھی پاگل کر دوگے۔ تم اس خفیہ منصوبے، اس مقدس اور الوہی اسکیم کو کیوں نہیں سمجھتے جس کے مطابق یہ کائنات سفر کی مختلف منزلوں سے گذرتی رہی ہے۔ اس SECRET PLAN کو سمجھے بغیر تم نسل انسانی کے جرائم اور گناہوں کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ زندگی کے معنی کو نہیں سمجھ سکتے۔

(بے تابانہ ٹہلنے لگتا ہے)۔

داور: (سنجیدہ لہجے میں) جو کچھ پرانے زمانوں میں ہو چکا اسے تم آج کے عقلی پیمانوں پر ناپتے ہو۔ یہ فیتہ ٹوٹ جائے گا۔

آفتاب: (مضحکہ اڑانے کے انداز میں) بہت اچھے! تو تم اس زمانے کو اپنے تخیل کی بساط پر پھر سے زندہ کر لوگے ــــــ اسے سمجھنے کی خاطر ــــــ کیوں؟

داور: بیتے ہوئے موسموں کی حقیقت کو سمجھنا ہے تو وجدان کی آنکھیں کھولو ــــــ جبھی تم اپنے بزرگوں کی زندگی کا بھید پا سکوگے ــــــ

آفتاب: مجھے ان ورزشوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہمارا حال ویت نام ہے اور وہ تیسری دنیا جس کی گھٹن نے ہمارے حواس کو پژمردہ کر دیا ہے۔ تم اب تک اپنے ماضی میں سانس لے رہے ہو۔ ــــــ تم نے آج کا اخبار دیکھا ــــــ؟

(داور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا ہے)

آفتاب: (مسکرا کر) آج کا اخبار بھی اس وقت پڑھو گے جب وہ پرانا ہو جائے ــــــ تمھاری تاریخ بن جائے (ہونہہ)

(پروفیسر کیلنڈر کی طرف دیکھنے لگتا ہے)

(آفتاب کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ پروفیسر بھی اپنی ایزی چیئر پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیتا ہے اور ہانپتا ہے ــــــ داور تشویش ناک نظروں سے دونوں کی طرف دیکھتا ہے ــــــ چند ثانیوں کی خاموشی۔)

(پس منظر سے جلوس کا شور ــــــ نعروں کی آواز صاف سنائی دیتی۔ پروفیسر چونک کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کھڑکی کی طرف بڑھتا ہے۔ داور بھی اس کے ساتھ جاتا ہے۔ جلوس کے شور میں، وقتاً فوقتاً صرف "روٹی" کی آواز سنائی دیتی ہے۔ بھاری قدموں کی گونج۔ لحہ بہ لمحہ آواز دھیمی ہوتی جاتی ہے۔ پروفیسر اور داور پھر واپس آ کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ جاتے ہیں ــــــ اور آفتاب کی طرف دیکھتے ہیں جو اپنی کرسی پر سر جھکائے اسی طرح بیٹھا ہوا ہے ــــــ)

آفتاب: (نظریں اٹھا کر) دیکھ لیا؟ دیکھ لیا تم نے؟ روٹی ــــــ روٹی ــــــ یہ چار حرفی لفظ، انسان کا سب سے بڑا خواب ہے ــــــ

پروفیسر: (تنبیہ کے انداز میں) آفتاب!

آفتاب: (مسکرا کر) فرانس کی ملکہ کے وہ الفاظ تمھیں یاد ہیں داور ــــــ روٹی نہیں ملتی تو کیک کھاؤ۔ منصوبے اور وعدے اور ایک اچھے مستقبل کی بشارت بھی تو کیک کی طرح لذیذ ہوتی ہے ــــــ کیوں؟

داور: (جھنجھلا کر) سوال! سوال ــــــ سوال! تم صرف سوال کرنا جانتے ہو؟ تمھارے پاس کسی بات کا جواب بھی ہے ــــــ! مجھے سوچنے دو ــــــ

آفتاب: (تمسخر کے انداز میں) کیا کہنے ہیں ــــــ تمھاری سوچ ہر سوال کا جواب فراہم کر دے گی۔ کیوں؟

داور: پھر ایک سوال؟ ــــــ مجھے سوچنے دو ــــــ

آفتاب: (پروفیسر کی طرف اشارہ کر کے) ان کتابوں میں اور کیا ہے، سوچ کی روداد کے سوا سوال

آج بھی باقی ہیں ـــــ تم نے گذرے ہوئے جلوس پر نظر ڈالی تھی ـــــ وہاں کیا تھا، سوالوں کے سوا؟

پروفیسر: (کپکپاتی ہوئی آواز میں) چپ ہو جاؤ آفتاب، چپ ہو جاؤ ـــــ ہمیں سوچنے دو۔

آفتاب: (اٹھ کر بے تابانہ ٹہلنے لگتا ہے) ہمیں سوچنے دو، سوچنے دو! اپنی اسٹڈی کی گرم اور محفوظ دیواروں کے بیچ بیٹھے ہوئے، سوچتے رہو! ایوانوں میں، مخملیں بستروں پر، آرام دہ صوفوں پر بیٹھے ہوئے سوچتے رہو ـــــ (ٹہلتا ہوا اسٹیج کے بالکل سامنے کونے پر آ جاتا ہے اور سامعین کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتا ہے) تم سب، سوچتے رہو ـــــ کہ سوچنا بھی ایک عیاشی ہے ـــــ اس سے تمہارے نفس کو غذا ملتی ہے، تمہارے جھوٹے پندار کو سکون ملتا ہے، تمہاری انا لمبی ہوتی جاتی ہے ـــــ یہ سوچ سوچ کر تم سوچ رہے ہو ان انسانوں کے بارے میں جو تمہاری طرح کرسیوں میں ڈوبے ہوئے، آسودہ حال، شکم سیر اور مطمئن نہیں ہیں ـــــ جو سڑکوں پر مارے مارے پھر رہے ہیں، روزگار دفتروں کے چکر لگا رہے ہیں۔ جاڑے کی اس اذیت ناک رات کے ریگستان میں سوکھی ہوئی لکڑیاں ڈھونڈ رہے ہیں، سوچتے رہو اور یہ سوچ کر خوش ہوتے رہو کہ تم ان کے بارے میں سوچ رہے ہو۔ (اسٹیج کے سامنے بیٹھے ہوئے ہجوم کی جانب ہاتھ اٹھا کر) لیکن تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ٹھنڈی بے روح اور مجرد سوچ کھیتوں میں اناج نہیں اگا سکتی، کپڑے نہیں بن سکتی، چھتیں نہیں بنا سکتی تم کہو گے کہ اناج منڈیوں میں بھرا پڑا ہے۔ کپڑوں کے تھان ملوں میں گٹھ کے گٹھ لگے ہوئے ہیں، اور زمین اسکائی اسکریپرز کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہے ـــــ لیکن اس کا حاصل ـــــ وہ جلوس جو ابھی ان دریچوں سے گذرتا ہوا دکھائی دیا تھا ـــــ (یہ کہتے ہوئے پروفیسر اور رداور کی طرف مڑتا ہے) ان دریچوں سے (کھڑکیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے) یہ دریچے ذہن کے دریچے ہیں، جنھیں کھلا رکھ کر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری سوچ کا سلسلہ جاری ہے اور یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتے ہو کہ تم سوچ رہے ہو ـــــ (دانت کھینچ کر) سوچ کی دیواروں کے قیدی! تم سب تماش بین ہو۔ (اسٹیج کے سامنے کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے پھر پروفیسر کی طرف) زندگی کے ڈرامے کے خاموش تماشائی۔

(پس منظر سے لرزہ خیز موسیقی ـــــ پروفیسر اور داور نظر اٹھا کر آفتاب کی طرف دیکھتے ہوئے ـــــ جو بظاہر تھکا ہوا اور پریشان، پھر جاکر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔)

پروفیسر: (بھرائی ہوئی آواز میں) بیٹھو ننھے بچے، بیٹھو ـــــ اور دم لے لو ـــــ

(آفتاب اداس نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہے)

پروفیسر: دم لے لو! کہ تم تھک گئے ہو گے۔

آفتاب: میں صرف اس لیے دم لینا چاہتا ہوں کہ مجھے ابھی اور آگے جانا ہے ـــــ (دیواروں کی طرف ہاتھ اٹھا کر) ان دیواروں سے پرے۔ اس راستے پر جدھر ابھی کچھ دیر پہلے ایک جلوس گذرا تھا پروفیسر!

داور: (نرمی سے) تم مورخ ہو آفتاب ـــــ معاشرے کی اصلاح اور تعمیر کا خواب چھوڑ دو ـــــ زندگی کے مسائل اتنے سستے نہیں کہ صرف نعروں سے حل کر لیے جائیں۔

آفتاب: (غصے میں) پھر کیا کیا جائے ـــــ اسی طرح گھر کی دیواروں میں محفوظ بیٹھے رہیں اور کتابوں کی مومیائی ہوئی لاشوں سے مکالمہ ہوتا رہے۔

پروفیسر: (آہستہ سے) انقلاب فرانس کے بعد کی ایک شام کو ـــــ والٹیر اپنے دوستوں کے بیچ بیٹھا ہوا تھا ـــــ بات چل رہی تھی قزاقوں اور لٹیروں کی ـــــ اور تمھیں یاد ہے ؟ والٹیر نے کیا کہا تھا ـــــ ؟ صرف یہ کہ کسی زمانے میں فرانس میں ایک محل تھا!

آفتاب: یہ محل انقلاب کے بعد بھی قائم رہا ـــــ ورنہ جوزیفائین کے محل کی تعمیر کیوں کر مکمل ہوتی۔ کیوں ؟ اور محلوں کی تعمیر کا سلسلہ آج بھی جاری ہے ـــــ ماسکو، لندن، جنیوا، پیرس، واشنگٹن ـــــ واقعی فن تعمیر نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ پہلے انسان صرف غاروں میں رہتا تھا۔ غاروں سے اسکائی کریپرز کے موڑ تک غار ہی غار ہیں ـــــ نظریوں کے، قومی مقاصد کے، منصوبوں کے، خوابوں کے، کتب خانوں کے، اور باہر سڑک پر جلوس گذر رہا ہے۔

پروفیسر: (گمبھیر لہجے میں) تاریخ کا سفر آزادی کی جستجو کا سفر ہے آفتاب! یہ سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔

داور: اس سفر کا اگلا مرحلہ کیا ہو گا ؟

آفتاب: یہ مارکس کی جدلیاتی مادیت سے پوچھو ــــــ

پروفیسر: تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ تاریخ کے صفحات پر ہم جن آویزشوں کا افسانہ پڑھتے ہیں وہ صرف طبقاتی نہیں تھیں ــــــ قومی اور نسلی بھی تھیں۔

آفتاب: طبقے اور نسلیں اور قومیں صرف دو ہوتی ہیں پروفیسر، کرۂ ارض پر صرف انھیں کے مابین کشمکش جاری ہے ــــــ ایک وہ جن کے پاس سب کچھ ہے، دوسرا وہ جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے ــــــ اس لیے کہ سب کچھ دوسرے کے پاس ہے ــــــ یہ کشمکش صرف مادی ہے۔ انسان اب تک جن توہمات، تعصبات اور مفروضات میں گرفتار رہا ہے، اور آج بھی جن زنجیروں کا قیدی ہے، ان کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے نسلِ انسانی کی مادی تاریخ پر نظر ڈال لینا کافی ہوگا۔

(پس منظر سے پھر جلوس کا شور سنائی دیتا ہے۔ پروفیسر اور داور کیلنڈر کی طرف دیکھتے ہیں۔)

آفتاب: اس سے پہلے کہ یہ کیلنڈر بھی تاریخ بن جائے اپنے دارالمطالعے سے باہر نکلو پروفیسر!

پروفیسر: (شکست خوردہ لہجے میں) تاریخ کا تعین ان اسباب کی بنا پر ہوتا ہے جو عام حالات میں افراد کے قابو سے باہر ہوتے ہیں ننھے بچے ــــــ ہم کچھ نہیں کر سکتے، کچھ نہیں ــــــ بجز اس کے کہ اس دائرے میں محصور پریشان اور افسردہ ہوتے رہیں ــــــ

(اسٹیج پر روشنیاں گردش کرنے لگتی ہیں۔ دھندلی روشنی۔ موسیقی کی ایک لہر کے ساتھ بوڑھے کا قہقہہ سنائی دیتا ہے ــــــ گڑگڑاہٹ۔ اس اثنا میں اسٹیج نیم تاریک ہو جاتا ہے منظر غائب ہو جاتا ہے اور اسکرین سامنے آتے ہی اس پر بوڑھے کی لمحہ بہ لمحہ شبیہ ابھرتی ہے ــــــ چھڑی کی مسلسل ٹھک ٹھک کے ساتھ بوڑھا ہاتھ میں لالٹین لیے ہوئے اسٹیج پر آتا ہے۔ اسٹیج نیم روشن ہوتا ہے۔ پرچھائیں غائب ہو جاتی ہے۔ چار انسانی پیکر، سفید چادروں میں ڈھکے ہوئے، اسٹیج کے دوسرے کونے پر لکڑی کے تختوں کے پیچھے سے اٹھتے ہیں۔ ایک طرف کچھ جھاڑیاں ــــــ ہلکی ہلکی سبز روشنی میں ان پیکروں پر پرچھائیوں کا گمان ہوتا ہے ــــــ بوڑھا حیرت سے ان کی طرف دیکھتا ہے ــــــ کانپنے لگتا ہے۔ اچانک اس کی چھڑی گر پڑتی ہے۔

پس منظر سے ہوا کا ایک تیز و تند جھونکا ــــ)

بوڑھا: (کرخت آواز میں) تم؟ تم لوگ کون ہو؟ تم اپنی قبروں سے نکل کر یہاں کیسے آ گئے؟ تمھیں تو میں نے دفن کر دیا تھا ــــ

(چاروں پیکر دیوانہ وار ہنستے ہیں)

بوڑھا: تم مجھے اس طرح خوفزدہ نہیں کر سکتے ــــ بولو؟ میری بات کا جواب دو ــــ تم یہاں کیوں آئے؟ کس نے تمھیں بلایا تھا؟

(پس منظر سے پیروں کی مسلسل چاپ، پروفیسر، آفتاب اور داور بائیں دروازے سے اندر آتے ہیں۔ چاروں پیکر ساکت دکھائی دیتے ہیں۔ دھیمی سبز روشنی نے فضا کو پراسرار بنا دیا ہے۔ بوڑھا چونک کر ان تینوں کی طرف دیکھتا ہے ــــ پروفیسر بھاری لیکن مضمحل قدموں سے چلتا ہوا لکڑی کے ایک تختے پر بیٹھ جاتا ہے۔ آفتاب اور داور اس کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں، تختوں پر ــــ بوڑھا کمان کی طرح سیدھا کھڑا رہتا ہے اور گہری نظروں سے پروفیسر کی طرف دیکھتا ہے۔)

بوڑھا: (پروفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے) تم سب اتنے چپ کیوں ہو؟ ــــ (سفید پوش پیکروں کی دیکھ کر) ان کی خاموشی کا سبب صرف تمھاری خاموشی ہے ــــ

آفتاب: (بھاری آواز میں) نہیں! تم غلط کہتے ہو۔ یہ ہماری وجہ سے خاموش نہیں۔ ہم ان کی وجہ سے خاموش ہیں۔ یہ ہمارا ماضی ہیں۔ ماضی جو مر چکا ہے اور وقت کی دیوار پر بے جان فریموں کی طرح لٹک رہا ہے۔ ایسے فریم جن کی تصویروں کے خدوخال دھندلے ہو چکے ہیں، رنگ اڑ چکا ہے۔

(چاروں پیکروں کا ایک قہقہہ گونجتا ہے۔)

(پروفیسر اور داور گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔)

بوڑھا: تم مجھے جانتے ہو ــــ؟ (آفتاب کی طرف دیکھتا ہے)

آفتاب: (سرکشی کے انداز میں) نہیں!

بوڑھا: (گمبھیر آواز میں) تو جان لو! میرے ماتھے کی سلوٹوں کو غور سے دیکھو ــــ ان میں بیتی

ہوئی تمام فصلوں کا سراغ تمھیں مل جائے گا۔ اور میری آنکھوں میں جھانکو ——— وہاں تمھیں اپنا عکس دکھائی دے گا۔ تم کہ میرا حال ہو، اور یہ بے رنگ و نام پرچھائیاں (پیکروں کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے) یہ میرا ماضی ہیں۔ میں وہ نقطہ ہوں جس پر ماضی اور حال دونوں کے سرے مل گئے ہیں ——— مجھے غور سے دیکھو، ڈرو نہیں، میں وقت ہوں!

(پروفیسر اور داور گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔)

(دفعتاً سبز دھندلی روشنی غائب ہو جاتی ہے اور پردے پر کئی رنگوں کی روشنیاں گردش کرنے لگتی ہیں ——)

پروفیسر: (گھبرا کر) میرا سر چکرا رہا ہے ——— ماضی اور حال، یہ کیسا دائرہ ہے؟ اور مستقبل؟

آفتاب: (بوڑھے کی طرف گستاخانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے) اس دائرے کو توڑے بغیر مستقبل کی راہ نہیں ملے گی پروفیسر، چلو، یہاں سے چلیں ———

(سفید پوش پیکروں کی دیوانہ وار ہنسی۔ روشنی کی گردش پھر تیز ہو جاتی ہے۔ بوڑھا غور سے آفتاب کی طرف دیکھتا ہے۔)

آفتاب: (کھڑے ہو کر غصیلے لہجے میں) مجھ پر اس دائرے کی گردش کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس لیے کہ میں زندگی کے راستے سے آگاہ ہوں۔

(گردش کرتی ہوئی روشنیاں رک جاتی ہیں اور اسٹیج سرخ روشنی میں نہا جاتا ہے۔)

کیا ہوئی وہ آواز جو کہتی تھی کہ تاریخ نام ہے ۲۱ تہذیبوں کا جو اپنا سفر تمام کر چکیں اور اب اس دائرے میں ایک نئی تہذیب کی گیند گھوم رہی ہے۔

پہلا سفید پوش پیکر: یہ گیند بھی اب کھردری ہو چکی ہے۔ زوال مغرب کی ساعت اب زیادہ دور نہیں! مشرقی افق سے ایک نیا سورج طلوع ہوگا

(اسٹیج کی روشنی اچانک دھندلی ہو جاتی ہے، پھر غائب۔ سب کے سب اسکرین کی طرف دیکھتے ہیں جس پر گہرا نیلا رنگ پھیلا ہوا ہے اور ایک گوشے سے روشنی نمودار ہوتی ہے۔)

آفتاب: (جھنجھلا کر) بکو مت! تم سب زوال کے نقیب ہو۔ نئے سورج کی روشنی تم تک کبھی نہ پہنچے گی۔

پروفیسر: (لٹکتے ہوئے آفتاب کی طرف بڑھتا ہے اور اس کے کندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے جذباتی لہجے میں) ننھے بچے! ہوش میں آؤ!

(آفتاب غصیلی نظروں سے چاروں طرف دیکھتا ہے۔ سارے سفید پوش پیکر دیوانہ وار ہنستے ہیں۔ اسکرین پر رنگ برنگی روشنیوں کی گردش۔)

پیکروں کا قہقہہ طویل ہوتا جاتا ہے ——

داور: (گھبراکر) پروفیسر!

پروفیسر: (پریشان لہجے میں) آفتاب! آ ف ب! ننھے بچے، دیکھو! میں تمھارے لیے کتنا دکھی ہوں، کتنا اداس اور پریشان! ہوش میں آؤ! بیٹے!

(پیکروں کی ہنسی)

پروفیسر: (چیخ کر) بند کرو یہ مجنونانہ قہقہے! اور بڑ ... اپنی اپنی قبروں میں چپ چاپ سو جاؤ۔ میں نے تم پر بھروسہ کر کے غلطی کی ——

(چاروں پیکر یک بیک پتھروں کی طرح ساکت ہو جاتے ہیں۔ اسٹیج پر پھر سبز روشنی پھیل جاتی ہے۔)

پروفیسر: (پہلے پیکر کی جانب ہاتھ اٹھاکر) وہ سوال جن کے بوجھ سے اس کی روح نڈھال ہے، ان کا جواب کیا صرف قہقہے ہیں؟ بولو! جواب دو!

بوڑھا: (گہری آواز میں) میرے ماتھے کی سلوٹیں ان سوالوں کا افسانہ ہیں! مجھے پڑھو! پڑھو!

پروفیسر: کیا پڑھوں؟

بوڑھا: پڑھو!

پروفیسر: (کانپتی ہوئی آواز میں) کیا پڑھوں؟

بوڑھا: اونہہ! تم صرف کی روشنائی سے چھپے ہوئے لفظوں کی زبان سمجھتے ہو! ہواؤں کی پیشانی پر ابھرے ہوئے سوال تمھیں دکھائی نہیں دیتے —— میں تمھیں چھوڑ کر آگے چلا جاؤں گا۔ (جانے لگتا ہے)

پروفیسر: رک جاؤ، رک جاؤ (دیوانہ وار) رک جاؤ، رک جاؤ۔

(بوڑھا رک جاتا ہے)

بوڑھا: (بھاری طنزیہ لہجے میں) تم بہتے ہوئے پانی کو، ہوا کے آوارہ جھونکے کو مٹھی میں بند کر لینا

چاہتے ہو۔ تمھیں منزل کی تلاش ہے اور سفر کے عذاب میں مبتلا ہو۔ پڑھو! مجھے جلدی پڑھو!

(پروفیسر آفتاب کی طرف دیکھتا ہے جو غصیلی نظریں سفید پوش پیکروں پر جمائے ہوئے ہے)

پروفیسر: (نرم لہجے میں) میں صرف اس کے حوالے سے تمھیں پڑھ سکتا ہوں۔ (سایوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر) بتاؤ! اس کی روح کا بار کب ہلکا ہو گا؟ (آفتاب کی طرف دیکھ کر) مجھے ڈر ہے یہ بکھر نہ جائے۔

دوسرا پیکر: فطرت نے انسان کو کچھ توانائیاں بخشی تھیں۔ یہ تمھاری تاریخ انھیں قوتوں کا اظہار ہے۔ ان قوتوں کو پھر سے جمع کرنے کی کوشش کرو!

آفتاب: (چڑ کر) فطرت، فطرت، فطرت، یہ کیا بکواس ہے۔

دوسرا پیکر: (ڈرے ہوئے لہجے میں) خدا سے ڈرو! اور اس کے ارادوں کا سرا ڈھونڈھنے کی کوشش کرو۔ تمھاری تاریخ اسی کے الوہی نغمے میں بھرا ہوا رنگ ہے ———

آفتاب: (غصے میں) مجھے زمین پر رہنے دو اور تم زمین کے اندر جاؤ، میں تمھیں کب کا دفنا کر چکا۔

تیسرا پیکر: (اف) یہ ساری کشمکش، یہ ساری الجھن اس لیے ہے کہ تم اپنی انفرادیت کا اظہار کرنا چاہتے ہو۔ تاریخ کے گرداب میں فرد کی حقیقت ایک تنکے سے زیادہ نہیں ——— تم بہہ جاؤ گے ننھے لڑکے!

پہلا پیکر: ہر عہد میں انسانوں کے رویے بدلتے رہتے ہیں، اور ان کے طریقے بھی، یہ تبدیلیوں کا تسلسل ہے۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتے ———

آفتاب: (اسی طرح غصے میں) میں تسلسل کے اس دائرے سے نکلنا چاہتا ہوں۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ جاؤ! (چیخ پڑتا ہے)

(پروفیسر بڑھ کر اپنے بازوؤں میں لے لیتا ہے۔)

پروفیسر: ہوش میں آؤ بیٹے! ہوش میں آؤ! میں نے تمھیں یہاں لا کر غلطی کی ———

بوڑھا: (بھاری آواز میں) تاریخ شاید غلط کاریوں ہی کی روداد ہے۔ ورنہ میرے تلوے اتنے گھائل نہ ہوتے۔ دیکھو! ان سے خون رس رہا ہے۔ (اپنا دایاں پیر دکھاتا ہے)

(اسٹیج پر سرخ روشنی)

چوتھا پیکر: (تیز نوکیلی آواز میں) ارتقا کے مرحلے پر انسان کے آزاد ارادے کا سوال سامنے آیا ہے۔ یہ باغی اور سرکش اور اپنے آپ سے الجھتا ہوا نوجوان اس سوال کا اشاریہ ہے۔ کیوں؟ (آفتاب کی

(ان ہاتھ اٹھاتا ہے)۔

آفتاب: (خودکلامی کے انداز میں، بدستور پروفیسر کے بازوؤں میں) شاید، شاید، تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن یہ ارادہ بے حقیقت ہے جب تک کہ اسے عمل میں نہ ڈھالا جائے۔ تاریخ اسی طرح بنتی ہے۔

بوڑھا: (اپنے بازو جھنڈیوں کی طرف اٹھاتے ہوئے) دیکھو! میری آستینیں خالی ہیں، آنکھیں خالی ہیں، سینہ خالی ہے۔ اور اس کراں تا کراں پھیلے ہوئے ریگ زار میں صرف وحشی ہواؤں کا شور ہے۔ مرجھائے ہوئے اپنی شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ وحشت ناک آندھیاں اور سروں پر چھائے ہوئے بگولے ——— کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں ——— دیکھو! میرے تلوؤں سے خون رس رہا ہے ———

(چپ ہو کر خلا کی جانب دیکھنے لگتا ہے)

چوتھا پیکر: کچھ بھی اپنے آپ نہیں ہو جاتا۔ کچھ ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانا ضروری ہے۔ جب کبھی انقلاب آئے ہیں، تو اس لیے کہ انھیں لانے والے پیدا ہو چکے تھے۔ فتوحات اس وقت ممکن ہوتی ہیں جب فاتح پیدا ہو جائیں۔

پہلا پیکر: یہ سب الوہی ارادے کا، خفیہ منصوبے کا کرشمہ ہے میرے دوست!

(بوڑھا کا نپنے لگتا ہے۔ پس منظر سے رزمیہ موسیقی کی لہریں۔ بوڑھے کی مجنونانہ ہنسی)

آفتاب: اُف! تمھاری ہنسی ماتم کے شور سے زیادہ دردناک ہے۔ چپ ہو جاؤ۔ چپ ہو جاؤ۔

(بوڑھا ہنستا ہے)

آفتاب: (پروفیسر کے بازوؤں سے نکل کر) میں کہتا ہوں چپ ہو جاؤ!

بوڑھا: مجھے کب تک چلتے رہنا ہے، کدھر جانا ہے ——— کون سی ایسی راہ ہے جس پر کانٹے نہ ہوں۔ دیکھو! میرا رنگ زرد ہوتا جاتا ہے اور لہو کا آخری قطرہ بھی روح کی بھٹی میں جل کر خشک ہو چکا۔ مجھے کدھر جانا ہے ——— ؟ بتاؤ!

چوتھا پیکر: تمھارے اگلے سفر کا تعین وہ منزل کرے گی جس پر تم اس وقت موجود ہو۔ ہر حقیقت اپنا ایک مادی جواز رکھتی ہے۔

پہلا پیکر: (طنزیہ) کیا کہنے ہیں ——— اس طرح تمھارا مسئلہ چٹکیوں میں حل کیا جا سکتا ہے۔ تمھاری

جواں سال تہذیب اس لیے وجود میں آئی کہ جدید سائنس اور ٹکنالوجی کا جنم ہو چکا تھا۔ جدید سائنس کا جنم اس لیے ہوا کہ گیلیلیو کے قدم اس دھرتی تک پہنچ گئے تھے۔ گیلیلیو کا وجود کوپرنکس کا مرہون منت تھا۔ کوپرنکس نشاۃ ثانیہ کے سبب وجود میں آیا۔ نشاۃ ثانیہ کی بنیادیں قسطنطنیہ کے زوال نے فراہم کیں۔ قسطنطنیہ کا زوال نتیجہ تھا ترکوں کی نقل مکانی کا۔ ترکوں کے نقل مکانی کے سبب وسط ایشیا کی تقسیم تھی اور وسط ایشیا ـــــ

(بوڑھے کا گونجیلا قہقہہ۔ چوتھا پیکر اپنی بات کہتے کہتے رک جاتا ہے)

آفتاب: اسے کہنے دو اپنی بات، کہنے دو!

(بوڑھا ہنستا رہتا ہے)

آفتاب: سفرتو وہ کیا کہہ رہا ہے ـــــ

(بوڑھا حیرت سے آفتاب کی طرف دیکھتا ہے)

بوڑھا: (درد سے کراہ کر) تو تم بھی اسی گھسے پٹے دائرے کا زندانی ہونا چاہتے ہو جو حروف اور الفاظ اور جملوں کی صورت کتابوں کے مدفن میں گردش کر رہا ہے ـــــ

(اسٹیج پر روشنیوں کی نہایت تیز گردش، پس منظر سے موسیقی۔)

آفتاب: (آگے بڑھ کر، آؤ! درا مینے لگتا ہے) تم ٹھیک کہتے ہو۔ چلو! ہم اس دائرے سے نکل چلیں ـــــ (بوڑھا اپنی چھڑی اٹھانے لگتا ہے)

آفتاب: (بوڑھے کے ہاتھ سے چھڑی چھین لیتا ہے اور اسے ایک طرف اچھال دیتا ہے) آؤ! اب اس کی ضرورت نہیں۔ میرے ساتھ آؤ ـــــ میں نے زندگی کا وہ راستہ دیکھ لیا ہے جس پر تہذیبیں آگے بڑھتی ہیں۔ آؤ چلیں! آگے چلیں!

(دفعتاً پس منظر سے جلوس کا دھیما دھیما شور سنائی دیتا ہے۔ نعرے جن کے الفاظ صاف نہیں۔ آگے آگے آفتاب، اس کے پیچھے بوڑھا اسٹیج سے باہر نکل جاتے ہیں۔ سفید پوش پیکر پتھروں کی طرح ساکت دکھائی دیتے ہیں۔ پروفیسر اور ماہ وش راستے پر خاموش نظریں جمائے کھڑے ہیں جدھر سے آفتاب اور بوڑھا باہر گئے ہیں ـــــ)

(اختتامیہ موسیقی)

انتظاریہ

پروفیسر آل احمد سرور

○

لو اندھیروں نے بھی انداز اجالوں کے لیے
کیسی افتاد پڑی دیکھنے والوں کے لیے
تازہ کاری نے وہاں کر دیے عالم ایجاد
ہم ترستے ہی رہے تازہ خیالوں کے لیے
شاہراہوں سے گذرتے ہیں شب و روز ہجوم
نئی راہیں ہیں فقط ہم سے جیالوں کے لئے
کام ماضی کی یہ سادہ نگھی کیا کرتی
عصر حاضر ترے پیچیدہ سوالوں کے لیے
کتنی شمعیں بجھیں نادیدہ کرن کی خاطر
کتنے سورج لٹے موہوم اجالوں کے لیے
کتنے سنگین حقائق سے نچوڑا ہے لہو
چند خوابوں کے لیے چند خیالوں کے لیے
گو نگہ داریِ آدابِ جنوں مشکل ہے
پھر بھی آساں ہے ترے چاہنے والوں کے لیے

○

دلدادگانِ لذتِ ایجاد کیا کریں
سیلاب اشک و آہ پہ بنیاد کیا کریں
کرتا ہے جن کو تازہ نہالوں کی دیکھ بھال
بیتی ہوئی بہار کو وہ یاد کیا کریں
ہاں جان کر امید کی مدھم رکھی ہے لو
اب اور پاس خاطر ناشاد کیا کریں
سنگیں حقیقتوں سے کہاں تک ملول ہوں
رعنائی خیال کو برباد کیا کریں
رندوں کی آرزو کا تلاطم کہاں سے لائیں
آسودگانِ مسندِ ارشاد کیا کریں
کس کو نہیں سکون کی خواہش جہاں میں
افتادگانِ رہگذر باد کیا کریں
جو ہر نظر میں تازہ کریں سیکڑے ہزار
سچ ہے سرورِ رفتہ کو وہ یاد کیا کریں

○

خوابوں سے یوں تو روز بہلتے رہے ہیں ہم
کتنی حقیقتوں کو بدلتے رہے ہیں ہم
اپنے غبار میں بھی ہے وہ ذوقِ سرکشی
پامال ہو کے عرش پہ چلتے رہے ہیں ہم
ہر دشت و در میں پھول کھلانے کے واسطے
اکثر تو نوکِ خار پہ چلتے رہے ہیں ہم
آئینِ پاسِ داریٔ صحرا نہ چھٹ سکا
وضعِ جنون اگرچہ بدلتے رہے ہیں ہم
کوئی خلیل جس کو نہ گلزار کر سکا
تیرے لیے اس آگ پہ چلتے رہے ہیں ہم
کیا جانے کب وہ صبحِ بہاراں ہو جلوہ گر
دورِ خزاں میں جس کو بدلتے رہے ہیں ہم
تخئیلِ لالہ کار یہ کہتی ہے اے سرور
کوئی زمیں ہو پھولتے پھلتے رہے ہیں ہم

○

زنجیرِ جنوں کی خلش کم نہ ہو سکی
بھڑکی اگر یہ آگ تو مدھم نہ ہو سکی

کیا کیا غبار اٹھائے نظر کے فساد نے
انسانیت کی لو کبھی مدھم نہ ہو سکی

ہم لاکھ بد مزہ ہوئے جامِ حیات سے
جینے کی پیاس تھی کہ کبھی کم نہ ہو سکی

مجھ سے نہ پوچھ اپنی ہی تیغِ ادا سے پوچھ
کیوں تیری چشمِ لطف کبھی برہم نہ ہو سکی

کتنے رموزِ شوق ان آنکھوں میں رہ گئے
جن سے نگاہِ دوست بھی محرم نہ ہو سکی

اللہ رے اشتیاقِ نگاہِ امید کہ
کھوئے ہوؤں کی یاد میں پُرنم نہ ہو سکی

گل کاریِ نظر ہوئے رنگِ جمالِ دوست
کچھ بات تھی کہ زیست جہنم نہ ہو سکی

اپنے ہی گھر کی خیر منائی تمام عمر
ہم سے سرورِ فکرِ دو عالم نہ ہو سکی

○

یہ دور مجھ سے تردد کا دفا مانگے ہے
دل اب بھی شوق کے لیل و نہار مانگے ہے

جہاں میں کس کو گوارہ ہوئی ہے فکر کی دھوپ
ہر اک کوئی شجرِ سایہ دار مانگے ہے

زبانِ لالہ و گل پیرا بسی ہوئی ہے، مگر
زمانہ لفظ میں غنچہ سر کی دھار مانگے ہے

اکیلے پن کا یہ احساس، ہم نفس کی تلاش
بجھی ہوئی جو یہ تلخی ہے، پیار مانگے ہے

یہ آدمی مرے خوابوں کا ساتھ کیا دیتا
حقیقتوں سے جو اکثر فرار مانگے ہے

اب ان میں اپنا لہو ہو کہ کوئی شوخ کرن
ورق جو سادہ ہے نقش و نگار مانگے ہے

ہوا کہاں ابھی صدیوں کے جبر سے آزاد
خدائی پر جو بشر اختیار مانگے ہے

بھکاریوں کو یہاں بھیک کون دیتا ہے
ہے سادہ لوح جو دنیا سے پیار مانگے ہے

پروفیسر خورشید الاسلام

بزرگ

جنھیں بزرگ سمجھتے ہیں باپ جانتے ہیں
وہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کی شان میں اکثر
کوئی قصیدہ پڑھیں یا کوئی غزل گائیں
تمھیں بتاؤ خدا کے لیے کہ اس دکھ کو
کہیں تو کس سے کہیں جائیں تو کہاں جائیں

نوجوان

دل داغ ہے اس غم سے کہ دلبر نہیں ملتا
گردن بھی جھکاتے ہیں تو خنجر نہیں ملتا
خوابوں سے الجھتے ہیں حقیقت نہیں ملتی
طوفان سے لڑتے ہیں سمندر نہیں ملتا

خلش

دل میں جو غم رہ گیا آواز سے خالی ہوا
دل سے جو آواز نکلی اک نیا غم بن گئی
ہم نے جو عالم کیا پیدا، ادا سے کر دیا
اس ادا کا نام کیا ہوگا جو عالم بن گئی

غزل

جتنے نغمے تھے وہ خلش بن گئے جتنے نالے تھے صرف ہوا ہو گئے
ہم وہی ہیں جو کل تھے مگر کیا ہوا ہم وہی ہیں مگر کیا سے کیا ہو گئے
جن کے دامن تہی اور خالی تھے دل جن کی جرأت تھی کم اور جاں مضمحل
آستانوں پہ وہ سجدے کرتے رہے رفتہ رفتہ ہمارے خدا ہو گئے
اس زمانے کے جو میر و سلطان تھے نوعِ آدم میں یعنی جو انسان تھے
دل سے پائی انہوں نے وہ نشو و نما تیرے کوچے کے آخر گدا ہو گئے
شور سینوں میں اٹھ اٹھ کے دبتے رہے دل جگر دور گردوں میں کھپتے رہے
ہاتھ کتنے تھے جو یاں قلم ہو گئے ساز کیا کیا تھے جو بے صدا ہو گئے
یار دنیا کے سانچے میں ڈھلتے رہے شمعِ فانوس تھے ہم پگھلتے رہے
اپنی تنہا روی، اپنا سوز دروں ہم بھی دنیا میں اک ماجرا ہو گئے
اب نہ خطرہ ہے دل میں نہ کوئی خلش ایک باقی رہا ہے تو رنگِ تپش
دل شگفتہ اور سادہ ہے اس طرح سے قرض جتنے تھے گویا ادا ہو گئے
غم سنورتے رہے ہم سنبھلتے رہے شوقِ منزل کے شیوے بدلتے رہے
تھے جو نزدیک ہم سے وہ اب دور ہیں تھے جو نا آشنا آشنا ہو گئے

○

غزل بھی فن ہے کسی جاں نواز قاتل کا
کہ جب بھی سنیئے کلیجا نکل پڑے دل کا

جو لامکاں بھی در آئے تو پالے نشاں نہ ملے
مکاں کا گھیر نہیں ہے یہ گھیر ہے دل کا

تمام عمر عجب پیچ و تاب میں گذری
کہ نشہ سیل کا تھا اور خمار ساحل کا

نہ جوئے شیر نکالی نہ عرش پر پہنچے
ہمیں بھی غم ہے بہت زندگی کے حاصل کا

کمال بے خبری ہے کہ لطف جاں کے لیے
ہم اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں ہاتھ قاتل کا

یہ تر دماغ بھلا آسماں کو کیا دیکھیں
کہ یاں تو لوح و قلم ہیں خیال کا چھلکا

میری غزل میں دھڑکتا ہے کائنات کا دل
وہ اور ہوں گے جو کہتے ہیں مرثیہ دل کا

کوئی ایسی بھی ساعت ہو کوئی ایسی بھی شب آئے
کہ میری حسرتیں سو جائیں، تیرا بانکپن جاگے

چلے ساغر، ملیں دامن، ملے سینہ، جھکیں نظریں
ستارے جگمگا اٹھیں، زمیں سوئے گگن جاگے

خمارِ آرزو اس رنگ اس انداز سے ٹوٹے
کہ تم شانے پہ سر رکھو تو بستر کی شکن جاگے

کتابِ جسم نرمی سے، ورق اندر ورق دیکھیں
حجابِ شوق گرمی سے، شکن اندر شکن جاگے

بدن تھک جائیں، شل ہو جائیں، آنکھیں بند ہو جائیں
گلے سے لگ کے یوں سوئیں، چمن اندر چمن جاگے

عجب عالم دکھایا ہے، تری کافر ادائی نے
جو آہوانِ خطا بھڑکے، غزالانِ ختن جاگے

یہی فیضانِ گرمی ہے، یہی کارِ چمن بندی
کہ جب غنچہ کا دل ٹوٹے تو گل کا پیرہن جاگے

یہ وہ شے جو ہم پیتے ہیں، جم پیتا تھا، زمزم کیا
جسے پینے سے اے واعظ نہ تن جاگے نہ من جاگے

○

یہ مانا نت نئے فتنے، عجب رنج و محن جاگے
مگر یہ بھی تو دیکھو، چار سو کیا کیا چمن جاگے

بجھے بیٹھے رہیں کب تک، بس اب شیشے کو چھلکاؤ
لہو چھلکے، نفس مہکے، خرد ناچے، بدن جاگے

خمارِ بے دلی حد سے فزوں ہے اور دل تنہا
کوئی ایسی غزل چھیڑو کہ ہر داغِ کہن جاگے

کھلو گیسوئے مشکیں سے کہ بادل جھوم کر اٹھیں
ذرا بندِ قبا کھولو کہ گل کی انجمن جاگے

ڈاکٹر نجیب الرحمٰن

باز دید

تم جو آؤ تو دھندلکے میں لپٹ کر آؤ
پھر وہی کیف سر شام لیے
جب لرزتے ہیں صداؤں کے سمٹتے سائے
اور آنکھیں خلش حسرت ناکام لیے
ہر گزرتے ہوئے لمحے کو تکا کرتی ہیں
خود فریبی سے ہم آغوش رہا کرتی ہیں

تم جو آؤ تو اندھیرے میں لپٹ کر آؤ
مستئ بادۂ گلفام لیے
شبنمی شیشوں کو سہلائیں لچکتی شاخیں
اور مہتاب زمستاں کوئی پیغام لیے
یوں چلا آئے کہ در باز ہو
کوئی آواز ہو

تم جو آؤ تو اجالے میں لپٹ کر آؤ
پھر وہی لذت انجام لیے
جب تمنائیں کسی خوف سے چیخ اٹھتی ہیں
اور خاموشی لب سیکڑوں ابہام لیے
دیکھ سنگین حقیقت میں بدل جاتی ہے
زندگی درد میں ڈھل جاتی ہے

آنکھیں

تیری دنبالہ دار آنکھوں میں
میں نے دیکھیں وہ پرسکون شامیں
جو مسافر کی مونس غم ہیں
دھوپ سے تمتمائے صحرا میں

تیری دنبالہ دار آنکھوں سے
مجھ کو ہوتا ہے یہ گماں اکثر
جیسے جلتے ہوئے دھندلکے میں
دب گیا ہو غبار راہ گزر
کارواں کھو گئے ہوں ظلمت میں
ایک شعلہ کہیں چمکتا ہو
دامن کی بے پناہ وسعت میں
اور یہ خواب ہائے نیم شبی
خوگر سوز و ساز تشنہ لبی
اٹھ کے گرداب وار ہوں پیہم
اس تجلی کے گرد رقص کناں
کف زناں نغمہ ریز زمزمہ خواں
صورت صوفیائے ملک مجسم
اور پھر تھک تھکا کے سو جائیں
اپنے شب زندہ دار خیموں میں
تیری دنبالہ دار آنکھوں میں

مکافات

آؤ کہ میکدے میں گزاریں تمام رات
تنہائیوں میں صحبت جام و سبو رہے
خاموشیوں میں کیفیت گفتگو رہے
یادوں کے پیچ و خم کو سنواریں تمام رات
زہر حیات دل میں اتاریں تمام رات

یہ در جو بند ہو تو کہیں اور اٹھ چلیں
ظلمت بڑھے تو آتش غم تیز تر کریں
پروانہ وار جل کے بنیں خاک رہ نشیں
انبوہ گرد باد میں رقص شرر کریں
افتادگی میں آرزوئے بال و پر کریں

لے جائیں کس کے پاس یہ داغ خود آگہی
اے سوز ہجر کوئی ترا راز داں نہیں
یہ شہر ناشناس، یہ ویرانی ہجوم
اس قافلے میں اہل نظر کا نشاں نہیں
سب اجنبی ہیں کوئی یہاں ہم زباں نہیں

بیٹھیں شفق کے سائے میں خون جگر پئیں
آؤ کہ رسم اہل خرابات ہے یہی
ہر عشق سخت جاں کی مکافات ہے یہی

اظہار

اب ترے جسم سے اٹھتی ہوئی خوشبو کی لپیٹ
مرے احساس پہ آویزاں ہوئی جاتی ہے
گرم ہے کمرے کی خاموش فضا
تیرے عارض پہ پسینے کی نمی
ذہن میں لاتی ہے برسات کی پہلی راتیں
نیم سگرٹ ترے پوروں میں دبی
سرخیٔ لب نے نشاں چھوڑ دیا ہے جس پر
کہہ رہی ہے کہ حقیقت ہے فقط دود رواں
تو بھی خاموش ہے میں بھی خاموش
اور ہم دونوں یہی سوچ رہے ہیں دل میں
کاش منت کش اظہار نہ ہونا پڑتا

ڈاکٹر بشیر بدر

(۱)

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا
وہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ کہا ہوا نہ سنا ہوا

کئی میل ریت کو کاٹ کر کوئی موج پھول کھلا گئی
کوئی پیڑ پیاس سے مر رہا ہے ندی کے پاس کھڑا ہوا

جسے لے گئی ہے ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا

مجھے حادثوں نے سجا سجا کے بہت حسین بنا دیا
مرا دل بھی جیسے دلہن کا ہاتھ ہو مہندیوں سے رچا ہوا

وہی شہر ہے، وہی راستے وہی گھر ہے اور وہی لان ہے
مگر اس دریچے سے پوچھنا وہ درخت انار کا کیا ہوا

میرے ساتھ جگنو ہے ہم سفر مگر اس شرر کی بساط کیا
یہ چراغ کوئی چراغ ہے نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا

(۲)

فن اگر روح و دل کی ریاضت نہو
ایسی مسجد ہے جس میں عبادت نہو

تیری آنکھوں میں ایسا سنور جاؤں میں
عمر بھر آئینہ کی ضرورت نہ ہو

کس کو نیلام کرتے ہو بازار میں
یہ کسی گھر کے مندر کی مورت نہ ہو

دن تو نکلا خریدا ہوا آدمی
اے خدا رات بھی سب کی عورت نہو

بے ادب کر رہی ہیں یہ انگڑائیاں
دھوپ ہو دھوپ میں اتنی شدت نہو

چہروں پر دیئے رکھ گئی ہے ہوا
تاکہ پھر روشنی کی ضرورت نہو

---

(۳)

سر سے چادر بدن سے قبا لے گئی
زندگی ہم فقیروں سے کیا لے گئی

میری شہرت سیاست سے محفوظ ہے
یہ طوائف بھی عصمت بچا لے گئی

میں سمندر کے سینے میں چٹان تھا
رات اک موج آکر بہا لے گئی

میری مٹھی میں سوکھے ہوئے پھول ہیں
خوشبوؤں کو اڑا کر ہوا لے گئی

ہم تو کاغذ تھے اشکوں سے بھیگے ہوئے
کیوں چراغوں کی لو تک ہوا لے گئی

کچھ پرندے تھے شاخوں کی باہوں میں گم
موت آکر گھروں سے بلا لے گئی

چاند نے رات مجھ کو جگا کر کہا
ایک لڑکی تمہارا پتہ لے گئی

---

(۴)

اپنی کھوئی ہوئی جنتیں پا گئے، زیست کے راستے بھولتے بھولتے
موت کی وادیوں میں کہیں کھو گئے، تیری آواز کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے

مست و سرشار تھے کوئی ٹھوکر لگی آسماں سے زمیں پر یوں ہم آ گئے
شاخ سے پھول جیسے کوئی گر پڑے رقصِ آواز پر جھومتے جھومتے

کوئی پتھر نہیں ہوں کہ جس شکل میں مجھ کو چاہو بنایا بگاڑا کرو
بھول جانے کی کوشش تو کی تھی مگر یاد تم آ گئے بھولتے بھولتے

آنکھیں آنسو بھری، پلکیں بوجھل گھنی، جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہئے انھیں کچھ ہنسی آ گئی، بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

اب وہ گیسو نہیں ہیں جو سایہ کریں اب وہ شانے نہیں جو سہارا بنیں
موت کے بازوؤ تم ہی آگے بڑھو تھک گئے آج ہم گھومتے گھومتے

دل میں جو تیر ہیں اپنے ہی تیر ہیں، اپنی زنجیر سے پا بہ زنجیر ہیں
سنگریزوں کو ہم نے خدا کر دیا آخرش رات دن پوجتے پوجتے

(۵)

نظر سے گفتگو خاموش لب تمہاری طرح
غزل نے سیکھے ہیں انداز سب تمہاری طرح

جو پیاس تیز ہو تو ریت بھی ہے چادرِ آب
دکھائی دور سے دیتے ہیں سب تمہاری طرح

بلا رہا ہے زمانہ مگر ترستا ہوں
کوئی پکارے مجھے بے سبب تمہاری طرح

ہوا کی طرح میں بیتاب ہوں کہ شاخِ گلاب
لہکتی ہے مری آہٹ پہ اب تمہاری طرح

مثالِ وقت میں تصویرِ صبح و شام ہوں اب
مرے وجود پہ چھائی ہے شب تمہاری طرح

سناتے ہیں مجھے خوابوں کی داستاں اکثر
کہانیوں کے پُراسرار لب تمہاری طرح

---

(۶)

تاروں بھری پلکوں کی برسائی ہوئی غزلیں
ہے کون پروئے جو بکھرائی ہوئی غزلیں

وہ لب ہیں کہ دو مصرعے اور دونوں برابر کے
زلفیں کہ دلِ شاعر پہ چھائی ہوئی غزلیں

یہ پھول ہیں یا شعروں نے صورتیں پائی ہیں
شاخیں ہیں کہ شبنم میں نہلائی ہوئی غزلیں

خود اپنی ہی آہٹ پر چونکے ہوں ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

ان لفظوں کی چادر کو سرکاؤ تو دیکھو گے
احساس کی گھونگھٹ میں شرمائی ہوئی غزلیں

اس جانِ تغزل نے جب بھی کہا، کچھ کہئے
میں بھول گیا اکثر یاد آئی ہوئی غزلیں

---

(۷)

روشنی کے مقدر میں نیندیں کہاں۔ چاند میں طاق پر وہ سجائیں کہیں
ہم چراغِ وفا جلنا ہے رات بھر آسماں تا زمیں وہ جلائیں کہیں
دو بھٹکتی ہوئی روحیں جیسے ملیں یوں ملیں وہ نگاہیں مگر خوف ہے
زیست ہے رات میں جنگلوں کا سفر اس جنم میں بھی ہم کھو نہ جائیں کہیں
شہر میں مثلِ مینارِ عظمت ہمیں آسماں کی طرف لے چلی ہیں مگر
جی میں ہے سبز پیغمبروں کی طرح سینۂ سنگ سے سر اٹھائیں کہیں
برف سی اجلی پوشاک پہنے ہوئے پیڑ جیسے دعاؤں میں مصروف ہیں
وادیاں پاک مریم کا آنچل ہوئیں آؤ سجدہ کریں سر جھکائیں کہیں
کوئی کتبہ نہیں ہیں سرِ راہ ہم جس پہ اقوالِ زرّیں بدلتے رہو
ہم تو آنسو ہیں پلکوں پہ رکھ لو ہمیں جب اشارہ کرو ٹوٹ جائیں کہیں
ان کے شعر ہیں وادیٔ ذہن میں مختلف رنگ کے جھلملاتے دیئے
دستِ الفاظ محفوظ کرے انہیں چل رہی ہے ہوا بجھ نہ جائیں کہیں

ڈاکٹر شمیم حنفی

①

نیلے پیلے سیاہ سرخ سفید، سب تھے شامل اسی تماشے میں
یورشِ رنگ نے ذلیل کیا، آنکھ بھی گم ہو گئی تماشے میں

کوئی بھی اس میں چارہ ساز نہ تھا، سبھی بیمار جستجو نکلے
تم بھی سوچو کہ بیدلی کس سے، راستہ پوچھتی تماشے میں

جسم کا سونا، روپ کی چاندی، کون سا دھن کسی کے پاس رہا
ایک میرا تمھارا قصہ کیا، ساری دنیا لٹی تماشے میں

چاند تھا ساحل نفس کے قریب، ایک دن میرے دل میں ڈوب گیا
صبح کا راز رائیگاں ٹھہرا، شام بھی گھل گئی تماشے میں

کبھی دریا کے ساتھ ساتھ بڑھے، کہیں ٹھٹکے کہیں نظر نہ اٹھی
ایک عمر رواں تھی جی کا زیاں، سو گذرتی رہی تماشے میں

ایک شعلہ ہوس کا بس میں نہ تھا، آپ اپنے سے ہاتھ دھو بیٹھے
خاک آغاز خاک ہی انجام، آگ لگی تماشے میں

---

(۲)

سوچ میں ڈوبے ہوئے چہرے عجیب لگتے تھے
آپ ہی اپنی اداسی کا سبب لگتے تھے
رنگ دکھلائی دیے جسم کے زنداں میں اسیر
آئنے روح کے تصویر طلب لگتے تھے
جانے آنکھوں کی شرارت تھی کہ سمتوں کا زوال
ایک ہی جیسے مجھے راہ میں سب لگتے تھے
دھوپ کی دھند میں لپٹے ہوئے منظر سارے
کتنے روشن تھے مگر صورتِ شب لگتے تھے
کیوں نظر آئے مجھے شورِ تمنا سے نڈھال
وہی لمحے جو مجھے مہر بہ لب لگتے تھے

---

(۳)

آئینہ سامانِ حیرت اور چہرہ اجنبی
دھیرے دھیرے ہو گیا سارا سراپا اجنبی
کیا ہوا دل کو کہ تیرا نام بھی لیتا نہیں
کیوں نظر آتی ہے اب تیری تمنا اجنبی
گھر میں بیٹھوں تو در و دیوار بیگانہ لگیں
اور باہر جاؤں تو لگتی ہے دنیا اجنبی
مضمحل کاندھوں پہ صدیوں کی تھکن کا بوجھ ہے
کون سی منزل پہ ہے تیرا ٹھکانہ اجنبی
یہ پرایا شہر ہے اوپر کی باتوں پر نہ جا
اپنی آنکھوں پر نہ کر اتنا بھروسہ اجنبی
اب کبھی اس شام کے منظر نہ دیکھے جائیں گے
رات اس بستی پہ ایسا قہر ٹوٹا اجنبی

---

(۴)

ایک بے نام و نشاں روح کا پیکر ہوں میں
اپنی آنکھوں سے الجھتا ہوا منظر ہوں میں
کون بہتے ہوئے پانی کو صدا دیتا ہے
کون دریا سے یہ کہتا ہے سمندر ہوں میں
مجھ سے دم بھر کی رفاقت بھی ہوا کو نہ ملی
اپنی پرچھائیں سے لپٹا ہوا پتھر ہوں میں
یہی اجڑی ہوئی بستی ہے ٹھکانہ میرا
ڈھونڈنے والے اسی خاک کے اندر ہوں میں
قہر بن جائیں گی یہ خون کی پیاسی راہیں
زندگی مجھ میں سمٹ آ کہ ترا گھر ہوں میں

---

(۵)

شام تا شام یونہی خاک بسر جاتا ہے
منزلیں گم ہیں دھندلکوں میں مگر جاتا ہے
دل کی قسمت وہی دن رات کی آشفتہ سری
اور آنکھوں کو یہی ضد ہے کہ گھر جاتا ہے
سب کی آنکھوں میں کسی ہادیٔ موعود کے خواب
کون بتلائے کہ اس وقت کدھر جاتا ہے
کن فصیلوں میں گرفتار ہے عرفانِ وجود
کیا یونہی مجھ کو اندھیروں میں بکھر جانا ہے
مٹ چکا نقشِ وفا ڈوب چکی نبضِ سفر
اب فقط ایک سمندر میں اتر جانا ہے

٦

سمجھ سکے نہ جسے کوئی بھی سوال ایسا
بنا ہے سانس کے دھاگوں نے ایک جال ایسا

کبھی دماغ تھا مجھکو بھی خود پرستی کا
پلٹ کے ذہن میں آیا نہ پھر خیال ایسا

میں آسماں تو نہ تھا جس میں چاند چھپ جاتا
ہوا نہ ہوگا کسی کا کبھی زوال ایسا

تمام عمر نئے لفظ کی تلاش رہی
کتاب درد کا مضموں تھا پائمال ایسا

کنارِ آب نہ پہنچے کی جان کی کشتی
بہت دنوں سے ہے پانی میں اشتعال ایسا

٧

وہ ایک شور سا زنداں میں رات بھر کیا تھا
مجھے خود اپنے بدن میں کسی کا ڈر کیا تھا

کوئی تمیز نہ کی خون کی شرارت نے
اک ابر و باد کا طوفاں تھا دشت و در کیا تھا

زمیں پہ کچھ تو ملا چند الجھنیں ہی سہی
کوئی نہ جان سکا آسماں پر کیا تھا

میرے زوال کا ہر رنگ تجھ میں شامل ہے
تو آج تک میری حالت سے بے خبر کیا تھا

اب ایسی فصل میں شاخ و ثمر پہ بار نہ بن
یہ بھول جا کہ پسِ سایۂ شجر کیا تھا

چٹختی گرتی ہوئی چھت اجاڑ دروازے
اک ایسے گھر کے سوا حاصلِ سفر کیا تھا

---

(۸)

بند کر لے کھڑکیاں یوں رات کو باہر نہ دیکھ
ڈوبتی آنکھوں سے اپنے شہر کا منظر نہ دیکھ

میں نے پتھر سہہ لیے لیکن صدا قاتل ہوئی
خود کو لفظوں سے بچا گرتے ہوئے پتھر نہ دیکھ

ایسا ہنگامہ کہ آواز نفس بھی کھو گئی
زندگی کی بات کر یہ عرصۂ محشر نہ دیکھ

تو نے جو پرچھائیاں چھوڑیں وہ صحرا بن گئیں
اے نگار وقت اب پیچھے کبھی مڑ کر نہ دیکھ

کیا پتہ زنجیر میں ڈھل جائے چادر کی شکن
یہ سفر کا وقت ہے اب جانب بستر نہ دیکھ

خاک و خوں میراث تیری خاک و خوں تیرا نصیب
اس زیاں خانے میں اپنے پاؤں کا چکر نہ دیکھ

---

(۹)

بجھے چراغ تو کیا کیا سماں دکھائی دیا
رگ گلو سے ابلتا دھواں دکھائی دیا

جنم جنم کی رفاقت وہیں پہ ختم ہوئی
خلا میں روح کو جب اک مکاں دکھائی دیا

سبھی نے ڈھونڈ لی اک روز پتھروں میں پناہ
بس ایک سلسلۂ غم رواں دکھائی دیا

کبھی جو منہ نہ لگاتا تھا چڑھتے سورج کو
اجڑ گیا تو بہت مہرباں دکھائی دیا

جو ساتھ ساتھ تھے اک دوسرے پہ ٹوٹ پڑے
بساط ریگ پہ جب اک کنواں دکھائی دیا

ہوا کی طرح خوشی بھی ادھر سے گذری تھی
مرا وجود مگر بے نشاں دکھائی دیا

میں تجھ میں کھو کے بھی اک نقش لازوال رہا
بچھڑ کے مجھ سے مگر تو کہاں دکھائی دیا

جاوید کمال

غزلیں

کون سی راہ گزر کون سا رستہ کیا ہے
راہ چلنا ہے تو پھر راہ سے ڈرنا کیا ہے
دے جو فرصت غمِ دنیا تو بتائیں تجھ کو
زندگی ہم نے ترے باب میں سوچا کیا ہے
تیری ہی شوخ نگاہی کی فسوں کاری ہے
ورنہ اس دہر خرابات میں رکھا کیا ہے
اپنے پیدا کیئے سورج سے اجالے مانگو
بھیک مانگی ہوئی کرنوں کا بھروسہ کیا ہے

ہر گلی کوچہ پہ افتاد پڑی ہو جیسے
زندگی موت کی راہوں میں کھڑی ہو جیسے
سہمے سہمے سے کچھ اس طرح کھڑے ہیں ہم لوگ
سر پہ سایہ کی جگہ دھوپ کڑی ہو جیسے
وقت وہ آن پڑا ہے کہ گماں ہوتا ہے
ہر گھڑی روزِ قیامت کی گھڑی ہو جیسے
اب تو محسوس یہ ہوتا ہے کہ انسان کے سوا
اور ہر چیز زمانہ کی بڑی ہو جیسے

نیند آنکھوں میں ہے کم کم مجھے آواز نہ دو
یوں بھی رفتارِ دلِ زار ہے مدھم، مدھم
نیم خاموش ہے سازِ رگِ جاں کا ہر تار
جاگ جائے گا کوئی غم مجھے آواز نہ دو
اور ہو جائیگی مدھم مجھے آواز نہ دو
تار ہو جائیں گے برہم مجھے آواز نہ دو
بعد مدّت کے ذرا دل کو قرار آیا ہے
جانے کیا دل کا ہو عالم مجھے آواز نہ دو

رہنے دو داستانِ غمِ دل کو ناتمام
لو آ گئی وہ فصلِ بہاراں اُٹھاؤ جام
اب وضعِ احتیاط کے موسم نہیں رہے
اور ترکِ میکشی تو اصولاً بھی ہے حرام
آؤ کہ میکدہ کی فضائیں جواں ہیں
آؤ کہ آرزوئیں نہ رہ جائیں تشنہ کام
آؤ یہ چند لمحے بھی یوں ہی گزر نہ جائیں
ہر لمحۂ حیات کو حاصل نہیں دوام

شمع کی لو میں کچھ دھواں سا ہے
کوئی پھر آج بدگماں سا ہے
چاک داماں سے آج بیتابی
تیرے آنے کا کچھ گماں سا ہے
آؤ اس دل میں آن کر دیکھو
آرزوؤں کا اک جہاں سا ہے
کہنے سننے کی بات ہو تو کہیں
حال تم پر تو سب عیاں سا ہے
ٹھیرو ٹھیرو ابھی سے صبح کہاں
یوں ہی پچھلے کا کچھ سماں سا ہے

تم سے دیکھے نہ گئے ہم سے دکھائے نہ گئے
ہائے وہ زخم جو اس دل سے چھپائے نہ گئے

کر لیا یوں تو ہر اک رنج گوارا لیکن
آج تک دل سے تری یاد کے سائے نہ گئے

ہم نے چاہا بھی نہیں ہم نے بھلایا بھی نہیں
دل نے چاہا بھی مگر دل سے بھلائے نہ گئے

راہ پر راہ نکلتی گئی کوچہ سے ترے
ورنہ اس راہ پہ ہم آپ سے آئے نہ گئے

نقشِ پا بن کے جہاں مٹ بھی گیا نقشِ امید
ہم اسی راہ پہ بیٹھے ہیں اٹھائے نہ گئے

میں بے نیازِ غم روزگار ہوں اے دوست
کہ زندگی سے بہت شرمسار ہوں اے دوست
تمام عمر گذاری ہے جن خیالوں میں
انہیں خیالوں سے اب سوگوار ہوں اے دوست
دماغ گویا کہ اک مقبرہ ہے یادوں کا
میں عہدِ رفتہ کا شاید مزار ہوں اے دوست
بہت دنوں سے تری یاد بھی نہیں آئی
اسی لئے تو بہت بیقرار ہوں اے دوست
کوئی خوشی نہ کوئی غم، نہ کوئی حسرتِ دل
تری نگاہ کا امیدوار ہوں اے دوست

ڈھل چلی رات ملاقات کہاں سو جاؤ
سو گیا سارا جہاں، سارا جہاں سو جاؤ
سو گئے وہم و گماں، وہم و گماں سو جاؤ
سو گیا دردِ نہاں، دردِ نہاں سو جاؤ
کب تلک دیدۂ نم، دیدۂ نم، دیدۂ نم
کب تلک آہ و فغاں، آہ و فغاں سو جاؤ
آہ اب ٹوٹ چلا، ٹوٹ چلا، ٹوٹ چلا
آہ یہ رشتۂ جاں، رشتۂ جاں سو جاؤ
اٹھ چلے دل کے مکیں، دل کے مکیں، دل کے مکیں
لٹ گیا سارا مکاں، سارا مکاں سو جاؤ

غم اندھیروں سے خوشی چاندنی راتوں سے نڈھال
دل سے امیدیں امیدوں سے دل و جاں پامال
ذوقِ سودائے خد و خال نہ شوقِ دیدار
آرزوئے شبِ ہجراں نہ تمنائے وصال
نہ کوئی باعثِ راحت نہ کوئی باعثِ رنج
نہ کوئی وجہ تسلی نہ کوئی وجہ ملال
داغِ نو، داغِ کہن، داغِ خزاں، داغِ بہار
داغِ در، داغِ شب و روز دریدہ مہ و سال
دل کے دیرینہ طپش زار میں اے بادِ سموم
کب خنک زاروں سے آئے گی کوئی بادِ شمال

ایسی تھی کہاں قسمت موسم ہی بدل جاتا
غم کس کو گوارہ تھا یہ دل جو بہل جاتا
کیا کہیے کہ گلچیں کو یارا ہی نہیں ورنہ
اس سارے گلستاں کو چٹکی سے مسل جاتا
ہوتیں نہ تری یادیں گر آج مرے دل میں
یہ وقت گراں شاید کچھ اور بھی کھل جاتا
جس آگ نے اس دل کی بستی کو جلا ڈالا
اے کاش کہ میں خود بھی اس آگ سے جل جاتا
دروازوں کے پہرے ہیں دیواروں کی سنگینیں
ہوتا جو مرے بس میں اس گھر سے نکل جاتا

صلاح الدین پرویز

بمبئی

(۱)
بمبئی سمندر ہے
جس میں اپنے سب کپڑے
لوگ پھینک دیتے ہیں

(۲)
بمبئی کی ہر لڑکی
مجھ سے پیار کرتی ہے
میری بیوی لگتی ہے

لکھنؤ

لکھنؤ شہر میں
سب شیعہ اور سنّی ہیں
لکھنؤ بھی تو ہے
ہم وہیں جائیں گے

(۱۹۷۲)

نوحہ

شرارت پر
مگر وہ موم کی گڑیا اتر آئی تھی شاید
چھوا جب گرم ہاتھوں سے
تو پگھلی
اور ہاتھوں کو جلا کر ہو گئی غائب

(۱۹۶۴)

احساس

کانچ کی بوتلیں
ٹوٹ کر گر پڑیں
رات کے خواب سارے
بکھرتے رہے
اور میں، خواہشوں سے دبا سر لئے
نیند میں!
ہر کسی رہ گذر پہ مہکتا رہا۔

(۱۹۶۸)

کبریاقند، نیلماں سمندر

سردیا خون، تازیا تے
گرمیاں خواب پھاتی، بآتے
گرمیاں اک گراں گراں دے
سردیاں ایک سزاں سزاں دے
آئینہ، آئینہ نما سا
راستہ، راستہ خطا سا
شام اک وہم کی ہتھیلی
دھوپ پاسنگ مہرباں سہیلی
فجر لپشواز، تولیہ چولی
رات اک کامپوز کی گولی
ایک میں ہوں، ہواؤں کی نس ہیں
باقی سب دھجیاں ہوس ہیں
منقار، سانس نہ رائیگاں بدن ہے
شجرہ غلام کا تھکن ہے
آہو، اندیشہ آسماں سے ہے

پنجتن پانیاں رواں ہے
یادیہ گرد بار لائے
اپنے بارکی کے بال کھائے
نیچے اسپند، آرزو آسا
اونچے تکلیف، تر خلا صا
باربردوش یک محمدؐ
اور بالا دری میں امّت
باقی اللہ اور صرصر
کبریا قند، نیلماں سمندر

(۱۹۶۷)

پت جھڑ ایک اننت ٹوٹن ہے

برس ٹوٹتے ہیں
جڑ جاتے ہیں
لیکن پت جھڑ
ایک اننت ٹوٹن ہے
کیسے لوگ ہیں
گیس کے ہنڈے
اپنے کاندھوں پر رکھ کر
چُھپتے چَھپتے
اس کے گلیاروں میں مر جاتے ہیں
باراتیں
مٹی کے کوزوں میں
پہلے دودھ، دہی، پھر مٹی بن جاتی ہیں
ایسا بھی ہوتا ہے
کسی ہوی امبر کی انگیا
آنکھیں لکھتے لکھتے
پل، اک پھول، خوشی پھر خشکی بن جاتی ہیں

کوتیائیں
سندرتا، سچ اور اچھائی کی
سوتیلی بہن لگتی ہیں
سب سچ ہے
سب جھوٹ ہے
تنہائی یونک ہے
یونک تنہائی ہے
دونوں کی اک بیچ سطر خالی ہے
ہم کو تو معلوم نہیں ہے
سطر!
سدھارتھ، ہوا، پانی کا برتن
پھر تیرتھ استھان کا اندر بن جاتی ہیں

موسم بیتے موسم آئے
موسم پھر آئے موسم پھر بیتے
دھوپ سویرا شام برف
راتیں گرمی اور برساتیں
رنج خوشی اور غصہ لاتیں
کیا عِ اِن کی
برسیں ٹوٹتے ہیں
یعنی
برس جھڑ جاتے ہیں
لیکن پت جھڑ
ایک اننت ٹوٹن ہے
۱۹۷۲ء

جے پی

جے پرکاش ا
نرائن ہے یا نر ہے
یا دونوں کا آدھا آدھا
ہاتھوں میں اک چکر لئے
چھوٹے چھوٹے پاؤں میں
رانپیں لپٹا لے
دھوتی میں لوگاں کو باندھے
اک منّی بچی کے پیچھے
سرپٹ سرپٹ دوڑ رہا ہے
(۱۹۷۴)

فرحت احساس

غزل

سب در و دیوار مٹ جائیں مکاں باقی رہے
صرف بدروحوں کی خاطر یہ جہاں باقی رہے

کوئی بھی آئے زمیں پر حکمرانی کے لئے
بس ترا چہرہ ہمارے درمیاں باقی رہے

تو بڑے لوگوں کو اتنی ڈھیل مت دے اے خدا
کوئی تیرا نام لیوا تو یہاں باقی رہے

وہ جو میرے بعد آئیں اُن کے رہنے کے لئے
کیا کروں ایسا کہ یہ سارا جہاں باقی رہے

بس دھندلکے ہی میں دنیا اچھی لگتی ہے ہمیں
اس زمین پر اے خدا تیرا گماں باقی رہے

دھیرے دھیرے ہم بھی اس مٹی میں واپس جائیں گے
پہلے بھی جو لوگ آئے تھے کہاں باقی رہے

ہم کو اپنے زندہ رہنے کا بڑا افسوس ہے
کیا کیا ہم نے جو کوئی داستاں باقی رہے

○

اب دل کی طرف درد کی یلغار بہت ہے
دنیا مرے زخموں کی طلبگار بہت ہے
مٹی کی یہ دیوار کہیں ٹوٹ نہ جائے
روکو کہ مرے خون کی رفتار بہت ہے
قاتل سے کہو آکے مرا بوجھ اتارے
یہ سر مرے شانوں پہ گرانبار بہت ہے
پانی سے الجھتے ہوئے انسان کا یہ شور
اس پار بھی ہوگا مگر اس پار بہت ہے
ہر سانس اکھڑ جانے کی کوشش میں پریشاں
سینے میں کوئی ہے جو گرفتار بہت ہے
اب ٹوٹ رہا ہے مری ہستی کا تصور
اس وقت مجھے تم سے سروکار بہت ہے

○

اس کی یاد آئے مہینے ہو گئے
کیا ہوا ہم کو کہ ایسے ہو گئے
یا ہمیں کو سر جھکانا آ گیا
یا در و دیوار اونچے ہو گئے

○

ایام صرف شام و سحر ہو کے رہ گئے
کیسے عجیب لوگ تھے گھر ہو کے رہ گئے
ہم کو پسند آ گیا ساحل کا مشورہ
کشتی کی لکڑیاں تھے شجر ہو کے رہ گئے
مٹی کے اس مکان نے دھوکہ دیا ہمیں
صحرا نورد خاک بسر ہو کے رہ گئے

○

سر اٹھاتے ہی گرفتار ہوئے جاتے ہیں
راستے شہر کے دشوار ہوئے جاتے ہیں
ایسا لپٹا ہے کسی گھر کا تصور ہم سے
ڈھیرے ڈھیرے در و دیوار ہوئے جاتے ہیں

○

ہم سبھی ریت کے ٹیلے ہیں ہوا کی زد پر
ٹوٹتی رہتی ہے دن رات ہماری صورت
لوگ کیا آن بسے ہیں مرے ہمسائے میں
کیا بنا ڈالی ہے دیوار کی در کی صورت

ابوالکلام قاسمی

غزل

دیکھیے، آگے صدائے کاں سے جاکر دیکھیے
منزلوں کے نقش پانی پر منور دیکھیے

ہے اگر گوشِ سماعت سنیے صرف اسکی صدا
آنکھ اگر قدرت نے دی ہے اس کا پیکر دیکھیے

دیکھیے آنکھوں سے اسکی اپنے خوابوں کا زوال
یہ نہیں ممکن تو اُن آنکھوں کا منظر دیکھیے

ثبت کیجیے سنگ دل لوگوں پہ اشکوں کے نقوش
سنگ ریزوں کو کبھی پلکوں سے چن کر دیکھیے

کیوں نہ اوروں کی خطا پر دیجیے خود کو سزا
ہو کسی سے بھی گلہ، خود سے الجھ کر دیکھیے

شام ہو تو کیجیے ہارے ہوئے دل کا حساب
صبح اپنے آپ کو سورج کی زد پر دیکھیے

غزل

نقش ہر منظر کے دھندلے ہو گئے
آنکھ جھپکی گھر گھروندے ہو گئے

میں کسی صورت نہ اپنا بن سکا
اور سارے لوگ تیرے ہو گئے

زندگی بے رنگ و روغن ہو گئی
خواب جو دیکھے تھے سچے ہو گئے

حوصلہ افزا خیالِ یار تھا
کام سب اس کے سہارے ہو گئے

سایۂ زلفِ پریشاں ڈھل گیا
پیڑ یادوں کے [illegible] ہو گئے

بزدلی یوں روح میں گھر کر گئی
دل ہمارے آبگینے ہو گئے

عبید صدیقی

غزل

فصلِ گل آئی تو سارا شہر وحشی ہو گیا
کون تھا جو ہر طرف رنگیں مناظر ہو گیا

میں تو پلکوں پر سجاؤں کا ستارے رات بھر
اس کو شاید غم نہ ہوگا شام سے جو سو گیا

میں جسے رکھتا تھا جسم و جاں سے بھی عزیز
میری آنکھوں سے وہ تنہا خواب چوری ہو گیا

سبز پتّوں کی رفاقت رات دن ڈسنے لگی
اک ہوا ایسی چلی کہ پیڑ تنہا ہو گیا

ایک ہی چہرہ پسند آیا تھا سارے شہر میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں اُس کو بھیڑ میں جو کھو گیا

میری طرح سوچتی ہو گی یہ البم بھی عبید
کون تھا جو گھر کے آنگن میں اداسی ہو گیا

غزل

آخری تیر اَب کمان میں ہے
زندگی سخت امتحان میں ہے

سوکھتی جاتی ہے گلاب کی بیل
آگ سی آگ خشک لان میں ہے

نیند ڈرتی ہے پاس جاتے ہوئے
غم کا آسیب ہر مکان میں ہے

ہے ننگا ہوں کے سامنے منزل
لطف بڑھتی ہوئی تکان میں ہے

دونوں جانب خموش لب ہیں عبید
اور سناٹا درمیان میں ہے

○

تجھ کو پانے کی طلب کا آسرا باقی رہے
بس ہمارے درمیاں یہ فاصلہ باقی رہے

زخم جو تو نے دیا ہے وہ کبھی بھرنے نہ پائے
ایک مدت کی رفاقت کا صلہ باقی رہے

تجھ سے خوں آنکھوں سے میری عمر بھر یونہی بہے
تیرے ہاتھوں پر سدا رنگ حنا باقی رہے

شاخ پر وہ آخری پتہ بھی پیلا ہو چلا
اس خرابے میں کوئی تو لے ہوا باقی رہے

ساحلوں تک لے تو آیا ہے مجھے میرے خدا
تند موجوں سے کبھی لیکن رابطہ باقی رہے

دھند چھا جائے آنکھ سے میری بصارت چھین لے
سرخ پھولوں میں مگر چہرہ ترا باقی رہے

○

خشک دریاؤں کو پانی دے خدا
بادبانوں کو روانی دے خدا

بے سماعت کر دے سارے شہر کو
یا مجھے پھر بے زبانی دے خدا

کب تلک بے معجزہ ہو کر جیوں
کوئی تو اپنی نشانی دے خدا

چھوٹ جاؤں وسعتوں کی قید سے
وحشتوں کو لامکانی دے خدا

سینکڑوں آزاد ہیں میرے یہاں
مجھ کو لیکن میرا ثانی دے خدا

شہر و صحرا کی حدوں کو توڑ کر
لامکاں پر حکمرانی دے خدا

○

شاخ سے وہ آخری پتا جدا ہونے کو ہے
مژدہ اے لوگو! کہ موسم بے قبا ہونے کو ہے

قریۂ جاں جس کے دم سے آج تک آباد تھا
وہ عجب خواہش بھی حرفِ مدعا ہونے کو ہے

خیمۂ گل کی طنابیں کب کی ڈھیلی ہو چکیں
اس سے بڑھ کر اور بھی کچھ اے ہوا! ہونے کو ہے

خواب کی صورت نہیں ان جاگتی آنکھوں میں آ
رات کا منظر بھی اے جاں! اب فنا ہونے کو ہے

جان دینے کا ہنر ہم سیکھ آئے ہیں عبید
قرض جو اس نے دیا تھا وہ ادا ہونے کو ہے

دعا کرو دعا کرو

دھند کے پروں میں چار سو روشنی سمٹ گئی
زمیں کا آسماں سے کوئی رابطہ نہیں رہا
زمیں پہ لگ رہا ہے جیسے کوئی بھی نہیں بچا
چند سایوں کے سوا
بام و در اداس چپ
شجر حجر خموش ہیں
ہوا کے لب ہیں بے صدا
درود بھیجو ساعتوں کی ڈور ٹوٹنے سے قبل
نبیؐ کے پاک نام پر
خدا سے التجا کرو
زمیں کے حق میں جس قدر بھی ہو سکے
دعا کرو
دعا کرو

اے نیند! آ

میری آنکھیں تھک چکی ہیں
کس لئے ؟
کس کے لئے ؟
میں جاگتا ہوں رات بھر
نیند مجھ کو کس لئے آتی نہیں
رات کے پہرے رہے جانے کس لئے
قطرہ قطرہ روز رستا ہے لہو
میری آنکھیں تھک چکی ہیں
کیسے دیکھوں روز یہ منظر بتا ؟
آج کی شب مہرباں ہو
اے نیند! آ
اے نیند! آ

ایم۔ آر قاسمی

غزل

مری حیات مسلسل ہے اک عذاب کا نام
کہ مرے واسطے مہمل ہے اب حساب کا نام

مجھے بھی کفر کی سولی پہ ٹانگنے کے لئے
انہوں نے رکھدیا قرآں مری کتاب کا نام

ہمارے شہر میں یکساں تھیں سب کی تقدیریں
ہر ایک ہاتھ پہ تحریر تھا عذاب کا نام

ہوا کی سمت پہ اڑتا ہوا دھواں کیا ہے
نئے لہو کا تماشہ ہے انقلاب کا نام

تم اس کی تہہ میں نہ جاؤ کہ ڈوب جاؤ گے
کہ زندگی ہے فقط قاسمی! سراب کا نام

غزل

یہ برگ سبز شجر سے اگر اتر جائے
ہوا کے دوش پہ اڑکر نگر نگر جائے

ثواب ہوتا تو تم خود سے منسلک کرتے
عذاب ہے تو یہ بتلاؤ کس کے سر جائے

گداز ڈھونڈ رہا ہے جو کوہِ وحشت پر
کسی چٹان سے سر پھوڑ کر نہ مر جائے

بکھرنے والے کو بتلاؤ رازِ یکجائی
سمٹ گیا ہے جو اس سے کہو بکھر جائے

جڑیں ہیں کھوکھلی جس کی وہ کیسے ٹھہرے گا
ان آندھیوں میں تو اچھا بھلا شجر جائے

سلگتی دھوپ میں چلنا ہے قاسمی کو مگر
ملی ہے چھاؤں تو کچھ دیر تک ٹھہر جائے

سید محمد اشرف
میکڈونل ہاسٹل، آفتاب ہال

افسانہ

چکّر

نیم اور ببول کے درختوں پر مشتمل یہ میدان پندرہ بیس میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ پہلے یہ زمین اوسر تھی۔ لیکن اطراف میں بسے ہوئے چھوٹے چھوٹے دیہات کے کسانوں نے قدرتی پانی کے سہارے بہت سی زمین کاشت کے قابل بنالی ہے۔ اور اب وہ ایکھ اور ارہر کی فصل بو لیتے ہیں۔ کسی وجہ سے پندرہ بیس میل کا ٹکڑا کھیتی کے لائق نہ بن سکا جو اب بھی اوسر کا میدان کہلاتا ہے۔ قدرتی طور پر اُگے نیم اور ببول کے درختوں نے حالانکہ اس زمین سے بنجرپن کا داغ مٹا دیا ہے لیکن یہ میدان آج بھی اوسر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی میدان کے کنارے کنارے ہوتی ہوئی ایک نہر بھی گذرتی ہے۔ لیکن سطح زمین سے نیچے ہونے کی وجہ سے سنچائی کے لئے قطعی غیر مفید ہے البتہ جب سے اس نہر سے ایک بمبا نکال لیا گیا ہے قدرت کا احسان کسانوں پر کم ہو گیا ہے اور اب ان کی نگاہیں آسمانوں پر بادلوں کے بجائے زمین پر نہر اور بمبے کی مشترکہ پلیا پر لگی رہتی ہیں کہ کب پلیا کھلے اور سنچائی شروع ہو۔ اس بمبے کا فائدہ اٹھا کر کسان ارہر اور ایکھ کے علاوہ اب گیہوں چنے اور مکئی کی فصل بھی اگانے لگے ہیں۔

اوسر کا یہ میدان دو چیزوں کے لئے مشہور ہے۔ ایک تو یہ جو دھوبیوں کے کپڑے دھونے میں کام آنے والی چونے جیسی کچھ بھدمیلی سی مٹی ہوتی ہے اور دوسرے کالے ہرن جو اپنے لمبے نکیلے سینگ اور ماداؤں کو لئے کھیتوں کھیتوں چرتے پھرتے ہیں اور کھاپی کر ببولوں کے چھدرے سائے میں غول کے غول بنا کر بیٹھے جگالی کیا کرتے ہیں۔

سورج ابھی نہر کے پانی میں غوطہ لگائے تھا۔ صبح کی سفیدی آسمان کے کنارے پر پھیل چکی تھی۔ ملگجے گہرے رنگ کے آسمان کے کنارے یہ سفیدی ایسی لگ رہی تھی جیسے ارہر کے جوان ہرے بھرے کھیتوں کے چاروں طرف کھنچی ہوئی سفید چکنی منڈیریں۔

ہرنوں کا غول بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔ اکا دُکا ہرن کھڑے تھے۔ بچے کلیلیں کر رہے تھے اور کچھ مادائیں کھڑی چوکنا نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ ہوا زور سے چلتی تو ایکھ کے کھیتوں میں سرسراہٹ ہوتی اور ہرنیاں تڑپ کر کنوتیاں بدل بدل کر کان ہلا ہلا کر ایکھ کے کھیتوں کی طرف آنکھیں گاڑ دیتیں۔ اور اس وقت تک بت بنی ادھر ہی دیکھتی رہتیں جب تک کہ کسی اور طرف سے کوئی اور آواز نہ سنائی دیتی۔

بوڑھا سردار ببول کے بڑے درخت کے چھدرے سائے میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ کچھ پرانی مادائیں زمین پر پیر مار مار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی پرانی مادہ اس کے بوڑھے جسم کو سونگھ لیتی جیسے اپنے تحفظ کا یقین چاہتی ہو۔

سردار بہت بوڑھا ہو چلا ہے۔ گہرے سیاہ رنگ کا بدن اب مٹیالا سا ہو گیا ہے۔ جب اس رنگ پر بہت سی گرمیاں، بہت سی سردیاں اور بہت سی برساتیں گذر جاتی ہیں تو بدن ایسا ہی مٹیالا ہو جاتا ہے۔ گھٹنے اور بازوؤں کے جوڑوں پر کالے کالے ڈھٹے پڑ گئے ہیں، جو اس کی آرام طلبی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جسم پر جگہ جگہ چھرّوں کے نشانات دیہاتی شکاریوں کے اناڑی پن کی دلیل ہیں۔ ان کی پشت پر کا سیاہ رونگٹا بالکل جھڑ چکا ہے اور وہاں جگہ جگہ پھنسیوں کے نشان ہیں جن پر بار بار مکھیاں بیٹھی ہیں اور وہ انہیں بار بار دم ہلا کر اڑا دیتا ہے اور مکھیاں پھر بیٹھ جاتی ہیں۔ چھوٹے سے سر پر ایک بل کھایا ہوا سیاہ سینگ ہے جو جگہ جگہ سے چٹخا سا لگتا ہے اور اس کی چٹخن کی دراروں میں دھول جم گئی ہے اور ایک ٹوٹا ہوا آدھا سینگ جو اکثر اسے اس جدوجہد کی یاد دلاتا ہے جو اس نے اپنے سے پہلے والے سردار کی سرکوبی میں کی تھی۔

وہ واقعہ وہ بھولا نہیں ہے۔ آج بھی اسے اچھی طرح یاد ہے بچپن ہی سے اسنے اپنے

سرداری میں بہت سی خامیاں نظر آتی تھیں۔ اس کے زخموں سے اُسے گھن آتی تھی۔ سردار کی حکومت اسے پسند نہیں تھی۔ اس کی آرام طلبی سے اسے نفرت تھی بغاوت کا جذبہ اس کے دل میں کھولتا رہتا اور وہ اس دن کا انتظار کرتا جب چمکتی ہوئی کالی چادر سے اس کا جسم ڈھک جائے۔ اور ایک دن وہ لمحہ آ گیا۔ اسی میدان میں جب نیم کے بڑے درخت سے آگ کا گولا اوپر سر کا تھا اور ریتلی مٹی کے ذرے خوب چمک اٹھے تھے اور اسے اپنے جسم میں بجلیاں سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں تو اسی ببول تلے بیٹھے بوڑھے سردار پر اس نے اپنی جوانی کا پہلا حوصلہ آزمایا تھا پہلے تو بوڑھے سردار نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا تھوڑی دیر تک وہ سمجھ ہی نہ پایا تھا نوجوان اس کی سرکوبی کرنا چاہتا ہے، لیکن جب غول کے تمام ہرن ایک طرف جھنڈ بنا کر کھڑے ہو گئے اور اپنی ٹانگیں زمین پر مار مار کر مٹی اڑا اڑا کر اس نئے پٹھے کی حوصلہ افزائی کرنے لگے تو وہ ایک دم تلملا کر کھڑا ہو گیا تھا کچھ دیر تک اپنے بوڑھے بدن کے ایک ایک عضو کو ہلا ہلا کر اپنی قوت کا اندازہ کرتا رہا پھر یک بارگی اس جوان پٹھے پر ٹوٹ پڑا۔

بہت دیر تک نئے اور پرانے کی یہ جنگ چلتی رہی۔ جب سورج بالکل ان کے سروں پر آ گیا اور پرچھائیاں ان کے سموں کے نیچے چلی آئیں تو ایک دفعہ اس نے سردار کے بوڑھے جسم سے اپنی پوری طاقت کے ساتھ اپنا جوان بدن لڑا دیا۔ بوڑھا گرا، سنبھلا اور اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے سینگوں سے اس کا ایک سینگ توڑ دیا اپنے جوان سینگ کا یہ حال دیکھ کر ایک دفعہ کو جیسے اس کے دماغ میں بھرے لاوے کو جوش آ گیا ہو۔ غصے کے مارے اس کی آنکھوں میں گرد لاگرد لا پانی سمٹ آیا۔ اور اس نے اپنے ایک سینگ سے ہی بوڑھے سردار کی آنتیں کھینچ لیں۔ بوڑھا کچھ دیر تک وہیں کھڑا جھومتا رہا اور پھر بڑی تیزی سے مڑ کر پیٹ سے نکلی ہوئی سیاہی مائل خون میں ڈوبی آنتیں مٹی میں لتھیڑتا ہوا، دھول اڑاتا ہوا نہر کے پانی میں جا کر ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔ فضا میں منڈلاتے ہوئے گدھ ایک دم کلکلا کر چیخے تھے، شور مچاتے ہوئے بہت سے پرندے ان کے سروں پر سے گذر گئے تھے اور وہ خود فتح کے نشے اور لڑائی کی تھکن میں چور وہیں بیٹھا بہت دیر تک تھرتھراتا رہا اور ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا اب وہ اپنے غول کا سردار تھا۔ نئی اور پرانی مادائیں اسے چاروں طرف سے گھیرے کھڑی تھیں۔

اور وہیں ایک چھوٹا سا بچہ اپنی معصوم لیکن چمکدار آنکھوں سے اس کے خون میں ڈوبے ہوئے جوان بدن کو دیکھتا اور کبھی اس دھول کی طرف جو بوڑھے سردار کے آخری قدموں سے اڑی تھی اور اب تک فضا میں منڈلا رہی تھی۔

سورج آسمان میں اپنا چکر پورا کر رہا تھا۔ اور آج بوڑھے سردار کو ایک ایک بات یاد آ رہی تھی ہے کچھ دنوں سے وہ اُسی بچے کی آنکھوں میں گیہوں کٹ جانے کے بعد والے سورج کی چمک محسوس کر رہا ہے وہ، سورج کی چمک جو ہرنوں کو رنگ کو مزید سیاہ کر دیتی ہے وہی چمک جو گیہوں کی ہری بالیوں میں سنہرا دانہ سجا دیتی ہے۔

اس نے تھکن سے بوجھل آنکھیں اٹھا کر کالو کو دیکھا۔ سیاہ بالکل سیاہ بدن والا کالو۔ ابھی سورج نیم کے درخت کے پیچھے ہے جب اوپر آئے گا تو سیاہ رونگٹا اور زیادہ چمک اٹھے گا۔

اور کالو سب سے پرے کھڑا اپنی ٹانگیں زمین پر مار رہا ہے آج اس کا دل بے ساختہ چاہ رہا ہے کہ بوڑھے سردار، پرانی مادہ اؤں اور بقیہ ہرنوں سے الگ کھڑی سنہری کے پاس جاکر اسے اپنی زبان سے چاٹے۔ اس کی چھوٹی سی تھوتنی کو سونگھے اور اس کے جسم پر اپنے نکیلے سینگ ہولے سے چبھو دے۔ لیکن وہ جب بھی یہ ارادہ کرتا، ہاسے بوڑھے سردار کی آنکھیں سرخ نظر آنے لگتیں اور وہ اپنا ارادہ کچھ دنوں کے لئے ترک کر دیتا۔ بڑی بڑی کالی آنکھوں والی سنہری اپنے بدن کو کچھ اس انداز سے حرکت دے رہی تھی کہ اس کا دل بے ساختہ چاہا کہ اسکے پاس چلا ہی جائے آج اس کا دل یہ بھی چاہ رہا تھا کہ بوڑھے سردار کو سینگ مار مار کر لہولہان کر دے اور اس کا اکلوتا سینگ بھی توڑ دے اور پھر سنہری کے پاس جاکر اپنا منہ سنہری کی تھوتنی سے رگڑ دے لیکن سردار کی موجودگی میں یہ سب کچھ کرنا بہت دشوار تھا۔ حالانکہ سردار کی عادتوں، اسکی آرام طلبی اور کاہلی سے پرانی مادہ اؤں کے علاوہ سبھی ہرن نالاں تھے۔ اور پرانی مادائیں بھی شاید اس لئے سردار کی خوشنودی میں لگی رہتی تھیں کہ وہ آڑے وقت میں انکے کام آ سکے۔ عمر ڈھل جانے کے بعد اور اپنی ذات کو غیر مفید سمجھ لینے کے بعد اسی قسم کے تحفظ کا جذبہ جاندار کی فطری جبلّت ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی سردار کی سرداری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اب بھی سارے ہرن اسی کی قیادت میں سارے کام کرتے۔ اسی کی

آنکھیں دیکھ کر ارہر کے کھیت چرتے اور اسی کے حکم سے کبھی کبھی اپنا میدان چھوڑ کر دوسرے میدانوں میں چلے جاتے۔ کچھ عجیب سا دبدبہ تھا جو ان پر ہمیشہ مسلّط رہتا۔ کچھ تو اس کی طاقت کا وہ رعب ان پر سوار رہتا جو اس نے اپنے بوڑھے سردار کی سرکوبی میں ظاہر کی تھی اور کچھ اس کی بزرگی کا ادب۔

لیکن آج کالو بہت مضطرب تھا۔ بچپن کا وہ واقعہ اس کے شعور سے نکل کر لاشعور میں جا گھسا تھا جب موجودہ سردار نے اپنے سابق سردار کو ختم کیا تھا اور کالو نے اپنی معصوم نگاہوں سے وہ سارا منظر دیکھا تھا۔ اب تو اسے صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ اس کی چمکتی ہوئی کالی جلد کے نیچے چمکتا ہوا لال خون دوڑ رہا ہے۔ اس کے سینگ ہلکا سا بل کھا کر پوری لمبائی تک پہونچ چکے ہیں۔ اور اسے کسی بھی قیمت پر سنہری کو حاصل کرنا ہے۔

ادھر بوڑھے سردار نے سوچتے سوچتے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ نیم کے پرانے درخت کے نیچے سے آگ کا گولا اوپر سرک رہا تھا۔ قرب وجوار کی ہر شئے کا رنگ آہستہ آہستہ واضح ہو کر اپنے اصلی روپ میں نکھرنے لگا۔ دور کے ارہر اور ایکھ کے کھیتوں میں اب بھی دھند کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ آج پورے غول میں اسے عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا۔ ایسی بے چینی بے کلی تو اس نے کبھی دوسرے غول کے ہرنوں سے لڑنے پر بھی اپنے غول میں محسوس نہیں کی تھی۔ سارے ہرن اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے مادائیں بھی اس کے پاس آتیں، اسے سونگھتیں اور ایک دم چونک کر تیزی سے کنوتیاں بدل کر تیزی سے پرے ہٹ جاتیں۔ ہرنوں کے پیروں کے نیچے سے دھول اڑ رہی تھی۔ سورج اب خوب اٹھ چکا تھا۔ سردار کے زخم اب خوب صاف نظر آنے لگے تھے۔ اس کی رانوں کی پشت پر بیٹھی مکھیاں بار بار اڑتیں اور بار بار بیٹھ جاتیں۔

سورج کچھ اور چمکا اور بوڑھے سردار نے دیکھا کہ کالو کے جسم کا ایک ایک رواں چمک اٹھا ہے۔ آج اسے پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ کالو بہت تندرست اور طاقتور ہے کالو کے جسم کا ایک ایک عضو اپنی جوانی کا ثبوت دے رہا تھا۔ خوب کھنچے ہوئے کالے چمکدار سینگ۔ بھری کمر اور پُرگوشت اور سینے اور جسم کا ہر حصہ کی وہ مخصوص تھرکن جو ہرن کا خاصہ ہے۔ یہ مخصوص تھرکن اس وقت

پیدا ہوتی ہے جب ہرن لمبا میدان دوڑنے کے لئے خود کو تیار کرتا ہے یا جب اسے کسی سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ بوڑھا سردار جانتا ہے کہ یہ تھرکن جوان ہرن کے جسم میں شدت کے ساتھ کب پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد پھر کیا ہوتا ہے۔ ویسے بھی وہ کچھ دنوں سے اپنے غول میں اس اعتماد کے اٹھ جانے کا احساس کر رہا تھا جو اس نے اپنے سردار کو ختم کرنے کے بعد حاصل کیا تھا۔ سردار نے دیکھا کہ مادائیں بالکل پرے ہٹ کر کھڑی ہو گئی ہیں اور سارے ہرن اس کی اور کالو کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ شروع دن کی دھوپ کی ٹھنڈی چمک سے کالو کا سیاہ رونگٹا خوب چمک اٹھا تھا اور بل کھائے ہوئے چمکیلے سیاہ سینگ بھی خوب چمک اٹھے تھے۔ کالو نے دیکھا کہ دھوپ میں چمک آتے ہی سنہری کا بدن اور صاف ہو گیا ہے اور رانوں کے پچھلے حصّے کا رونگٹا سونے کے تاروں کے مانند چمک رہا ہے اور اُدھر بوڑھے سردار کے زخم خوب واضح ہو گئے ہیں اور زخموں پر بیٹھی ہوئی مکھیوں کی تعداد میں پہلے سے اضافہ ہو گیا ہے۔ کالو نے سنہری کی وہ گھٹی گھٹی پہلی، کنواری اور معصوم آواز ابھی ابھی سنی تھی جو ہرنی جوان ہونے کے بعد پہلی بار منہ سے نکالتی ہے۔ ریت کے ذرے چمکے۔ کالو کے پیروں میں حرکت پیدا ہوئی۔ غول کے تمام ہرنوں نے مٹی پر کھر مار مار کر اس کی ہمت افزائی کی۔ یک بارگی کالو زمین پر سر مار کر مار کر سر تھوڑا سا نیچا کر کے سینگ تان کر بوڑھے سردار پر جھپٹ پڑا۔ اور نکیلے سینگ اس کی چھاتی میں گڑو دیئے۔ سردار زمین پر ہی ایک دفعہ کو ڈگمگایا، سنبھلا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے یہ سوچنے میں اتنی دیر بھی نہ لگی جتنی دیر ایک کھیت سے دوسرے کھیت تک جانے میں لگتی ہے۔ آج کالو کے ہاتھ وہی گھڑی آگئی جو پچھلے وقتوں میں بوڑھے سردار کو خود اس کے ہاتھوں دیکھنا پڑی تھی۔ اپنا اکلوتا سینگ لئے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دم کو زور زور سے ہلا کر زخموں پر بیٹھی مکھیوں کو ہٹایا۔ بدن کے ایک ایک عضو کو حرکت دیکر طاقت جمع کی۔ اور دفاع کے لئے پوری طرح تیار ہو گیا۔ اتنے میں کالو بھی دوبارہ حملہ کرنے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ وہ جھپٹ کر سردار سے بھڑ گیا اور اسے اپنے نکیلے سینگوں پر رکھ لیا۔ بوڑھا سردار ہر حملہ سوچ سوچ کر روک رہا تھا۔ کالی جلد پر جگہ جگہ خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔ جیسے اندھیری راتوں میں ارہر کی رکھوالی کرنے والوں نے

جگہ جگہ الاؤ روشن کر رکھے ہوں۔ ایک دفعہ کو سردار نے اپنی پوری طاقت سے کالو پر حملہ کر دیا اور اپنے اکلوتے سینگ سے کالو کا جوان اور مضبوط سینگ توڑ دیا لیکن اس حملہ میں اسے اپنا اکلوتا سینگ بھی کھونا پڑا۔ اب اس کے دونوں سینگ ٹوٹ چکے تھے اور اسے اپنا سردار یاد آ رہا تھا جو دونوں سینگ کھو کر نہر میں ہمیشہ کے لئے غرق ہو گیا تھا۔ اُدھر کالو اپنا جوان اور مضبوط سینگ کھو کر دیوانہ سا ہو گیا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ سردار کے دونوں سینگ ٹوٹ چکے ہیں تو اسے اپنی فتح کا یقین سا ہو گیا۔ ان دونوں جذبوں نے اس نے ایک نئی طاقت پھونک دی اور وہ بوڑھے سردار پر بُری طرح ٹوٹ پڑا۔

جوان کالو اور بوڑھے سردار کے جسموں سے خون رِستا رہا اور ریتلی مٹی میں جذب ہوتا رہا۔ سردار آہستہ آہستہ پست ہونے لگا اور کالو کی ہمت بڑھتی رہی۔ سورج بالکل ان کے سروں پر آ گیا تھا اور پرچھائیاں ان کے جسموں کے نیچے موت کا کھیل کھیل رہی تھیں۔ چاروں طرف بلا کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا بالکل ساکت تھی اور ایکھ کے کھیتوں کی سرسراہٹ بند ہرن پیر مار مار کر کالو کی ہمت افزائی کرنا بھول گئے تھے اور پرانی مادائیں بوڑھے سردار کے زخموں اور کالو کے حملوں کو بت بنی دیکھ رہی تھیں کالو نے سنہری کو ایک بار دیکھا اور تڑپ کر اپنا سینگ بوڑھے سردار کے سینے میں گھونپ دیا۔ خون کا ایک نالا سا بہنے لگا اور سردار ڈگمگایا تو ڈگمگاتا ہی چلا گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اب زندگی کے آخری سانسیں لینا ہے۔ کیا ان ماداؤں کے سامنے اپنی آنکھوں کو پتھرا جانے دے جنہوں نے اس کے ہاتھوں اس کے سردار کی شکست دیکھی تھی، کیا وہ ان ماداؤں کے سامنے دم توڑ دے جو اسکے بوڑھے جسم کو سونگھ سونگھ کر بچے جنتی تھیں ...... کیا مرتے وقت وہ ان اراہر کے کھیتوں کو دیکھنے کی ہمت کر سکے گا جن میں اس کے بچپن اور جوانی نے سانسیں لی تھیں۔ اور پھر بوڑھا سردار بڑی تیزی سے مگر ڈگمگاتے قدموں سے نہر کی جانب بھاگنے لگا۔ خون سے تمام دھرتی سرخ ہو گئی تھی۔ نہر کے پاس پہنچ کر اس نے مڑ کر سب کو آخری دم توڑتی نگاہوں سے دیکھا۔ کالو فتح کے نشے میں بیٹھا تھر تھرا رہا

تھا۔ نئی اور پرانی مادائیں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ ہرن دوڑ دوڑ کر رک رہے تھے۔ رُک رُک کر بھاگ رہے تھے جیسے کالو کی فتح کا جشن منا رہے ہوں۔ کالو اٹھ کر سنہری کی جوان تھوتھنی پر اپنا منہ رگڑ رہا تھا۔

سردار نے اپنی اگلی ٹانگیں نہر کے پانی میں ڈال دیں اور اپنا بوڑھا جسم نہر میں ڈھکیل دیا اور آہستہ آہستہ گہرے پانی میں غرق ہونے لگا۔

ادھر کالو سے الگ، مادائوں سے دور، سنہری سے پرے ہرنوں کے اُدھر ایک چھوٹا سا بچہ اپنی کالی کالی معصوم لیکن چمکتی ہوئی آنکھوں سے سب دیکھ رہا تھا۔ کبھی بوڑھے سردار کے آہستہ آہستہ غرق ہوتے ہوئے بوڑھے جسم کو کبھی خون میں ڈوبے ہوئے کالو کے جوان بدن کو۔

اور سورج جس کی گرمی سے ہرنوں کی جلد سیاہ پڑ جاتی ہے، جس کی روشنی سے ریت کے ذرّے چمکنے لگتے ہیں۔ آسمان میں اپنا چکر پورا کر رہا تھا۔ کل پھر سورج پھر نکلے گا۔

٭٭٭٭٭

....تاکہ سند رہے!

'آفتاب' کا یہ خصوصی شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

میرے ذہن میں اس خصوصی شمارے کا جو خاکہ تھا اور جس روپ میں یہ آپ کے ہاتھوں میں پہونچا ہے ـــ دونوں میں اتنا زیادہ فرق ہو گیا ہے اور یہ شمارہ اتنی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے کہ یہ چند سطور بطور افتتاحیہ تحریر کرنا میرے لئے ناگزیر ہو گیا ہے۔

اس سے قبل کہ اس کی ترتیب کے بارے میں کچھ عرض کروں اسکی تاخیر سے اشاعت کے سلسلے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

مجھے ۱۹۷۶ء کے آخر میں جناب حمید احمد الہاشمی صاحب نے "آفتاب" کا مدیر نامزد کیا تھا مگر اس کے فوراً ہی بعد وہ آفتاب ہال کے پرووسٹ کے عہدے سے سبکدوش ہو گئے اور ان کے مقام پر جناب نسیم قریشی صاحب کا تقرر ہوا اور آج ۱۹۸۰ء کے آخر میں جب کہ یہ شمارہ تمام کتابت وطباعت کی منزلوں سے گزر کر منظر عام پر آنے والا ہے جناب ریاض الرحمٰن خاں شیروانی صاحب آفتاب ہال کے پرووسٹ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جناب نسیم قریشی صاحب کے تین سالہ دور اقتدار میں آفتاب کا ایک بھی شمارہ شائع نہیں ہوا۔

بحیثیت مدیر کے اس تاخیر کی ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں اور اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ کچھ حالات بھی آپ کے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں تاکہ

آپ خود فیصلہ کرلیں کہ اس تاخیر کا ذمہ دار کون ہے۔

میں نے جون ۱۹۷۷ء تک اس شمارے کے لئے تمام مواد جمع کرلیا تھا صرف ترتیب دے کر پریس کے حوالے کر دینا تھا۔ جب اس کی اطلاع میں نے جناب نسیم قریشی صاحب کو دی تو انہوں نے فرمایا کہ آفتاب کا جو پچھلا شمارہ " یادیں نمبر " شائع ہوا تھا اس کا حساب اب تک ادا نہیں ہو سکا ہے لہذا میں چاہتا ہوں کہ اس سال کے بجٹ سے وہ قرض ادا کرلوں اور تم یہ شمارہ اگلے سال یعنی ۷۸-۱۹۷۷ء میں شائع کر دینا میں نے ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ بات تسلیم کرلی۔

اپنی کچھ ذاتی مجبوریوں کے سبب مجھے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور میں ایل ایل۔ بی کا کورس ادھورا چھوڑ کر اپنے وطن واپس چلا گیا۔

۷۸-۱۹۷۷ء کے تعلیمی سال میں پڑھائی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد بھی میں نے علی گڑھ کے تین چکر لگائے اور ہر بار جناب نسیم قریشی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کرتا رہا کہ یہ شمارہ پریس کے حوالے کر دیا جائے۔ اپنے نگراں جناب ڈاکٹر منظر عباس نقوی صاحب سے بھی میں درخواست کرتا رہا کہ یہ شمارہ شائع کروا دیجئے اور وہ بھی اس بات سے متفق تھے کہ یہ شمارہ ضرور شائع ہونا چاہئے۔ آخر ۷ / جون ۱۹۷۸ء کو انہوں نے ایک خط نسیم قریشی صاحب کو لکھا میرے پاس وہ خط موجود ہے۔ اس میں انہوں نے تحریر فرمایا " آفتاب ۱۹۷۷ء کے مسودے کو ترتیب دے دیا گیا ہے اور اب یہ مسودہ پرویز جعفری صاحب کے سپرد کیا جاسکتا ہے تاکہ لکھنؤ پہنچ کر طباعت کا کام شروع کرادیں۔"

اس خط کے بعد ۸ / جون ۱۹۷۸ء کو جناب نسیم قریشی صاحب نے ایک خط سرفراز پریس لکھنؤ کے منیجر جناب انصار حسین صاحب کے نام تحریر کر کے مجھے دیا اور فرمایا کہ آپ مسودہ لے جا کر انصار حسین صاحب کو دے دیں وہ میرے دوست ہیں باقی کام وہ کرادیں گے

میں نے ان کے حکم کے مطابق مسودہ ۱۰ رجون ۱۹۷۸ء کو سرفراز پریس جاکر انصار حسین صاحب کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے جناب نسیم قریشی صاحب کے خط کا احترام کرتے ہوئے کتابت فوراً شروع کرادی۔ اس کے بعد دو سال تک وہ شمارہ کیوں شائع نہیں ہو سکا یہ یا تو نسیم قریشی صاحب بتا سکتے ہیں یا ان کے دوست جناب انصار حسین صاحب مجھے صرف اتنا علم ہے کہ تقریباً تین سو صفحات کتابت شدہ پڑے تھے نہ تو کتابت کا روپیہ ادا کیا گیا تھا اور نہ ہی کاغذ کے لئے پیسے دئے گئے تھے۔ ظاہر ہے اس دور میں "صرف خط" پر کوئی پریس والا زیادہ سے زیادہ کتابت ہی کرواسکتا ہے اپنی جیب سے کاغذ خرید کر طباعت نہ کرائے گا۔

اس شمارے کی اشاعت کی میری آرزوئیں دم توڑ چکی تھیں اور مایوسی کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ جب میں ستمبر ۱۹۸۰ء میں ایک عرصہ بعد علی گڑھ آیا تو میرے روم پاٹنر اور آفتاب ہال کے موجودہ سینیر ہال کفیل احمد نے مجھے بتایا کہ یہ شمارہ علی گڑھ میں چھپ رہا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جناب نسیم قریشی صاحب اب آفتاب ہال کے پرووسٹ نہیں ہیں بلکہ جناب ریاض الرحمٰن خاں شیروانی صاحب پرووسٹ ہو گئے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ شمارہ لکھنؤ میں انصار حسین صاحب کے پاس سے علی گڑھ گپتا جی کے پاس کیسے پہونچ گیا۔ خیر گپتا جی سے ملاقات کی تو معلوم ہوا کہ نسیم قریشی صاحب خود ہی یہ مسودہ لکھنؤ سے لاکر گپتا جی کے حوالے کر گئے تھے۔ مگر یہ دیکھ کر مجھے اور حیرت ہوئی کہ میرے تقریباً ۴۰۰ صفحات کے مسودے کی جگہ صرف ۲۱۷ صفحات اس میں شامل ہیں۔ گپتا جی کا کہنا تھا کہ مجھے جتنا مسودہ ملا وہ میں نے چھاپ دیا۔ باقی میں کچھ نہیں جانتا۔

اس مسودے کی تلاش میں میں گپتا جی کے پاس سے اپنے نگراں ڈاکٹر منظر عباس نقوی صاحب کے پاس اور ان کے گھر سے جناب قریشی صاحب کے دولت کدے پر اور وہاں سے لکھنؤ سرفراز پریس تک پہونچا۔ جب کہیں جاکر تقریباً سوا سو صفحات مزید کتابت

شدہ و غیر کتابت شدہ دونوں طرح کے حاصل ہوئے۔ تقریباً ۵۰ تصاویر اور شاعروں اور ادیبوں کے خود نوشت حالات بھی حاصل ہوئے جو اس شمارے میں شائع ہونے تھے۔ مگر مجھے سخت افسوس ہے کہ اتنی دوڑ بھاگ کرنے کے بعد بھی کچھ چیزیں ایسی ہیں جو مجھے نہیں مل سکیں۔ مثال کے طور پر زاہدہ زیدی صاحبہ کا ڈرامہ "چٹان" جو تقریباً ۱۷ صفحات پر کتابت شدہ تھا۔ یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جناب زیدی جعفر رضا صاحب کا ایک افسانہ جو علی گڑھ کی زندگی سے متعلق تھا۔ میں زاہدہ زیدی صاحبہ اور زیدی جعفر رضا صاحب کے سامنے اپنے کو مجرم تصور کر رہا ہوں ان سے معذرت طلب کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کیونکہ میری لاپرواہی کے سبب سے ان کی یہ بہترین تخلیقات اس شمارے میں شائع نہیں ہو سکیں۔ میں اپنے موجودہ پرووسٹ جناب ریاض الرحمٰن خاں شیروانی صاحب کا بے حد احسان مند ہوں کہ انہوں نے یہ باقی سوا سو سے زیادہ صفحات اس شمارے میں شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور اس طرح مجھے اپنے کئی قابل احترام بزرگوں اور کچھ عزیز دوستوں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچا لیا مگر اس شمارے میں شامل شاعروں اور ادیبوں کی تصاویر اور ان کے خود نوشت حالات زندگی اس شمارے میں شامل نہ ہو سکے کیونکہ دو سو صفحات طباعت کی منزلوں سے گزر چکے تھے اور بعد میں ان میں تصاویر اور حالات زندگی شامل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

کچھ اس شمارے کے بارے میں

جیسا کہ ابتدائیہ میں تحریر کیا جا چکا ہے یہ شمارہ اُن شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات پر مشتمل ہے جو گزشتہ بیس برسوں میں درسگاہِ علی گڑھ سے وابستہ رہے ہیں۔

عام طور سے سینیر طلباء اور دیگر بزرگ یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ اب "علی گڑھ وہ علی گڑھ نہیں رہا جو ہمارے زمانے میں تھا"۔ اب علی گڑھ میں شعر و ادب کی شمع روشن

نہیں ہے۔ اب نہ تو دیوانوں میں وہ جوش جنوں رہا نہ وہ ماحول باقی ہے" یہ اور ایسی ہی بہت سی باتیں اکثر سنتا رہتا تھا۔

میری ذاتی رائے میں موجودہ علی گڑھ اُن بزرگوں کے خوابوں میں بسے ہوئے علی گڑھ کے مقابلے میں ممکن ہے بے ادب ہوگیا ہو۔۔ گستاخ ہوگیا ہو یا اب یہاں وہ روایتیں اور وضع داریاں باقی نہ رہ گئی ہوں جو ان کے زمانے میں تھیں مگر موجودہ علی گڑھ آج بھی اتنا بہتر ہے کہ اس دور کی کوئی دوسری یونیورسٹی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ یہ بات میں بہت ہی ذمہ داری کے ساتھ کہہ رہا ہوں کیونکہ میں نے ہندوستان کی بہت سی یونیورسٹیاں دیکھی ہیں۔ لکھنؤ، دہلی اور اکبرآباد بھی ہو آیا ہوں جو اردو زبان اور شعروادب کے مرکز تھے۔ جو میر، سودا، غالب، ذوق، انیس اور نسیم کے وطن تھے۔ دہلی کے اُن کوچوں میں بھی پھرا ہوں جو میر صاحب کے زمانے میں اوراقِ مصوّر تھے اور جہاں جو شکل نظر آتی تھی وہ تصویر نظر آتی تھی۔ آج سب کچھ تبدیل ہوچکا ہے، بہت کچھ پرانا ختم ہوگیا ہے اور بہت کچھ نیا پیدا ہوگیا ہے۔ اور جب عہد حاضر میں ہم علی گڑھ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ علی گڑھ نے اپنی شاندار روایتوں کو باقی رکھا ہے اور ہر دور میں اُس میں اضافہ کیا ہے۔

صرف شعروادب ہی کو لے لیجئے تو آج بھی جتنے مشہور شاعر اور ادیب اس یونیورسٹی میں موجود ہیں ہندوستان کی کسی دوسری یونیورسٹی میں نہیں ہیں۔ یہی خیال اس شمارے کو ترتیب دینے کا موجب بنا۔ حالانکہ یہ شمارہ اس معیار کا نہیں ہوسکا جیسا میں چاہتا تھا مگر پھر بھی جو کچھ آپ کی خدمت میں حاضر ہے وہ میرے اس دعوے کے ثبوت کے لئے کافی ہے جو میں نے اوپر کیا ہے۔ یہ شمارہ ہمعصر علی گڑھ کی صرف ایک جھلک پیش کر رہا ہے۔

میں چاہتا تھا کہ اس شمارے میں ان تمام شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات شامل کردوں جو آزاد ہندوستان میں مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے ہیں اور اُن کی وہی تخلیقات

اس میں شامل کردوں جو اس دور میں عالم وجود میں آئیں ہیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ارادہ تھا کہ تمام شاعروں اور ادیبوں کی تصویریں بہ مع اُن کے خود نوشت حالات زندگی کے شامل کردوں جس سے یہ ایک یادگار شمارہ بن جائے۔ مگر جب کام کرنا شروع کیا تو فہرست اتنی طویل ہوگئی کہ مجھے لگا کہ ان تمام حضرات کو شامل کر پانا میرے لئے ممکن نہ ہو سکے گا۔ اس لئے میں نے بجائے تیس برس کے صرف بیس برس یعنی ۵۷ء سے ۷۷ء تک کا عرصہ لے لیا۔ اور ان بیس برسوں میں درسگاہ سے وابستہ رہنے والے تمام شاعروں اور ادیبوں کو (جن کا میں پتہ لگا سکا) میں نے اس شمارے میں شامل کر لیا تھا اور اُن کی تصاویر بہ ... مع حالاتِ زندگی کے حاصل کر لیں تھیں۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ یہ تصاویر اور حالاتِ زندگی اس میں شامل نہیں ہو سکے۔

میں نے اس شمارے کو ترتیب دیتے وقت اس بات کا خیال رکھا تھا کہ صفحات کے سلسلے میں توازن قائم رکھا جائے۔ اس لئے میں نے تقریباً پانچ صفحات ہر شاعر کو دئے افسانوں کے سلسلے میں ایسا ممکن نہیں تھا لیکن پھر بھی میں نے خیال رکھا تھا کہ کوئی بہت طویل افسانہ اس میں شامل نہ کردوں۔ کم و بیش یہی ترتیب اس میں باقی ہے اگر کسی شاعر کے صرف دو صفحات ہی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اتنا ہی مواد بھیجا تھا اور کہیں اگر کچھ صفحات زیادہ ہوگئے ہیں تو یہ میری ناتجربے کاری کی وجہ سے ہوا ہے جناب ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب اس شرط سے مستثنیٰ ہیں۔ جناب ڈاکٹر وحید اختر صاحب اور جناب زیدی جعفر رضا صاحب کے بھی کچھ صفحات زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر وحید اختر صاحب کے ایک مرثیہ کا انتخاب میں نے اس میں الگ سے شامل کردیا ہے۔ مرثیہ شاعری کی ایک الگ صنف ہے۔ اور آج کل بہت کم لوگ مرثیہ کہتے ہیں اس لئے میں نے اس مرثیہ کو الگ سے شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر زیدی جعفر رضا کا ایک منظوم خط بھی میں نے الگ سے شامل کر دیا ہے۔

اس شمارے کی اشاعت کے سلسلے میں اپنے نگراں ڈاکٹر منظر عباس نقوی صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ اس بیس برسوں میں علیگڑھ سے وابستہ رہنے والے شاعروں اور ادیبوں کے نام اور ان کے موجودہ پتے فراہم کرنا ایک دشوار کام تھا اس سلسلے میں پروفیسر آلِ احمد سرور صاحب، جناب پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب، جناب پروفیسر وحید اختر صاحب اور جناب شہریار صاحب کا احسان مند ہوں جنہوں نے یہ مشکل کام آسان کر دیا۔

اس شمارے میں شامل دو ہستیاں اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں جناب خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب اور جناب جاوید کمال صاحب۔ یہ علی گڑھ برادری کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ان کو جوار رحمت میں مقام عالی عطا فرمائے اور ان کے ورثار کو صبر عطا کرے۔ ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

جناب خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کی محبتیں و شفقتیں جو سرپرستی کے طور پر مجھے اور میرے ہمعصر نوجوان شاعروں کو میسر آئیں وہ ہم ساری زندگی فراموش نہ کر سکیں گے۔

جس زمانے میں میں اس شمارے کا مواد جمع کر رہا تھا۔ خلیل صاحب سخت بیمار تھے۔ جب وہ ہسپتال سے گھر واپس آگئے تب بھی وہ بستر پر ہی لیٹے رہتے تھے۔ اس زمانے میں بستر پر لیٹے لیٹے ہی انھوں نے بہت سے شاعروں کے نام اور پتے جو ان کو زبانی یاد تھے مجھے بتائے اور آج ان شاعروں کا کلام اس شمارے میں شامل ہے۔ جب میں نے اُن سے ان کے کلام کی درخواست کی تو انہوں نے کہا ایک ہفتہ میں دے دوں گا میں ایک ہفتہ بعد پھر گیا تو انہوں نے کہا میں نقل نہیں کرا سکا پرسوں دے دوں گا۔ جب میں پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے دیکھتے ہی وہ پلنگ سے اٹھے اور میز سے ایک مسودہ اٹھا کر میرے حوالے کر دیا۔ پھر کہنے لگے میں نقل نہیں کروا سکا۔ اس دوران جو کچھ بھی کہا ہے وہ سب یہی ہے۔ اس میں سے جو کچھ چاہو آفتاب کے لئے لے لو۔ لیکن یہ مسودہ مجھے

واپس کر دینا کیونکہ میرے پاس اس کی کوئی نقل نہیں ہے "۔ مجھے کیا علم تھا کہ اب میں یہ مسودہ خلیل صاحب کو واپس نہ کر سکوں گا۔ اس مسودے میں کچھ غزلیں تھیں اور کچھ "مکتبات" تھے وہ سب اس شمارے میں شامل ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے وہ "مکتبات" ان کے تعزیتی جلسے میں پڑھے اور پھر شہریار صاحب کے حوالے کر دئے۔

آج میں سوچتا ہوں کہ اپنی بیماری کے باوجود اُن کو اس کا خیال تھا کہ میں تیسری بار آیا ہوں اس لئے انھوں نے پورا مسودہ میرے حوالے کر دیا اور دوسری طرف کتنے لوگ ایسے ہیں جنھوں نے سات سات آٹھ آٹھ بار اپنے گھر کا چکر لگوانے کے بعد اپنی تخلیقات دیں۔ اور کچھ بڑے شاعر اور ادیب ایسے بھی ہیں جن کو میں نے تین تین خط لکھے مگر تخلیقات بھیجنا تو دور رہا انھوں نے خط کا جواب تک نہیں دیا۔ انہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے آدمی پہچانا جاتا ہے۔

آخر میں میں مجلسِ ادارت کے ساتھیوں سید محمد اشرف، طارق چھتاری کفیل احمد اور اسعد بدایونی کا مشکور ہوں جنھوں نے ہر قسم کا تعاون دیا۔

میں آفتاب ہال کے موجودہ پرووسٹ جناب ریاض الرحمن خاں شیروانی صاحب کا احسان مند ہوں کہ اگر ان کی مہربانی شاملِ حال نہ ہوتی تو اس خصوصی شمارے کی اشاعت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔

استاذِ محترم جناب الہاشمی صاحب! جن توقعات کے ساتھ آپ نے مجھے ایڈیٹر نامزد کیا تھا کیا وہ پوری ہوگئیں؟ ویسے میرے خیال میں حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

خاکسار
پرویز جعفری
اکتوبر ۱۹۸۰ء

۱۵۔ ممتاز ہاؤس
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ